زرگزشت

مُشتاق احمد یوسفی

زرگزشت

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ناشر ملک تورانی
مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲
عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

طابع احمد برادرس، کراچی

خطاط محمد شفیق

اشاعت اوّل اپریل ۱۹۷۶ء

اشاعت دوم جون ۱۹۷۷ء

اشاعت سوم اپریل ۱۹۸۰ء

اشاعت چہارم مارچ ۱۹۸۳ء

۳۹/ روپے

فضل حسن

اور

مسرّت علی صدّیقی

کے نام

اچّھا ہوں یا بُرا ہوں پر یار ہوں تمہارا

ترتیب

تُزکِ یوسفی (مقدمہ) ۹

سبق یہ تھا پہلا کتابِ رِبا کا ۲۱

رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہُنر ۴۷

کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا؟ ۷۹

عِلَم دریاؤ ۱۰۷

پروٹوکول ۱۵۵

فَینی ڈارلِنگ ۱۷۷

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ، مددے! ۲۰۳

جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں ۲۲۱

ناٹک ۲۴۹

موصوف ۲۷۷

موصوفہ ۳۱۵

تُزکِ یوسفی

ایک زمانے میں دستور تھا کہ امرا اور رؤسا عمارت تعمیر کراتے تو اس کی نیو میں اپنی حیثیت و مرتبے کے مطابق کوئی قیمتی چیز رکھ دیا کرتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ اپنی ایک مُنہ چڑھی بیگم، معشوق محل سے آزردہ ہوئے تو اس کی حویلی ڈھا کر ایک نئی عمارت تعمیر کرائی۔ معشوق محل ذات کی ڈومنی تھی۔ اسی نسبت سے اس کی تذلیل و تضحیک کے لیے نیو میں طبلہ سارنگی رکھوا دیئے۔

مَیں نے اس کتاب کی بنیاد اپنی ذات پر رکھی ہے جس سے ایک مُدّت سے آزردہ خاطر ہوں کہ "پیشہ سمجھے تھے جسے ہوگئی وہ ذات اپنی"

کم و بیش بیس سال پرانی یادوں اور باتوں کی یہ پہلی قسط ۱۹۷۲ میں مکمل ہو گئی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ اس کے دو باب دسمبر ۱۹۷۱ میں موم بتّی کی روشنی میں ان راتوں میں لکھے گئے جب کراچی پر مسلسل بمباری ہو رہی تھی اور راکٹوں اور اِک اِک گز کے گولوں نے آسمان پر آتشیں جال سا بُن رکھا تھا۔ ہماری تاریخ کا ایک خونچکاں باب رقم ہو رہا تھا۔ ہجوم کار اور طبیعت کی بے لطفی نے تین سال تک نظر ثانی کی اجازت نہ دی۔ ستمبر ۱۹۷۵ میں جب معدے سے خُون آنے لگا اور ڈیڑھ مہینے تک نقل و حرکت بستر کے حدود اربعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تو بارے یکسُو ہو کر زندگی کی نعمتوں کا شمار و شکر ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مسوّدے پر نظر ثانی کا مرحلہ بھی لیٹے لیٹے طے ہو گیا۔ اپنی تحریریں کاٹ چھانٹ کرنے اور حشو و زوائد نکالنے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی عمل ہے جیسے کوئی سرجن اپنا اپنڈکس آپ نکالنے کی کوشش کرے۔ چند سال ادھر کی بات ہے۔ راولپنڈی میں مخدومی کرنل محمد خاں سے ملاقات ہوئی۔ خلافِ معمول کچھ نڈھال، تھکے تھکے سے نظر آئے۔ پوچھا "نصیب دشمناں، طبیعت ناساز ہے؟" فرمایا "دِن بھر دھڑتے نکالتا رہا ہوں"۔ پوچھا "کیا مطلب؟" فرمایا "کتاب پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں۔ ایک کرم فرمانے دھڑتے شماری کر کے بتایا

ہے کہ آپ نے یہ لفظ ۲۴ مرتبہ استعمال کیا ہے۔ صبح سے ۲۵ دھڑتے تو نکال چکا ہوں۔ بقیہ کو کان پکڑ کے نکالنے لگا تو رونے مچلنے لگے" اس واقعہ کا ذکر اس لیے ضروری ہوگیا کہ میں نے بھی انواع و اقسام کے دھڑتے خود نکالے ہیں۔ لاکھ جی کڑا کیا۔ تاہم کچھ جڑیں، چند شاخیں، چند شگوفے کہ مُرجھا چلے تھے، اُمید بہار میں شجرِ انا سے پیوستہ رہ گئے۔

یہ سرگزشت ایک عام آدمی کی کہانی ہے، جس پر بحمداللہ کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی ——ایک ایسے آدمی کے شب و روز کا احوال جو ہیرو تو کجا ANTI - HERO ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ عام آدمی تو بیچارہ اتنی بھی سکت اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزاری کے تین مسلّمہ ادوار میں تقسیم کر سکے۔ یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت اور بڑھاپے میں وصیت۔ یہ طغیانِ شباب، لاف ہائے شادکامی، معاصرانہ چشمکوں اور سیاست کی شوراشوری کی داستان نہیں۔ نہ کسی کی مہم جوئی اور کِشور کشائی کا "ساگا" ہے۔ بایں ہمہ میں خود کو سکندرِ اعظم سے زیادہ خوش نصیب و کامراں سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں زندہ ہوں۔ میری ایک سانس کی بادشاہت ابھی باقی ہے۔ نہاں خانۂ دل کی ہیرو گیلری پر نگاہ کی تو کسی کی رمق تک اپنی ذات میں نظر نہ آئی —— ہنری ہشتم، سیمول جانسن، گوتم بدھ، فالسٹاف، بابر، غالب، پک وک، بچّے، امیر خسرو . . . ہاں ذہن پر ذرا زور ڈالا تو بعض مشاہیر کے جن چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں جگمگوٹا نظر آیا، کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی۔ مثلاً نپولین کا قد، جولیس سیزر کا چٹیل سر، جینا لولو بریجیڈا کا وزن، سیمول جانسن کی بینائی، ناک بالکل قلوپطرہ کی مانند کہ اگر ½ انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اس دُکھیا کا شمار بدصورتوں میں اور اپنا خوبصورتوں میں ہوتا۔ عمر وہی جو شیکسپیر کی انتقال کے وقت تھی۔ غالب نے خود کو اس بنا پر آدھا مسلمان کہا تھا کہ شراب پیتا ہوں، سُؤر نہیں کھاتا۔ فقیر سُود کھاتا ہے، حرام شے نہیں پیتا کہ وہ وسیلہ معاش نہیں۔ حضرت موسیٰ کی اُمّت نے تو سونے کے بچھڑے کی صرف پرستش ہی کی تھی۔ ہم تو اس سے افزائش نسل کا کام بھی لینے لگے ہیں۔ سُود پر روپیہ چلانا انسان کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اس کے بارے میں کم از کم اُردو میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ پہلے قدیم ترین پیشے کا حق تو مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا میں اور بعد ازاں

سعادت حسن منٹو نے بکمال حُسن وخوبی وخوباں ادا کر دیا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ منٹو تو ساری عمر قلم بر داشتہ ہی رہے۔

ان واقعات، مشاہدات اور تاثرات کا تعلق میرے بینکنگ کیریر کے ان ابتدائی چھ سات برسوں سے ہے جب اس پیشے کا بھرم قائم تھا۔ البتہ انشورنس ایجنٹوں سے لوگ چھپتے پھرتے تھے۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ انشورنس ایجنٹ تک بینکروں سے مُنھ چھپانے لگے:

پھرتے ہیں سُود خوار کوئی پوچھتا نہیں

نامۂ اعمال میں چند تبدیلیاں بوجوہ ناگزیر تھیں۔ اس میں پردہ نشینوں کے علاوہ کچھ کرسی نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ چنانچہ، باستثنائے مسٹر اینڈرسن، نام ومقام بدل دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں واقعات وابواب میں تقدیم وتاخیر نظر آئے گی۔ چند کردار بھی عمداً گڈمڈ کر دیئے ہیں۔ اور خوفِ فسادِ خلق سے سیاہ وسفید کو سفید وسیاہ کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کہیں کسی شخصیت یا حقیقت سے مماثلت پائی جائے تو اسے "فکشن" کا سقم تصوّر کیا جائے۔ یہ ایک نو آموز بینکار کی آشفتہ بیانی ہے، کسی مقتول کا بیانِ نزعی نہیں جس کے اختتام پر اسے مرنے کی اجازت اور ملزم کو پھانسی دے دی جائے۔

کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

کچھ رواروی میں بنائے ہوئے چارکول اسکیچ ہیں، کچھ کیری کیچر★ اور تین چار جی لگا کر بنائی ہوئی کیمیو تصویریں✪۔ آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خود ستائی کہلائے۔ اور از راہِ کسرِ نفسی یا جھوٹ مُوٹ اپنی بُرائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کرلیں گے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو اس خُود نوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے۔ اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین قرینِ حقیقت ہوگا۔ اس لیے کہ اپنی زندگی میں بھی ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں۔ عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تنہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے: عقیقہ، نکاح اور تدفین۔ اس کتاب کا مرکزی

★ CARICATURE : مضحک خاکے۔

✪ CAMEO PORTRAITS : دو رنگے پتھر کی ایک پرت پر کندہ تصویر۔

کردار کون ہے؟ راقم الحروف؟ مسٹر اینڈرسن؟ وہ فرزانے جن کے دم سے کوچۂ سُود خوراں شاد و آباد ہے؟ یا زمانے کی رَو جو ALICE IN WONDERLAND کی بلّی کی طرح خود تو "فیڈ آؤٹ" ہو جاتی ہے، لیکن اپنی اَمر مسکراہٹ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

امریکہ کے مقبول شاعر رابرٹ فراسٹ سے کسی نے دریافت کیا "وہ کون سا واقعہ ہے جو آپ کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا؟" فراسٹ نے جواب دیا "جب میں بارہ سال کا تھا تو ایک موچی کے ہاں کام کرتا تھا۔ اور دن بھر منھ میں کیلیں دبائے پھرتا تھا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اور جس مقام پر بھی ہوں، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ سانس لیتے وقت میں نے وہ کیلیں اور کوکے نہیں نِگلے۔" اگر آپ کو بھی انکشافِ احوالِ واقعی پر اصرار ہے تو مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ ۱۹۷۴ میں میرے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کا پریزیڈنٹ ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس انگریز جنرل منیجر نے ۱۹۵۰ میں انٹرویو کر کے مجھے بینک میں ملازم رکھا وہ اس وقت نشے میں دُھت تھا۔ اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ شراب نوشی کے نتائج کتنے دُور رس ہوتے ہیں۔

مشہور و مقبول مزاح نگار جارج میکش کا خیال ہے کہ مغرب میں مزاح مر چکا ہے۔ اب زندہ نہ ہوگا۔ لیکن مغرب ہی پر موقوف نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب انسان میں اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ اور دوسروں پر ہنسنے سے اسے ڈر لگتا ہے:

نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز

انگلینڈ میں لارڈ راچسٹر نام کا ایک بانکا گزرا ہے۔ کسی گھر بند نہیں تھا۔ رِند، شاہد باز، شاعر، شرابی، جملے باز، پھکیت، ہزل گو، بدنام ہی نہیں، سچ مچ بد، فحاشی میں بے مثال۔ اس کی ظرافت سے لوگ خائف رہتے تھے۔ مرنے لگا تو بیٹے کو بلا کر کہا "بیٹا! میری واحد وصیت یہ ہے کہ ظرافت سے پرہیز کرنا۔" معلوم ہوتا ہے اس کی ظرافت میں ایک نہیں کئی آنچ کی کسر رہ گئی، ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ جہاں سچ بول کر سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے، وہاں چاتر مزاح نگار الف لیلہ کی شہرزاد کی طرح ایک ہزار ایک کہانیاں سُنا کر اپنی جان، اور آبرو صاف بچا لے جاتا ہے۔ میں نے گمبھیر بین الاقوامی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی سوالوں سے جان چھڑانے کے لیے بیس سال پہلے ایک

جملہ گھڑا تھا: "دنیا میں جہاں کہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے"۔ مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ مَیں نے کبھی کسی پختہ کار مولوی یا مزاح نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ مزاح کی میٹھی مار بھی شوخ آنکھ، پُرکار عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی:

نین چُھپائے نا چُھپیں، پٹ گھونگٹ کی اوٹ
چتُر نار اور سُورما کریں لاکھ میں چوٹ

ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ابنِ انشا کے بارے میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ بچھّو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشاجی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔ جس شگفتہ نگار کی تحریر اس معیار پر پوری نہ اُترے اسے یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دینا چاہیے۔

یہاں ایک چھوٹی سی دنیا کی جھلک دکھانی مقصود ہے جس کا ہر خانہ، ہر کابک بھانت بھانت کے فرماں روایانِ ناوقت کا حجلۂ پندار ہے۔ بقولِ مولانا حالی:

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

منشا سبق آموزی جہاں نہیں۔ نہ اپنے سینے میں کوئی ایسی امانت یا آگ کہ امیر خسرو کی طرح یہ کہہ سکیں کہ اس صندوقِ استخوانی میں بے شمار تحفہ ہائے آسمانی ایسے تھے جو میں نے اس دن کے لیے بچا رکھے تھے۔ اپنے وسیلۂ اظہار —— مزاح —— کے باب میں میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں۔ قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی، لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں، ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اندوہ و انبساط، کرب و لذّت کی منزلوں سے بے نیازانہ گزر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

بارِ الم اُٹھایا، رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی اندازِ بے حسی کے

مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ خوش دلی کی ایک منزلِ بے حسی سے پہلے پڑتی ہے اور ایک اس کے بعد آتی ہے۔

سبھی کی مسکراہٹیں اور ہنسی ایک جیسی نہیں ہوا کرتی۔ فالسٹاف قہقہہ لگاتا ہے تو روم روم مسکرا اُٹھتا ہے۔ کوئی بڑا گرتا ہے تو چھوٹے ٹھٹھے لگاتے ہیں۔ قومیں جب اللہ کی زمین پر اِترا اِترا کر چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہو جاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں۔ شیر خوار بچے خوش ہوتے ہیں تو کلکاریاں مارتے، ٹھمک کر ماں کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ ادھر مونالیزا ہے کہ صدیوں سے مسکرائے چلی جا رہی ہے۔ اور ایک مسکراہٹ وہ بھی ہے جو نِروان کے بعد گوتم بدھ کے لبوں کو ہلکا سا خمیدہ کر کے اس کی نظریں جھکا دیتی ہے۔ یہ سب سہی، لیکن ماورائے تبسّم، وہ اہتزاز اور مزاح جو سوچ، سچائی اور دانائی سے عاری ہے دریدہ دہنی، پھکّڑپن اور ٹھٹھول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زر، زن، زمین اور زبان کی دُنیا یک رُخوں، یک چشموں کی دُنیا ہے۔ مگر تتلی کی سینکڑوں آنکھیں ہوتی ہیں۔ اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے۔ شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا، سُنتا، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے۔ اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیر کے کسی نئے افق، کسی اور شفق کی تلاش میں گُم ہو جاتا ہے۔

پہلی کتاب "چراغ تلے" پر نظرِ ثالث جناب شاہد احمد دہلوی مرحوم نے کی تھی۔ (نظرِ ثانی گھر کے سنسر نے کی تھی۔ چنانچہ کتاب بھی سوکھ کے آدھی رہ گئی۔) دوسری کتاب "خاکم بدہن" پر جناب شان الحق حقّی نے نظرِ ثانی فرمائی۔ شاہد احمد دہلوی کی طرح وہ بھی واں کے نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ خیال آیا کہ تیسری کتاب کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اس دفعہ کیوں نہ کسی لکھنوی اہلِ زبان سے اصلاح کے بہانے چھیڑ چھاڑ کا آغاز کیا جائے۔ (یوں تو میں بھی ٹھیٹ اہلِ زبان ہوں، بشرطیکہ زبان سے مراد مارواڑی زبان ہو۔) چنانچہ محبِ گرامی جناب محمد عبد الجمیل صاحب سے رجُوع کیا جن کے جدِّ اعلیٰ مولانا فضلِ حق خیر آبادی، غالب کا دیوان مرتب کرتے وقت بیسیوں اشعار حذف کر کے پروفیسروں اور ریسرچ اسکالروں کے مستقل روزگار کا بندوبست فرما گئے۔ جمیل صاحب نے میری زبان کے ساتھ لگے ہاتھوں جوانی کا بھی جائزہ لے ڈالا۔ اور انھیں بالترتیب داغدار اور بے داغ پا کر اپنی مایوسی

کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ ترتیب اگر اُلٹی ہوتی تو کیا بات تھی۔

مسودے کے کچھ حصّے پڑھ کر فرمایا "ایسا لگتا ہے کہ کچھ کوائف آپ نے صیغۂ راز میں رکھے ہیں"۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہی کہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟"

"یکم محرّم کو۔ ستوانسا۔ ٹونک (راجستھان) میں، جہاں کے خربوزے اور "چکوباز" مشہور ہیں۔ خاندان، تاریخ اور جائے ولادت کے انتخاب میں میرا ووٹ نہیں لیا گیا تھا۔ پکڑے جاتے ہیں بزرگوں کے کیے پر ناحق۔ آبائی مسکن جے پور۔ تعلیم جے پور، آگرے اور علی گڑھ میں ہوئی۔ اور عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ کراچی میں گزرا۔ شہروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے"۔

"زندگی میں وہ کون سی پہلی ایکٹرس تھی جس پر آپ جی جان سے فریفتہ ہوئے؟"

"آپ اِس بہانے میرا سِنِ پیدائش معلوم کرنا چاہتے ہیں"۔

"نشے اور سوانحِ حیات میں بھی جو نہ کھُلے اُس سے ڈرنا چاہیے۔ کچھ تو کھُلئے۔ پسندیدہ رنگ؟ پسندیدہ خوشبو؟ پسندیدہ حُسن وغیرہ وغیرہ۔ ۔ ۔ ؟"

۱۔ "سبھی رنگ پسند ہیں۔ سو کے نوٹوں کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

۲۔ تیز مہکار چہکار نہیں بھاتی۔ رات کی رانیاں —— دونوں قسم کی —— دُور کسی اور کے آنگن ہی سے مہک دیتی اچھی لگتی ہیں۔

۳۔ جہاں تک حُسن کا تعلق ہے، وغیرہ وغیرہ پسند ہے"۔

"اپنا تازہ ترین فوٹو شامل کتاب کرنے میں تامّل تھا تو کم از کم حُلیہ ہی بیان کر دیتے"۔

"آئینہ دیکھتا ہوں تو قادرِ مُطلق کی صنّاعی پر جو ایمان ہے وہ کبھی کبھی متزلزل ہو جاتا ہے"۔

"خاندان اور بچپن کے حالات پر بھی آپ نے روشنی نہیں ڈالی۔ حد یہ کہ بینک کا نام تک نہیں بتایا؟"

"ایک چشم دید واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ایک خاتون نے جو اُردو میں معمولی شُد بُد رکھتی تھی اس زمانے کا مقبولِ عام ناول "شوکت آرا بیگم" پڑھا، جس کی ہیروئن

کا نام شوکت آرا اور معاون کردار کا نام فردوس تھا۔ ان کے جب بیٹیاں ہوئیں تو دونوں کے یہی نام رکھے گئے۔ ایک کردار کا نام ادریس اور دوسرے خدائی خوار کا اچھن تھا۔ یہ دونوں انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بطور نام اور عرفیت بخش دیئے۔ بچّے کل چار دستیاب تھے جب کہ ناول اِن، ہیرو کو چھوڑ کر، ابھی ایک اور اہم کردار پیارے میاں نامی وِلن باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں ناموں اور دوہرے رول کا بوجھ بڑے بیٹے ہی کو اٹھانا پڑا جس کا نام ہیرو کے نام پر مشتاق احمد رکھا گیا تھا۔ یہ سادہ لوح خاتون میری ماں تھی۔ بحمداللہ! ناول کی پوری کاسٹ، باستثنائے شوکت آرا جس کا طفولیت ہی میں انتقال ہو گیا تھا، زندہ و سلامت ہے۔ والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور عرب جا کر بدوؤں کا مفت علاج کروں، اس لیے کہ ناول کے ہیرو نے یہی کیا تھا۔ مولا کا بڑا کرم ہے کہ ڈاکٹر نہ بن سکا۔ ورنہ اتنی خراب صحت رکھنے والے ڈاکٹر کے پاس کون پھٹکتا۔ ساری عمر کان میں اسٹیتھس کوپ لگائے اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنتے گزرتی۔ البتہ ادھر دو سال سے مجھے بھی سعودی عرب، بحرین، قطر، عمان اور عرب امارات کی خاک نہیں، تیل چھاننے اور شیوخ کی خدمت کی سعادت نصیب ہوتی رہی ہے۔ ناول کے بقیہ پلاٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو ادب کبھی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا وہ ذرا دیدۂ عبرت نگاہ سے اس عاجز کو دیکھیں۔ یہ ہے کچّا چٹھا۔ کہیئے جمیل صاحب! اب تو ٹھنڈک پڑی؟"

جس توجہ اور دِقّتِ نظر سے جمیل صاحب نے مسوّدہ ملاحظہ فرمایا وہ ان کے التفاتِ خاص اور زباندانی کا ہنستا مسکراتا ثبوت ہے۔ مثلاً پہلے باب میں میں نے لکھا ہے کہ سردی سے بچّے اپنی بتّیسی بجاتے ہیں۔ بتّیسی کو قلمزد کرتے ہوئے فرمایا "یہ آپ نے کیا لکھ دیا؟" ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا لکھنؤ میں کچھ اور بجاتے ہیں؟" ارشاد ہوا "بچّے کے تو اٹھائیس دانت ہوتے ہیں۔ بتّیسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" گزارش کی "اگر یہ لکھ دوں کہ بچّے اپنی اٹھائیسی بجاتے ہیں تو لوگ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں گے۔ اور اگر کسی بچّے کی آدھی داڑھ نکل آئی ہو تو کیا ساڑھے اٹھائیسی بجانا لکھوں؟" عینک اُتار کے مسکراتی ہوئی آنکھیں دکھاتے ہوئے بولے "اور یہاں (علم دریاؤ میں) آپ نے 'حرامزدگی' لکھا ہے۔ حرمزدگی ہونا چاہیے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک پیدائشی

صفت ہے۔ دوسری اپنے زورِ بازو سے پیدا ہوتی ہے۔"

ایک دن بکراہت استفسار فرمایا "روکن سے آپ کی مُراد کیا ہے۔ میں نے تو یہ کریہہ لفظ آج تک نہیں سُنا۔ دِلّی کا ہوگا۔ یا مارواڑی ڈھیلا؟" عرض کیا "وہ چیز جو سودا خریدنے کے بعد دکاندار اوپر سے مفت دے دے۔" فرمایا "اسے تو لکھنؤ میں گھاتا کہتے ہیں۔" عرض کیا "مَیں نے تو یہ کریہہ لفظ آج تک نہیں سُنا۔" حکم ہوا "گھر جاکر اپنی اہلِ زبان اہلیہ سے پوچھ لیجیے۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہوگا۔" میں حلف اٹھاکر کہہ سکتا ہوں کہ جمیل صاحب نے انھیں ثالث محض اس بنا پر بنایا کہ انھیں سو فیصد یقین تھا کہ وہ فیصلہ بہرصورت میرے خلاف ہی کریں گی۔ ورنہ وہ اپنی بیگم کو بھی حَکَم بنا سکتے تھے۔ خیر، میں نے شام کو بیگم سے پوچھا "تم نے لفظ رُوکن سُنا ہے؟" بولیں "ہاں! ہاں! ہزار بار!"۔ جی خوش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد سند کو مزید معتبر بنانے کے لیے پوچھا "تم نے یہ لفظ کہاں سُنا؟" بولیں "تمھی کو بولتے سُنا ہے۔"

بیرونِ خانہ ریسرچ سے بھی معلوم ہوا کہ دلّی میں بھی بکثرت بولا جاتا ہے۔ جمیل صاحب کو اس تحقیق سے آگاہ کیا اور سند میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ انھیں مزید مشتعل کرنے کے لیے جناب تابش دہلوی اور حضرت ذوالفقار علی بخاری مرحوم کا چٹاخ پٹاخ مکالمہ جو ان دنوں کہیں چھپا تھا دُہرا دیا۔ تابش صاحب کے مُنھ سے کہیں نکل گیا "لکھنؤ والوں نے پوری ادبی تاریخ میں شعر اچھا نہیں کہا۔ ایک لے دے کے آتش ہیں۔ ان پر بھی دہلویت کی چھاپ ہے۔ اور ویسے بھی لکھنوی شاعری میں سوائے چونچلے اور نخرے کے ہوتا کیا ہے؟" بخاری صاحب تنک کر بولے "اور داغ دہلوی کے یہاں کیا ہے؟" تابش صاحب نے تشریح فرمائی "جی ہاں! داغ کے یہاں بھی چونچلے اور نخرے ہیں لیکن رنڈی باز کے ہیں، رنڈی کے نہیں!"

چہرہ پہلے تو وفورِ تکدر سے تمتمایا۔ پھر شگفتہ ہوکر بولے "تابش دہلوی کی باتیں ہی باتیں ہیں۔ انتہائی شریف النفس اور پاکباز آدمی ہیں۔ انھوں نے تو رنڈی کا فوٹو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ رہے آپ، تو آپ نے تو رنڈی باز بھی نہیں دیکھے۔ یوں بھی میرا خیال ہے کہ آپ کو ڈھنگ کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔" عرض کیا "مرشدی! اگر ہم میں گمراہ ہونے کی عظیم صلاحیتیں نہ ہوتیں تو

آپ تک کیسے پہنچتے؟"

دونوں اپنے اپنے لسانی مورچوں میں ڈٹے ہوئے بلکہ دھنسے ہوئے تھے۔ بالآخر سمجھوتا اس پر ہوا کہ آئندہ ٹکسالی پنجابی لفظ "جھونگا" استعمال ہوگا جو عظیم مزاح نگار اور یار طرحدار کرنل محمد خاں کے عطایا میں سے ہے۔

اور تو اور انتساب بھی ان کی نگاہِ مردم شناس سے نہ بچ سکا۔ فرمایا "سچ سچ بتائیے۔ ان دونوں میں سے مرزا عبدالودود بیگ کون ہے؟ اور ہاں! یہ تو آپ کی سوانح نوعمری ہے۔ ہرچند کہ آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ نے عزتِ سادات بغیر عاشقی کیے کھوئی، لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ بقول شاعر، یوسفی گر نہیں ممکن تو زلیخائی کر۔ نئی نسل کے پڑھنے والے اپنے بزرگوں کی نالائقی اور بے راہ روی کے قصے پڑھ کر فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ آپ بھی پھڑکتے ہوئے انتساب کے پردۂ زنگاری میں کسی معشوق کو بٹھا دیتے تو نقادوں کے ہاتھوں چھتنار ہونے سے پہلے کتاب تکیوں کے نیچے پہنچ جاتی اور دس دن کے اندر اندر دوسرا ایڈیشن بایزاد حکایات لذیذ و شوق انگیز نکالنا پڑتا۔ مثلاً:

'. . . . کے نام

جس نے بشری کمزوری

کے ایک لمحے کو

ہمیشگی بخش دی۔"

عرض کیا "صاحب! اوّل تو نقطوں (. . . .) کے نام صرف جیومیٹری کی کتاب معنون کی جا سکتی ہے۔ دوسرے، ایک لمحہ تو انسانی کمزوری کے لیے بھی بہت ہی کم ہے۔ ایک گھنٹہ نہیں تو کم از کم ایک منٹ تو کر دیجیے، پلیز!" اپنے مخصوص انداز میں سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "گاہ بگاہ، آپ کی انشائے ارغوانی کے پیشِ نظر 'سونے کے دانت والی لڑکی کے نام!' (صفحہ ۲۶۱) کیسا رہے گا؟ چہ کنہ اگر تراشم صنمے ز سنگِ خارا۔ آپ کے ہیرو غالب نے بھی تو بڑے ترونے پن سے اقبالِ جرم کیا تھا کہ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔

میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔" عذر کیا "مگر میں تو مغل نہیں ہوں۔" بولے "کوئی مضائقہ نہیں۔ بچے تو ابھی تک ہیں۔" اس کے بعد بچہ اور بچے سرگودھا اور سرگودھے، وضع اور وضعے کے املے پر ایسی گھمسان کی بحثا بحثی ہوئی کہ منھ لگائی ڈومنی کوئے ملامت سے تال بے تال گاتی، ڈھولک بجاتی نکل گئی۔

کتابت کا مرحلہ آیا تو پہلے لاہور کے ایک صاحبِ طرز، نفاست پسند، درویش منش خطاط سے رجوع کیا۔ دو تین دفعہ درخواست کی تو سکوت فرمایا۔ چوتھی مرتبہ ارشاد فرمایا "شکریہ! پندرہ روپے فی صفحہ اجرت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فقیر صرف مفید و مذہبی تصانیف کی کتابت کرتا ہے۔" ان کے ایما پر میں نے نمونتہً "چراغ تلے" کا نسخہ ایک صاحب کے توسط سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا اور جواب کے انتظار میں رہا۔ ڈر ڈر کے کی گئی مگر امید کی گئی۔ دو دن بعد اسے جہاں تہاں سے سونگھ کر ان ہی صاحب کی زبانی کہلا بھیجا کہ "روزانہ تہجد کے بعد کلام پاک کی خطاطی کرتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ سارا ثواب ان کی کتاب کی بھینٹ چڑھ جائے۔ میں نے بے مصرف کتابت ترک کر دی ہے۔ ہاں! کبھی کبھار کسی کی فرمائش پر لوحِ مزار کی عبارت لکھ دیتا ہوں۔" اب لے دے کے اپنی لوحِ مزار رہ گئی تھی۔ سو وہ تاریخ وفات کے بغیر ادھوری ادھوری معلوم ہوتی۔ نے چراغنے لگے۔ نے صاحبِ مزار! ان صاحب سے جو ایلچی کے فرائض انجام دے رہے تھے میں نے کہا، یہ تو ہوا سو ہوا۔ ذرا ان سے اتنا پوچھئے گا کہ جب قدغن کا یہ عالم ہے تو انھوں نے دیوانِ غالب کی کتابت کیا سمجھ کے کی۔ انھوں نے کھڑے کھڑے وہیں قضیہ مٹا دیا۔ فرمایا کہ شاعری کی اور بات ہے۔ شعر میں جس بات پر ہزاروں آدمی مشاعروں میں اچھل اچھل کے داد دیتے ہیں، وہی بات اگر نثر میں کہہ دی جائے تو پولیس تو بعد کی بات ہے، گھر والے ہی سر پھاڑ ڈالیں۔

پاپ کی جس گٹھری نے اس بزرگ پر گرانی کی اسے ایک نوجوان عزیزی محمد شفیق نے بصد شوق اٹھا لیا۔ لاہور ہی میں دو سطر یومیہ کی رفتار سے کتابت شروع ہوئی۔ کوئی پندرہ بیس صفحے مکمل ہو پائے ہوں گے کہ میرا لاہور جانا ہوا۔ میں نے کہا "اگر آپ اسی رفتار سے کتابت کرتے رہے تو یہ کتاب تو پانچ چھ سال میں ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ کیا کریں گے؟ خط البتہ اچھا

ہے، لیکن جا بجا ناہمواری اور کجی پائی جاتی ہے۔ الفاظ اُکھڑے اُکھڑے لگتے ہیں۔" بولے "لکھتے ہیں ہنسی آجائے تو قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ جو حصے غیر دلچسپ ہیں وہ نہایت عمدہ لکھے گئے ہیں۔ بہت کافی ہیں۔ بے شک کسی کو دکھالیں۔" میں نے کہا "برخوردار! اگر ایسا ہی ہے تو پہلے مسودہ پڑھ کر ہنس لیا کرو۔ پھر یکسوئی کے ساتھ ہاتھ جما کر کتابت کرو۔" کہنے لگے "جناب! ممتحنانہ صرف لکھنے کاٹنے ہوا ہے۔ عدیم الفرصت آدمی ہوں۔ میری شادی ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا★۔" اندریں صورت التماس ہے کہ قارئین کو جہاں جہاں ان کے خط میں لرزشِ خفی وجلی نظر آئے، اُسے اس عاجز کا کمالِ فن سمجھ کر اُنھیں معاف فرمائیں۔

پاکستان کے جانے پہچانے کارٹونسٹ برادرم عزیز بھی عرصہ دراز سے مزاح اور معدے کے انھی امراض میں مبتلا ہیں اور میرے دوا شریک بھائی بنے ہوئے ہیں۔ ممنون ہوں کہ انھوں نے "فینی ڈارلنگ" کو بغور پڑھ کر دو کارٹونوں سے مزین کیا۔ ملاقات ہوئی تو دیر تک اپنا پیٹ پکڑ کے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی اچکن پکڑ کے اس میں ہارمونیم کی دھونکنی کی طرح ہوا بھرتے اور نکالتے ہوئے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ انھیں یوں مائل بہ ستائش دیکھا تو میں بھی جھوٹی کسرِ نفسی کو بالائے داد رکھ کر خوب ہنسا۔ عرض کیا "چلیے محنت ٹھکانے لگی۔ آپ نے پسند کیا۔" دوبارہ اچکن دھونکتے ہوئے فرمایا "بھائی جان! بڑا مزا آیا۔ کارٹون غضب کے ہیں!" اب کی بار دونوں نے اپنے اپنے کمالِ فن پر مُنھ موڑ کر اپنی اپنی دھونکنی دھونکی۔

مشتاق احمد یوسفی

۶۸ سی، کے۔ ڈی۔ اے، ۱

کراچی

۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء

★ **عُذرِ شرعی**

یہ بات پُرانی ہوئی۔ سدرہ بیٹی اب ماشاء اللہ دو مہینے کی ہو گئی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

محمد شفیق، شفق رقم

لاہور

۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء

سبق یہ تھا پہلا کتابِ رِبا کا

تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

کراچی میں سردی اتنی ہی پڑتی ہے جتنی مری میں گرمی۔ اِس سے ساکنانِ کوہ مری کی دِل آزاری نہیں، بلکہ عروس البلاد کراچی کی دِلداری مقصود ہے۔ کبھی کبھار شہرِ خوباں کا درجۂ حرارت جسم کے نارمل درجہ حرارت یعنی ۹۸٫۴ سے دو تین ڈگری نیچے پھسل جائے تو خُوبانِ شہر لحاف اوڑھ کر ایئر کنڈیشنر تیز کر دیتے ہیں۔ حُسنِ خود بین و خود آرا جب ۳۴ نمبر کے مشمولات کا ۴۴ نمبر کے سوئٹر میں خلاصہ کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو حیا کی سُرخی رُخسار دل پر دوڑ جاتی ہے جسے موسمِ سرما کے خونِ صالح پر محمول کیا جاتا ہے۔ اِس حسنِ تضاد کو کراچی کے محکمہ موسمیات کی اصطلاح میں "کولڈ ویو" (سردی کی لہر) کہتے ہیں۔ یہ خوبی صرف کراچی کے متلوّن موسم میں دیکھی کہ گھر سے جو لباس بھی پہن کر نکلو، دو گھنٹے بعد غلط معلوم ہوتا ہے۔ لوگ جب اخبار میں لاہور اور پنڈی کی سردی کی شدید خبریں پڑھتے ہیں تو اُن سے بچاؤ کے لیے بالُو کی بھُنی مونگ پھلی اور گزک کے پھنکے مارتے ہیں۔ اُن کے بچّے بھی انھیں پر پڑے ہیں۔ بادِ شمال اور گوشمالی سے بچنے کے لیے اُونی کنٹوپ پہن کر آئس کریم کھاتے اور بڑوں کے سامنے بتیسی بجاتے ہیں۔ کراچی میں پنڈی سے تین لحاف کم سردی پڑتی ہے۔ نووارد حیران ہوتا ہے کہ اگر یہ جاڑا ہے تو اللہ جانے گرمی کیسی ہوتی ہوگی۔ بیس سال سرد و گرم جھیلنے کے بعد ہمیں اب

معلوم ہوا کہ کراچی کے جاڑے اور گرمی میں تو اتنا واضح فرق ہے کہ بچّہ بھی بتا سکتا ہے۔ ۹۰ ڈگری ٹمپریچر اگر مئی میں ہو تو یہ موسم گرما کی علامت ہے۔ اگر دسمبر میں ہو تو ظاہر ہے کہ جاڑا پڑ رہا ہے۔ البتہ جولائی میں ۹۰ ڈگری ٹمپریچر ہو اور شام کو گرج چمک کے ساتھ بیوی برس پڑے تو برسات کا موسم کہلاتا ہے۔ غالباً کیا یقیناً ایسے ہی کسی نیم گرم، گُنگُنے کراچوی جاڑے سے اُکتا کر نظیر اکبرآبادی نے تمنّا کی تھی:

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھُلا ہو کوٹھے کا
اور تن میں نیمہ شبنم کا، ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا، اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا، ہو آگے اِک فرّاش کھڑا
فرّاش بھی پنکھا جھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تین چار سال بعد دو تین دن کے لیے سردی کا موسم آجائے تو اہلِ کراچی اس کا الزام "کوئٹہ وِنڈ" پر دھرتے ہیں اور کوئٹہ کی سردی کی شدّت کو کسی سیم تن کے ستر نما سوئٹر سے ناپتے ہیں۔ کراچی کی سردی بیوہ کی جوانی کی طرح ہوتی ہے۔ ہر ایک کی نظر پڑتی ہے اور وہیں ٹھہر بلکہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اُدھر کوئٹہ میں جب دستانے، کمبل، مفلر اور سمور کے انبار میں سے صرف چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جائے کہ ان کے جنوب میں مونچھ ہے یا پنکھڑی سی اِک گلاب کی سی ہے، تو کوئٹہ والے اس پھِلپلے کا ذمہ دار قندھاری ہوا کو ٹھہراتے ہیں اور جب قندھار میں سائبیریا کی زمہریری ہواؤں سے درختوں پر اناروں کی بجائے برف کے لڈّو لٹکتے ہیں، گوالے گلائے کے تھنوں سے آئس کریم دوہتے ہیں، اور سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے انسان کے دل میں خود کو واصلِ جہنّم کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے، تو اہالیانِ قندھار کمبل سے چمٹ کر ہمسایہ ملک کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ چھوٹے ملکوں کے موسم بھی تو اپنے نہیں ہوتے۔ ہوائیں اور طوفان بھی دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ زلزلوں کا مرکز بھی سرحد پار ہوتا ہے۔

یہ جنوری ۱۹۵۰ء کی ایک ایسی ہی صبح کا ذکر ہے۔ موسمی کیفیت ہم نے قدرے تفصیل و تنقیص

کے ساتھ اِس لیے بیان کی کہ کراچی میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ گوارا حد تک گرم ہونے کے علاوہ یہ ایک تاریخ ساز صبح بھی تھی۔ زمستان کی اس صبح بینکاری کے پیشے سے ہمارے طویل "فلرٹیشن" کا آغاز ہوا۔ اور صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلتا ہے۔ صبح اس وقت ہوتی ہے جب آدمی جاگ اُٹھے۔ کسی نے ایک دن فرانس کے شہرہ آفاق ادیب پروست سے پوچھا کہ دُنیا کی عسکری تاریخ میں کس واقعہ نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو اس نے بلا تامل جواب دیا، فوج میں میری بھرتی۔

ہمارے فلرٹیشن کا آغاز

کراچی میں براہ کھوکھراپار وارد ہوئے ہمیں ۲۰ گھنٹے ہوئے تھے۔ وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل "پاکستان" لکھا نظر آیا تو اُسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا۔ پھر مٹی اُٹھا کر دیکھی۔ اسلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے۔ ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومتِ پاکستان چھپا ہوا دیکھا۔ اور پھر ریگزار راجستھان میں لاکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیرگیِ امروز میں دُھندلاتے چلے گئے۔

مِری بار کیوں دیر اتنی کری

منا باؤ کے اجاڑ اسٹیشن پر دو راتیں تاروں بھرے آسمان کے نیچے گزارنے سے گلا خراب ہو گیا تھا اور محسوس ہوتا تھا گویا حلق میں کوئی بدچلن مینڈک پھنس گیا ہے۔ ذرا منہ کھولتے تو ٹرانے لگتا۔ میکلوڈ روڈ پر بینک کا ہیڈ آفس تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہم نے ایک چھپی ہوئی پرچی پر اپنا نام لکھ کر جنرل مینجر مسٹر ڈبلو۔ جی۔ ایم اینڈرسن کو بھجوایا۔ تقریب بہر ملاقات کے خانے میں باریک حروف میں "سرکاری" لکھ دیا، جس سے ہماری مراد نجی یعنی بسلسلہ ملازمت تھی اور آخر میں، جلی حروف میں: "فرستادہ ——— مسٹر ایم۔ اے۔ اصفہانی، چیرمین بینک ہذا"۔ سفارش

میں لپٹی ہوئی یہ دھمکی ہمارے کام نہ آئی، اس لیے کہ ہمارے بعد آنے والے ملاقاتی، جو ہمارے حساب وں ہم سے زیادہ خوش پوش اور حیثیت دار نہ تھے، باری باری شرفِ باریابی حاصل کر کے رخصت ہو گئے اور ہم سر جھکائے سوچتے ہی رہ گئے کہ مری بار کیوں دیر اتنی کری؟

ڈیڑھ دو گھنٹے بینچ پر انتظارِ ساغر کھینچنے کے بعد جی میں آئی کہ لعنت بھیجو۔ ایسی ذلّت کی نوکری سے بے روزگاری بھلی۔ دیر ہے، اندھیر بھی ہو گا۔ چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چوندیس۔ مرزا غالب بھی تو فارسی مدرّس کی سو روپے ماہوار اسامی کے لیے پالکی میں بیٹھ کر مسٹر ٹامسن کے پاس انٹرویو کے لیے گئے تھے۔ لیکن اُلٹے پھر آئے' اس لیے کہ وہ ان کی پیشوائی کو باہر نہیں آیا۔ کہاروں سے کہا بس ہو چکی ملاقات۔ پالکی اٹھاؤ۔ ہم بھی اُستاد کے تتبّع میں واپس پالکی میں سوار ہو رہے تھے کہ اندر والا بولا، ہوش میں آؤ۔ تم کہاں کے دانا ہو، کس ہُنر میں یکتا ہو؟ مرزا تو شاعر آدمی ٹھیرے۔ اس کے بعد بھی جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نیا آتا تو ایک قصیدہ بطریق نذر گزرانتے رہے اور پنشن کے علاوہ سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید برابر وصول کرتے رہے تم کیا کرو گے؟ تم تو صرف نثر میں خوشامد کرنی جانتے ہو۔ پھر واپسی کے لیے باہر پالکی بھی تو نہیں ہے کہ بھنبھناتے ہوئے بیٹھ کے گھر آ گئے اور راستے میں کہاروں کو کندھا تک نہ بدلنے دیا۔ اور ہاں' روزی پر لات مار کے چلے بھی گئے تو اس مظاہرۂ پندار کو شہرتِ دوام بخشنے کے لیے محمد حسین آزاد کو کہاں سے لاؤ گے؟ کہاں وہ خودداری کہاں یہ سجدۂ ناقبول۔ بندہ ناخدا! مزے سے بیٹھے کشکول بجاتے رہو۔ تین برس تم ڈپٹی کمشنر رہے۔ سچ کہو کبھی کسی اہلِ غرض سے سیدھے مُنھ بات کی؟

کچھ دیر بعد چپراسی ہماری کس مپرسی پہ ترس کھا کے خود ہی کہنے لگا کہ اگر نوکری کی سفارش لے کر آئے ہو تو آج مڈبھیڑ نہ کرو۔ اجُن فجر سے سالے کا مغز پھر یلا ہے۔ اکھا باٹلی دارو پیئے لاہے۔ پاکٹ میں چھوٹا باٹلی کے اندر 'مکسچر' بھر کے لایا ہے۔ دو کلاک پہلے سگرٹ سے تجوری کھولنا مانگتا تھا۔ اصلی رنگت سولہ آنے مُولی کے موافق ہے۔ پَن اس ٹیم جاستی بلڈ پریشر سے ایکدم چقندر لگتا پڑا ہے۔ تمیرا کام آج کے دن نہیں ہونے سکتا۔

پون بجے جب اسٹاف ایک ایک کر کے لنچ کے لیے کھسکنے لگا اور مہتر اس چابکدستی سے

جھاڑ دینے لگا کہ گرد کا ایک ایک ذرّہ کھنچ کر ہماری عینک اور چہرے پر جمع ہو جائے تو زور سے گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی گھنٹی کے بٹن پر بیٹھ گیا ہے۔ چپراسی نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ چند لمحے پہلے سلگائی ہوئی پہلوان مارکہ بیڑی کے کش لیتا رہا۔ پھر اسے چھنگلیا میں دبا کر الوداعی دم لگایا اور جوتے کی ایڑی پر رگڑ کر بجھا دیا۔ بیڑی کا بنڈل، چونی اور فلمی گانوں کا کتابچہ سر پر رکھا اور ان پر ترکی ٹوپی کو کج کیا۔ پھر اس "سیف ڈپازٹ لاکر" کا پھندنا ہلا کر کہنے لگا کہ لگتا پڑا ہے اب کے تمھاری آئی ہے۔ قسمت کی بدنصیبی کو صیّاد کیا کرے؟ لارا لپّا لارا لپّا! لالالا!

....کچھ نے کہا چہرہ ترا

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے اپنی دائیں ہتھیلی کا پسینہ پونچھ کر ہاتھ مصافحہ کے لیے تیار کیا۔ سامنے کرسی پر ایک نہایت بارعب انگریز نظر آیا۔ سر بیضوی اور دلیا ہی صاف اور چکنا۔ جس پر پنکھے کا عکس اتنا صاف تھا کہ اس کے بلیڈ گنے جا سکتے تھے۔ آج کل کے پنکھوں کی طرح اس پنکھے کا وسطی حصّہ نیچے سے چپٹا نہ تھا، بلکہ اس میں ایک گاؤدم چونچ نکلی ہوئی تھی، جس کا مصرف بظاہر یہ نظر آیا کہ پنکھا سر پر گرے تو کھوپڑی پاش پاش نہ ہو، بلکہ اس میں ایک صاف گاؤدم سوراخ ہو جائے۔ بعد میں اکثر خیال آیا کہ سر پر اگر بال ہوتے تو اس کی وجاہت و دبدبہ میں یقیناً فرق آ جاتا۔ میز کے نیچے ایک اُدھڑا اُدھڑا "کیمل کلر" کا قالین بچھا تھا۔ رنگ میں واقعی اس قدر مشابہت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی خارش زدہ اونٹ اپنی کھال فرشِ راہ کیے پڑا ہے۔ بھرے بھرے چہرے پر سیاہ فریم کی عینک۔ کچھ پڑھنا یا پاس کی چیز دیکھنی ہو تو ماتھے پر چڑھا کر اس کے نیچے سے دیکھتا تھا۔ دور کی چیز دیکھنی ہو تو ناک کی پھنگ پر رکھ کر اس کے اوپر سے دیکھتا تھا۔ البتہ آنکھ بند کر کے کچھ دیر سوچنا ہو تو ٹھیک سے عینک لگا لیتا تھا۔ بعد میں دیکھا کہ دھوپ کی عینک بھی ناک کی نوک پر ٹکائے، اس کے اوپر سے دھوپ کا معائنہ کرتا ہوا بینک آتا جاتا ہے۔ آنکھیں ہلکی نیلی جو یقیناً کبھی روشن رہی ہوں گی۔ ناک

ستواں ترشی ترشائی۔ نچلا ہونٹ تحکمانہ انداز سے ذرا آگے کو نکلا ہوا۔ سگرٹ کے دھوئیں سے ارغوانی۔ بائیں ابرو بے ایمان دکاندار کی ترازو کی طرح مستقلاً اوپر چڑھی ہوئی۔ گرجدار آواز۔ جسم مائل بہ فربہی۔ رنگ وہی جو انگریزوں کا ہوتا ہے۔ آپ نے شاید دیکھا ہو گا کہ چینیوں کا چہرہ عمر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اور انگریزوں کا جذبات سے عاری۔ بلکہ بعض اوقات تو چہرے سے بھی عاری ہوتا ہے۔ لیکن یہ بالکل مختلف چہرہ تھا۔ ایک عجیب تمکنت اور دبدبہ تھا اس چہرے پر۔ کمرے میں فرنیچر برائے نام۔ نہ آرائش کی کوئی چیز۔ سارا کمرہ اس کے چہرے سے ہی بھرا بھرا نظر آتا تھا۔ یہ مقابل ہو تو اور کوئی چیز ــــ اس کا اپنا جسم بھی ــــ نظر نہیں آتا تھا۔

اُس کا سراپا ہے یہ مصرع
چہرہ ہی چہرہ پاؤں سے سر تک

ہم نے تیار شدہ ہاتھ مصافحہ کو بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ کچھ دیر بعد "کریون اے" کا "کارک ٹپڈ" سگرٹ ڈبے سے نکال کر اُلٹی طرف سے ہونٹوں میں دبایا۔ وہ بہت بُرے موڈ میں تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے چائے کی پیالی اٹھائی اور دوسرے کانپتے ہوئے ہاتھ سے زیادہ کانپتے ہاتھ کو تھاما۔ کپ کی ڈگڈگی سی بجنے لگی اور چائے چھلک کر ہماری درخواست کو رنگین کر گئی۔ اب ایک دیا سلائی کو اپنے بہتر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کے اس پر ڈبیا رگڑنے لگا۔ لیکن وہ کسی طرح جل کر نہیں دیتی تھی۔ خواہ مخواہ کا تکلّف تھا، ورنہ چاہتا تو اسے اپنے بلڈ پریشر پر رگڑ کے بآسانی جلا سکتا تھا۔

ہمارا سنِ پیدائش

اس نے غلط طرف سے سگرٹ سلگایا۔ کارک کچھ دیر بعد خود جل جلا کر ہماری گیلی درخواست پر چھُن سے بجھ گیا۔ اُس نے چھنگلیا کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ہم تعمیلاً بیٹھنے والے ہی تھے کہ ناگاہ اسی کرسی کی گہرائیوں سے ایک کتا اٹھ کھڑا ہوا اور ہمارے شانوں پر

دونوں پنجے رکھ کر ہمارا گرد آلود مُنہ اپنی زبان سے صاف کیا۔" مائی ڈاگ اِز ویری فرینڈلی" کہتے سے تعارف کرانے کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔ کیسے ہو؟ کون ہو؟ کیا ہو؟ اور کیوں ہو؟

سوائے آخری سوال کے، ہم نے تمام سوالات کے نہایت تسلی بخش جواب دیئے۔

" تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس بینک کو میں چلا رہا ہوں، مسٹر اصفہانی نہیں۔ خیر۔ تم نے معاشیات پڑھی ہے؟" اس نے کہا۔

" نو سر!"

"حساب میں بہت اچھے تھے؟"

" نو سر! حساب میں ہمیشہ رعایتی نمبروں سے پاس ہوا، حالانکہ انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔ اے تک فرسٹ ڈویژن فرسٹ آیا۔"

"حساب میں فیل ہونے کے علاوہ تمھارے پاس اس پیشے کے لیے اور کیا کوالی فیکیشن ہے؟"

"میں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا ہے۔"

"ہا ہا ہا! تمھارا سوشل بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کس خاندان سے تعلق ہے؟"

"میرا تعلق اپنے ہی خاندان سے ہے۔"

"سچ بولنے کا شکریہ۔"

جی تو بہتیرا چاہا کہ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ بزرگ حبِ جاہ و مال سے بے نیاز تھے۔ فقط ہمیں اپنی نشانی چھوڑا۔ نادر شاہ نے تو اپنی ولدیت شمشیر، ابنِ شمشیر، ابنِ شمشیر بتا کر بدخواہوں اور مورخوں کا مُنہ بند کر دیا تھا۔ لیکن یہ فقیر، ابنِ آدم، ابنِ آدم، ابنِ آدم کے علاوہ کیا بتاتا؟ اس کے منہ سے ایسی لپیٹ آ رہی تھی جیسی روئی کے اس پھوئے سے آتی ہے جو انجکشن سے پہلے نقطۂ اذیت پر رگڑا جاتا ہے۔ استفسار فرمایا" تم کب اور کہاں 'ڈلیور' ہوتے تھے؟ ہا ہا ہا!"

وہ زور سے ہنسا۔ ہم ذرا چکرائے تو کہنے لگا، اچھا یہ بتاؤ کہ جس سنہ عیسوی میں تم پیدا ہوئے اس سال اور کون سا بین الاقوامی سانحہ ہوا تھا؟

انٹرویو کے سلسلہ میں ایک عرصہ پہلے ہم نے معلوماتِ عامّہ کے نامعقول سے نامعقول سوالوں کے جواب رٹ لیے تھے۔ مثلاً کرکٹ کی گیند کا وزن۔ مکھی کی ٹانگوں اور بیل کے دانتوں کی تعداد۔ نپولین کا قد۔ اگر بینک سے صرف ۱۰۰ روپے بڑے سُود پر قرض لیے جائیں تو وہ کس طرح ۲۵۰ سال میں ۹۰۲،۴۰۰،۲۱۷،۲ ہو جائیں گے۔ خالص سونا کتنے کیرٹ کا ہوتا ہے؟ بلی کی آنتوں کی لمبائی۔ کتا زبان کیوں باہر نکالے رکھتا ہے؟ انسان منھ کھولنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ اچھا خاصا لفظ ادب لکھ کر انھیں حرفِ غلط کی طرح کاٹا ( ) کیوں جاتا ہے؟ تخلّص پر ڈوئی کیوں بنائی جاتی ہے؟ شیکسپیر کے ہاں شادی کے کتنے ماہ بعد بچّہ تولّد ہوا؟ بانس پولا کیوں ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ...... لیکن اپنی پیدائش کے بین الاقوامی متوازیات کی طرف ہمارا دھیان کبھی نہیں گیا تھا۔

ہمارا آدھا جسم جو اس کے مقابل تھا بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور ہم انتہائی بے بسی کے عالم میں جھُورنے★ لگے تو اس نے ہماری درخواست میں سنِ پیدائش دیکھ کر اندوہ گیں لہجے میں کہا کہ بائی دی وے، جس سال تم پیدا ہوئے اُسی سال میرے باپ کا انتقال ہوا۔ بڑا منحوس تھا وہ سال!"

ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

"رہنے والے کہاں کے ہو؟"

ایک دفعہ تو جی میں آئی کہ میر بے دماغ کی طرح کہہ دیں:

کیا بُود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

★ جھُورنا: (پنجابی) گردن ڈال کر عالمِ غنودگی میں غور فرمانا۔ جیسے ضعیف و لاغر مرغا پروں میں چونچ ڈال کر اپنے حال اور مرغیوں کے مُستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتا ہے۔

لیکن یہ لکھنؤ کا مشاعرہ نہیں، ملازمت کا انٹرویو تھا۔

"جے پور —— اجمیر کے پاس ہے۔" ہم نے معذرتی لہجے میں اس شہر کا نام لیا جو کبھی عالم میں انتخاب تھا۔

OH: YES: THE PINK CITY: کیا بات ہے! برٹش ریزیڈنٹ نے ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی تھی۔ برما میں ہم دونوں کا ایک ساتھ کورٹ مارشل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے تمہارا جے پور۔ سارے شہر میں سڑک کے دونوں طرف ہر عمارت کا ایک ساں زعفرانی رنگ۔ اونچے طرّے والے راجپوتی صافے اور ان سے بھی اونچی مونچھیں اور ہر ود کو سونڈ سے سلام کرتے ہوئے ہاتھی۔ آسٹریلین گھوڑوں پر پولو۔ کچرے اور غلاظت کی گدڑ ترین جیسے مقامی بھینسے کھینچ رہے تھے۔ ایسی ریل میں نے امرتسر میں بھی دیکھی تھی جو ایک محلّے کی رقیق غلاظت کی دوسرے محلّوں میں گشتی نمائش کرتی پھرتی تھی۔ بھرے بازار میں بلکتے بچوں کے منہ میں کھڑے کھڑے چھاتی دیتی ہوئی عورتیں۔ بعض لاڈلے تو اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ خود کھڑے ہوکر کھڑے ہوئے منبع سے جوئے شیر نکال رہے تھے۔ درشنی جھروکوں سے آنکھ مارتی ہوئی ناچ گرلز۔ دھنک کے رنگ کے ابرک سے جھما جھم کرتے ہوئے لہریئے شانوں سے ڈھلکائے —— ایک ایک اپنج جوانی، راجستھانی رُوپ سنگھار اور سِفلِس سے بھرپور۔ شلوکے میں خس کی ٹٹّی کا سینٹ، بالوں میں COOKING OIL (چونک کر) عورت کبھی میری کمزوری نہیں رہی۔ اور وہ تو میں بھول ہی گیا۔ مادرزاد معصوم اور اتنی ہی مُدّت سے برہنہ فقیروں کی قطار جن کے پیر وغیرہ کو عورتیں دھو دھو کر پیتی ہیں۔ کیا کہتے ہیں ان کو؟"

"دگمبر جین سادھو"

"FOLIES-BERGERE" کی لڑکیاں اور یہ سادھو کپڑوں کا شمار مکروہاتِ دنیوی میں کرتے ہیں۔ اور ہاں! مجھے سب یاد ہے۔ تمہارے ہوم ٹاؤن میں ہر چوراہے پر مرحوم بزرگوں کے نام پر چھوڑے ہوئے مقدّس سانڈ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے پھرتے ہیں۔ تمہارے سب بزرگ زندہ ہیں یا —— ؟ پرسیٹلی نے کہیں لکھا ہے کہ جے پور سے زیادہ صاف سڑکیں میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھیں۔ وجہ یہ کہ گوبر اور لید زمین پر گرنے سے پہلے ہی اچھوت عورتیں کیچ لے لیتی ہیں۔"

اس نے زعفرانی بادبانوں کی ساری ہوا نکال دی۔ غریب شہر سر جھکائے، چھوڑے ہوئے دیس کو پردیسی کی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی۔

"تم راجپوت ہو؟"

"آدھا۔ نانا تھے۔ نو مسلم راٹھور۔ طوطے کی چونچ جیسی ناک والے راٹھور۔"

"بالکل لال؟"

"نہیں۔ خمدار۔"

مردانہ کھیلوں سے ہماری دلچسپی

"آخر تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کوئی معقول وجہ؟"

ہم کافی نروس ہو چکے تھے۔ دو تین دفعہ زور لگانے کے بعد جو آواز اچانک ہمارے منھ سے نکلی وہ اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں سُنی تھی۔

شاید اسے بھی ترس آگیا۔ اب کے آسان سوال کیا۔ "جوانی، میرا مطلب ہے طالب علمی کے زمانے میں کن کھیلوں سے دلچسپی رہی؟"

"کیرم اور لوڈو"

"میرا مطلب مردانہ کھیلوں سے تھا۔"

ہمارا یہ خانہ بالکل خالی تھا۔ پانچویں جماعت میں البتہ سالانہ اسپورٹس کی دوڑ میں ہمارا اکیسواں نمبر آیا تھا۔ دوڑ میں اتنے ہی لڑکے شریک ہوئے تھے۔ کچھ دن فٹ بال سے بھی سر مارا۔ آخری لمحہ اتصال تک یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ اس دفعہ فٹ بال پر اپنا دایاں پاؤں ماریں یا بایاں زیادہ مناسب رہے گا۔ دُودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی ہم خاصے دبیز شیشے کی عینک لگانے لگے تھے۔ (جو حضرات ضعف بصارت سے محروم ہیں، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب کبھی ہم عینک اُتار کر آئینہ دیکھتے ہیں تو بخدا اپنے کان نظر نہیں آتے) کئی دفعہ عینک ٹوٹنے کے بعد اب ہم اسے اُتار کر بے خطر کھیلنے لگے تھے۔ کھیلتے کیا تھے، ہر ایک سے مینڈھے کی طرح

ٹکریں لیتے پھرتے تھے۔ مخالف ٹیم میں ہمیشہ بہت "پاپولر" اس لیے کہ اپنی ہی ٹیم سے گیند چھینتے اور انھیں کو فاؤل مارتے پھرتے تھے۔ کھیل کے شروع میں "ٹاس" کیا جاتا۔ جو کپتان ٹاس ہار جاتا وہ ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے کا پابند ہوتا۔ جب تک مخالف کھلاڑی تاک کر ہمارے پاؤں پر زور سے فٹ بال نہ مارے، وہ ہمارے کِک سے محروم ہی رہتی تھی۔ چونکہ سر ہمارے دیدۂ نیم بینا سے قریب ترین عضو تھا، اس لیے ہم نے سر سے فٹ بال روکنے اور گول کرنے کی مشق و مہارت پیدا کی۔ ایک دن ہم نے تین فٹ اچھل کر "ہیڈ" کیا تو جس گول شے سے ہم نے آنکھ بند کر کے اپنی پوری قوت سے ٹکر لی وہ دیو قامت جسونت سنگھ چوہان کا مُنڈا ہوا سر نکلا۔ وہ شام کو ٹھنڈائی (بھنگ) پی کر فٹ بال کھیلتا تھا۔ ہماری ناک کا بانسہ اور دل ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

ہم نے عینک اتار کر مردانہ کھیل سے اپنی دیرینہ وابستگی کا ثبوت اینڈرسن کو دکھایا۔ ناک کی خمیدہ ہڈی دیکھ کر بہت ہنسا۔ کہنے لگا تمھارا ایک کان بھی ٹیڑھا لگا ہوا ہے۔

"اور تم RIMLESS GLASSES کیوں لگاتے ہو؟ تمھاری صورت سر اسٹیفرڈ کرپس سے ملتی ہے۔"

"ذرّہ نوازی کا شکریہ!" ہم نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے اُس باسٹرڈ کی صورت سے نفرت ہے۔"

تو پھر اب کیا جگہ کی قید

ہم ابھی اس چوٹ کو ٹھیک سے سہلا بھی نہ پائے تھے کہ استفسار فرمایا "کنوارے ہو؟"

"نو سر!"

"کتنی بیویاں ہیں؟" اس نے سوال کر کے دونوں ہونٹ بھینچ لیے۔

"ایک۔"

"مجھے تو چار پر بھی اعتراض نہیں۔ لیکن چار بیویوں میں قباحت یہ ہے کہ چار دفعہ طلاق دینی پڑتی ہے۔"

بھلاوا دے کر پھر وہی سوال دہرایا "سفارش اپنی جگہ، لیکن بینک میں کیوں ملازمت کرنا چاہتے ہو؟ بینکر کے کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟"

یہ سوال سنتے ہی ہمارے ہاتھوں کے روایتی طوطے دوبارہ اڑ گئے اور ایسے اڑے کہ پھر نہ لوٹے۔ ہم پھر "جھوڑنے" لگے۔ معقول وجہ کے بجائے لطیفے یاد آنے لگے، لیکن یہ موقع اس کے دامن کو ظریفانہ کھینچنے کا نہیں تھا۔ ہم نے تا دمِ تقریر و تقرّر کسی بینک کو اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اس کے پاس اتنی جائیداد اور سرمایہ ہے کہ قرض کی قطعاً ضرورت نہیں تو بینک اسے قرض دینے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ مارک ٹوین کا یہ مقولہ بھی کہیں پڑھا تھا کہ بینکر اچھے وقتوں کا بہترین ساتھی ہوتا ہے۔ موسم اچھا ہو تو زبردستی اپنی چھتری ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ لیکن جیسے ہی چھینٹے پڑنے لگیں تو کہتا ہے لاؤ میری چھتری۔ ہمیں تو بس اتنا بتایا گیا تھا کہ بینکر دھڑلّے سے سُود لیتے ہیں۔ سُود دیتے ہیں۔ اور سُود کا حساب رکھتے ہیں۔ اور یہ تینوں فعل از روئے شرع حرام ہیں۔

رہی "بزنس مین" سے واقفیت، سو ہمارا حلقہ شناسائی صرف ایک کائیاں مارواڑی سیٹھ پر مشتمل تھا جو روپیہ اپنی تجوری میں رکھتا تھا اور بلو فلیس بینک کے لاکر میں اور جہاں تک بینکنگ کے بارے میں کتابی معلومات کا تعلق تھا تو وہ اس ادبی دریافت تک محدود تھیں کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جب WASTELAND لکھی تو وہ لائیڈز بینک میں کلرک تھا اور اس پیشے سے اس کا پنڈ چھڑانے کے لیے ازرا پاؤنڈ نے چندے کی ایک عالم گیر مہم چلائی تھی جس میں کُل تیس پاؤنڈ جمع ہوئے۔ اسی طرح مشہور مزاح نگار جارو سلاو ہسلک بھی ایک بینک میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہاں جو کچھ اس نے دیکھا، اس سے اتنا اثر لیا کہ بھرے بھتولے گھر پر جھاڑو پھیر کر ہمیشہ ہمیش کے لیے خانہ بدوش ہو گیا۔ اور اگر او۔ ہنری بینک میں غبن نہ کرتا تو دنیا ایک عظیم افسانہ نگار سے محروم ہو جاتی۔ اُس نے بینک کے خشک اعداد و شمار میں افسانہ کا رنگ بھر دیا۔ چنانچہ بینک والے میں چلا گیا اور اسے خیانت مجرمانہ کے الزام میں پانچ سال کی سزا ہوئی۔ جیل ہی میں اُس نے اپنا پہلا افسانہ لکھا اور نام تبدیل کر کے ولیم سڈنی پورٹر سے او۔ ہنری بن گیا۔ او۔ ہنری دراصل اس جیل کے سنتری کا

نام تھا۔ اس زمانے میں ہمیں اپنی معلومات عامہ پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اور دن میں بھی وہ سرمستی و نخوت طاری رہتی تھی جو خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کو صرف رات گئے میسر آتی تھی:

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت
نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

لیکن اس کڈھب سوال سے سارا نشۂ علم ہرن ہو گیا۔

NEGOTIABLE INSTRUMENTS ACT کا نام ضرور سنا تھا۔ شروع میں تو ہم سمجھتے تھے کہ ARMS ACT کی طرح سُود خوروں کے لیے انتقال آلاتِ قتل کا کوئی قانون ہو گا۔ بعد میں بھی معلوم ہوا تو بس اتنا کہ کسی لیڈر کی روح عالم بالا کو پرواز کر جائے یا سکّے کی قیمت زمین پر آرہے تو بینک اس قانون کے تحت بند کیے جاتے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی لیڈر قوم کو داغِ مفارقت نہ دے تو اس قانون کا کیا مصرف ہے، بینک اس طویل وقفۂ انتظار میں وقت گزاری کے لیے کیا کرتے ہیں ——— اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

ایک کم پانچ اور ایک اوپر تین کا فرق

بینکاری کے اسرار و رموز تو کجا، ہم نے تو زندگی میں کسی مسلمان بینکر کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے اس "آؤٹ آف باؤنڈز" پیشے میں اعلیٰ ہی نہیں، ادنیٰ عہدوں پر بھی انگریز اور ہندو فائز تھے۔ البتہ مسلمانوں پر اپنی جمع جتھا سیونگ بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے پر کوئی پابندی نہیں تھی: اور بیچارے مسلماں سے فقط وعدۂ سُود!

لیکن ہم دھوکے میں آنے والے نہیں۔ بزرگوں نے صدیوں پہلے کفایت شعاری کو ہندوانہ رسم سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ سو پُشت سے جن قوموں اور قبیلوں کا پیشۂ آبا سپہ گری (یعنی پہلے دشمن بنانا اور پھر انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارنا یا وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو خود اُتر جانا) رہا ہو، وہ تجارت کو پتلی دال کھانے والے بقّالوں کا حق سمجھ کر اس سے اجتناب کریں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ مہابلی اکبر نے بھی آخر کار محکمہ مال کا چارج راجہ ٹوڈرمل کو تفویض کیا اور فیضی

کو بھگوت گیتا اور مہا بھارت کے فارسی ترجمے میں جوت دیا۔ (بیربل کو البتہ راقم الحروف کے فرائض سونپے گئے کہ خبردار! منہ سے کبھی کوئی سنجیدہ بات نکالی تو وہیں زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔) ایک ریت سی پڑگئی تھی کہ مسلمان رؤسا اور جاگیرداروں کی آمدنی کا حساب ہندو منیم رکھتے اور خرچ کا حساب خود عدالت کو قُرقی کے وقت بنانا پڑتا تھا۔ اعمال کے حساب کتاب کا جنجال بھی ہم نے کراماً کاتبین کو اور متعلقہ آڈٹ منکر نکیر کو سونپ رکھا ہے۔ ہمیں روپیہ ہمیشہ کم ہی معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان ۲ اور ۲ کو ۴ نہیں، بلکہ ایک کم پانچ کہتا ہے، جب کہ ہندو ایک اوپر ۳ کہتا ہے۔ یہ قول رابرٹ کلایو کے ایک ہم عصر سے منسوب ہے کہ روپیہ بچا کر رکھنے کے معاملے میں مسلمان چھلنی کی طرح ہوتا ہے اور ہندو اسفنج کی مانند۔

سوداگری کو کسرِ شان سمجھنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ دُودمانِ تیموریہ پر جب ملکِ خدا تنگ ہُوا تو اس کا آخری چشم و چراغ مہاجن سے قرض لے کر فوج کی تنخواہیں چکاتا اور اپنی غزلوں کی اصلاح کرنے والے اُستاد، نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو چاندی کے طشت میں زربفت کے تورہ پوش سے ڈھکا ہوا سیم کے بیجوں کا توشہ بھیجتا۔ تقسیم سے پہلے کے تین چار سو برسوں میں خاص کر، برصغیر کے مسلمان نے تجارت کو اپنی شانِ قلندری کے خلاف سمجھا۔ اس لیے کہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ ذرا سی غفلت یا لاپروائی سے کہیں منافع نہ ہو جائے۔ چمڑے اور کھالوں کی ساری تجارت البتہ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، جس کی تین وجہیں تھیں۔ اوّل تو یہ انھی مرحومین کی آخری نشانی تھی جنھیں وہ برغبت کھا چکے تھے۔ دوم یہ کہ ہندو اس کاروبار کو ناپاک سمجھتے تھے۔ سوم، خوش قسمتی سے ان تاجروں کا تعلق چنیوٹ سے تھا جو دلّی کے دربار سے ہنوز دُور تھا۔ ان کی سوجھ بوجھ کے سامنے مارواڑی بھی کان پکڑتے ہیں۔ مشہور ہے کہ چنیوٹی یا میمن پاگل ہو جائے تب بھی دوسرے کی پگڑی اتار کر اپنے ہی گھر میں پھینکتا ہے۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

حساب کتاب کا جنجال

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اردو کی داستانوں میں سوداگروں کا ذکر اگر کہیں آتا ہے تو وہ محض

قزّاقوں سے لٹنے کے لیے۔ اور یہ بھی اس طور پر کہ پڑھنے والے کی اخلاقی ہمدردی ہمیشہ لوٹنے والے کے ساتھ رہتی ہے۔ اردو غزل میں، ہمیں یاد نہیں کہ کسی شاعر نے سوداگر کو کلمۂ خیر کے ساتھ یاد کیا ہو۔ ہاں ایک نظم، "مثنوی زہرِ عشق"، میں سوداگر در آیا ہے۔ وہ بھی فقط اس لیے کہ اس کی ایک دختر تھی جو، خلاف محاورہ، نیک اختر نہ نکلی۔ مگر جس سے آگے چل کر شاعر کو ردیف و قافیہ کی چُول بٹھانے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام لینے تھے جن میں خلوت کی ملاقاتیں، اُن کے لازمی نتیجہ میں خودکشی اور آخرالذکر سے پہلے "پان کل کے لیے لگاتے جائیں" کا فریضہ شامل تھا:

جس محلّے میں تھا ہمارا گھر
وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دُختر تھی اُس کی ماہ جبیں
شادی اس کی ہوئی نہیں تھی کہیں

آخری مصرع میں جو نویدِ مسرّت ہے بس اسی نے پچھلے تین مصرعوں میں جان سی ڈال دی ہے۔ اور تو اور عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی نے سُود بڑھا کر لانے اور ٹوٹا گھاٹا پانے والے بنجارے کے ٹھاٹ باٹ کو مٹّی میں ملایا سو ملایا، تعلقاتِ زنا شوئی پر بھی ہاتھ صاف کر گئے:

دِھی، پُوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی

بچپن کی بات ہے۔ شاید اسی لیے اچھّی طرح یاد ہے۔ پورے قصبہ چاکسو (خورد) میں تجارت وجارت تو بڑی بات ہے، کسی مسلمان کی پنساری تک کی دُکان نہ تھی۔ ۱۹۳۳ء میں چند مسلمانوں نے قرض حسنہ اور چندہ جمع کر کے سرمایہ فراہم کیا اور صولت یار خاں ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس کو مسلمانوں کے محلّے میں پرچون کی دُکان کھلوا دی۔ اس زمانے میں کوڑیاں بھی چلتی تھیں۔ دھیلے کا گھی اور چھدام کے بینگن خریدتے غریبوں کو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ چھوٹے بینگن کا "جھونگا"★ اس کے علاوہ۔ صولت یار خاں کو منافع سے تو دلچسپی تھی، لیکن حساب کتاب کو مکروہ گردانتے تھے۔ دکان میں ان کی مسند تکیے، حقّے اور ترازو کے سامنے آٹا، شکر، بیسن، نمک، مرچ، دالیں اور

★ جھونگا: (پنجابی) وہ فاضل چیز جو سودا خریدنے والے کو دُکن میں ملے۔

مسالے، اُلٹی ہوئی آستین کی طرح اَدھ کھُلی بوریوں میں بھرے رہتے تھے۔ جو چیز جتنی بکتی اس کی قیمت اسی بوری یا کنستر پر سارے دن پڑی رہتی تاکہ حساب میں آسانی ہو۔ شام کو ہر جنس کی بکری کو علیحدہ علیحدہ گنتے۔ رد کرٹ کی میزان نہیں بیٹھتی تو اپنا دل نہیں جلاتے تھے۔ بہی کھاتوں میں ایک نئی مد "بھول چوک لینی دینی" کھول لی تھی۔ روزانہ کیش میں جو کمی واقع ہوتی وہ اسی کے متھے مارتے۔ ہوتے ہوتے اس مَد میں کافی رقم چڑھ گئی جو تقریباً اصل سرمایہ کے برابر تھی۔ شب برات کی صبح مرزا عبدالودود بیگ جن کی عمر اس وقت سات سال ہوگی، چھ پیسے کی زعفران لینے گئے۔ زعفران کی پُڑیا لے کر انھوں نے صولت یار خاں کو ایک کلدار روپیہ تھمایا۔ اتفاق سے زعفران کی ابھی بوہنی نہیں ہوئی تھی اور اس کے ڈبّے پر کوئی ریزگاری نہیں تھی۔ صولت یار خاں نے بندھی بندھائی پڑیا مرزا کے ہاتھ سے چھین کر کہا ہُشت! ہمارے پاس ریزگاری نہیں۔ گوبندا بنئے کی دکان سے خرید لے۔ مرزا نے انگلی سے ریزگاری کی ان ڈھیریوں کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً ہر بوری اور کنستر پر پڑی تھیں۔ ارے صاحب وہ تو آپے سے باہر ہو گئے۔ دھمکی آمیز انداز سے دوسیری★ اٹھاتے ہوئے بولے، مرغی کے! دوسری ڈھیری میں سے ریزگاری نکال کے تجھے دے دوں تو شام کو حساب کون کرے گا؟ تیرا باپ؟

ہمارا چوتھی کھونٹ جانا

بچپن میں ہم کبھی "کیریر" کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے تھے تو انجن ڈرائیوری کے سامنے بادشاہی بھی ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ نام خدا ذرا سیانے ہوئے اور دل سے جن، بھوت اور بزرگوں کا ڈر نکلا اور وہ دن آئے "جب سائے دھانی ہوتے ہیں، جب دھوپ گلابی ہوتی ہے" تو گھنے جنگلوں میں ٹارزن کی سی سادہ زندگی گزارنے کا عزم کیا۔ نہ امتحان کا کھٹکا، نہ روز صبح منھ دھونے کا کھڑاگ۔ محبوبہ ایک گز بھی دُور کھڑی ہو تو زورِ شباب میں اکیس گز کی چھلانگ لگانا۔ پھر واپس بیس گز کی چھلانگ لگا کر پہلو میں پہنچنا اور چنگھاڑنا۔ جٹا دھاری برگد کی داڑھی یا یہ ہاتھ نہ لگے تو لنگور کی دُم پکڑ کے جھولتے ہوئے زنّوں سے ایک درخت سے دوسرے درخت اور ایک مقام سے دوسری

★ دوسیر سے زیادہ کچھ تولنا ہو تو باٹ گاہک کو اٹھانے پڑتے تھے۔

دُم تک پہنچنا۔ بن میں ترے کودا کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا! پھر اپنے اور حورِ صحرائی کے درمیان کوئی دریا، ظالم سماج کی طرح حائل ہو جاتا تو اسے اس کے والدِ یا مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر پار کرتے۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ جو کہانی بھی پڑھتے اس کے ہیرو کا محبوب مشغلہ بلکہ محبوبہ تک کو اپنانے کا فیصلہ کر لیتے۔ کسی کے مُنہ پر سہرا لٹکا دیکھتے تو واللہ تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ محسوس ہوتا گویا ہماری ذاتی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اور اگر صلیبی جنگیں بند کرنے میں فریقین اور مولانا عبدالحلیم شرر اتنی عجلت سے کام نہ لیتے کہ ہمیں پیدا ہونے کا موقع تک نہ دیا، تو آج ہماری قبر قسطنطنیہ، رومانیہ، ہسپانیہ یا کسی اور ترقی یافتہ ملک میں ہوتی۔

ہم نے خود کو ہر بہروپ، ہر سوانگ میں دیکھا تھا، سوائے بینکر کے۔ یہ وہ چوتھی کھونٹ تھی جس طرف جانے کی داستانوں میں سخت مناہی ہوتی ہے۔ لیکن جدھر جانے والا ضرور جاتا ہے اور پچھتاتا ہے۔

حلال و حرام

"پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب، کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب"۔ بزرگوں کی اس نصیحت اور علمِ نجوم سے لبریز پیش گوئی پر سارا بچپن نچھاور کروانے کے بعد جب ہماری باری آنے لگی تو یار لوگوں نے ریاستیں رجواڑے ہی ختم کر دیے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آدمی ذرا اور چنچل ہو تو کھیلے کودے بغیر بھی خود کو خراب و خوار کرنے کی کوئی نئی راہ نکال ہی لیتا ہے۔

تیسری جماعت تک ٹونک (راجستھان) میں خود پر تعلیمی تجربے کروائے۔ وہاں اسکول میں ظہر کی نماز باجماعت ہوتی تھی جسے بے وضو ادا کرنے یا سجدے میں ہنسنے پر انگلیوں کے درمیان نیزہ کا قلم رکھ کر دبایا جاتا تھا جو اکثر اس سزا کی تاب نہ لا کر ٹوٹ جاتا تھا۔ قتلِ عمد کی سزا موت تھی۔ جلّاد جب ٹھرّا پی کر گردن اڑاتا تو تماشا دیکھنے کے لیے شہر کا شہر اُمنڈ پڑتا۔ رقیق القلب لوگ سبز عینک لگا کر جاتے تھے جو اس زمانے میں صرف اس وقت پہنی جاتی تھی جب آنکھیں دُکھنی آجائیں۔ اس سے خون بینگنی اور تلوار سبز نظر آتی تھی۔ محکمہ قضاۃ اور عدالت شرع شریف بھی

تھی گو کہ اس کا دائرہ بے اختیاری سُکڑتے سُکڑتے طلاق اور آشنائی کے لذیذ قضیوں تک محدود ہو گیا تھا۔ (حیدر آباد دکن میں تو طوائفوں اور تاڑی پر نظر رکھنے والے سرکاری محکمہ کو محکمہ بدعت کہتے تھے) ٹونک میں دین اور شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ جلّاد اور امراء و شرفا کے علاوہ عام آدمی کو شراب پینے کی اجازت نہ تھی۔ خدا نہ سہی، قاضیٔ شہر کا خوف ابھی دلوں سے دُور نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ خلافِ شرع کوئی کام کرنا ہو تو مسلمان اپنی ترکی ٹوپیاں اُتار کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ ٹونک کے ایک سیلانی نواب زادے مصر اور ترکی گئے تو اس بات پر بہت متعجب ہوئے کہ وہاں تو مسلمان نماز بھی ٹوپی اتار کر پڑھتے ہیں۔

ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سُود جسے حرام ٹھہرایا گیا ہے اور ربا جس کی حرمت میں ہمیں آج بھی شمّہ برابر شبہ نہیں، ہمارا ذریعہ معاش ہی نہیں، بلکہ ہر اعتبار سے غالب و کار آفریں، کارکشا و کارساز ثابت ہو گا۔ والد مرحوم پاکستان آنے لگے تو اپنے پوسٹ آفس سیونگ بینک اکاؤنٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے چھوڑ آئے تھے جو اُن کے حساب سے بیس سال کے سُود کی رقم بنتی تھی۔ وہ کسی ایسے مسلمان کے ہاں دعوت کھانا تو بڑی بات ہے، پانی پینا بھی حرام سمجھتے تھے جس کے متعلّق انھیں معلوم ہو کہ وہ اپنے اکاؤنٹ پر سُود لیتا ہے۔ انھوں نے ایک دن امام ابو حنیفہ کا قصّہ سنایا تھا کہ ایک شخص کی تدفین کے بعد لوگ ایک مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ مگر امام ابو حنیفہ دور چلچلاتی دھوپ میں کھڑے رہے۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ سائے میں کیوں نہیں آجاتے؟ آپ نے جواب دیا اس مکان کا مالک میرا مقروض ہے اگر میں اس کے سایۂ دیوار سے فائدہ اٹھاؤں تو ڈرتا ہوں کہ روزِ حساب اس کا شمار سُود میں نہ ہو جائے۔

خیال آیا کہ ملازمت مل بھی گئی تو ایسے باپ کو یہ کیسے بتائیں گے کہ مچھندر نے بہر طور روٹی کمانے کے لیے کیا کسب اختیار کیا ہے۔ وہ ریاست ٹونک میں پولیٹکل سیکرٹری رہ چکے تھے۔ ریاستی خُوبُو سے مبرّا، پابند شرع، سادہ دل مسلمان تھے۔ کٹّے، بے علم نہ تھے۔ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۴ میں بی۔اے کیا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ٹونک میں بڑے کنویں کے

سامنے ہماری لق ودق حویلی میں ہز ہائی نس نواب حافظ سرابراہیم علی خاں، والئ ریاست، کے درجنوں فوٹو ہر اس جگہ ٹنگے تھے جہاں کیل بغیر اس خدشے کے ٹھونکی جاسکتی تھی کہ ساری دیوار نہ آن پڑے۔ انھوں نے ہر ایک کی ناک چاقو سے چھیل دی تھی، اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ شبیہ مکمل ہو تو اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ ساٹھ ستر امرا، صاحبزادگان اور درباریوں پر مشتمل ایک گروپ فوٹو، جس میں وہ خود بھی شامل تھے، ایک طاقچے کی زینت تھا۔ اس کا بھی وہی نقشہ تھا۔ ناوک نے تیرے ناک نہ چھوڑی زمانے میں! نواب صاحب، جو اَسی کے پیٹے میں ہوں گے، خود بھی حافظ و متشرّع، تہجّد گزار، سادہ و نیک طینت مسلمان تھے۔ اپنی ناک آپ چھیلتے تھے۔ فیضی رحمین سے انھوں نے جو اپنی قدآدم پینٹنگ بمبئی جاکر بصرفِ کثیر بنوائی تھی، اس کی ناک انھوں نے اپنے جدِّ اعلیٰ امیر خاں لٹیرے کی قبر دلی سے ٹونک میں خود چھیلی تھی۔ رعایا کو اس خدا ترس، درویش منش فرمانروا سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ یکم محرّم کو پیدائش کے بعد ہمیں اس وقت تک کوئی کپڑا نہیں پہنایا گیا جب تک عشرہ کے بعد اس بزرگ کی اُترن کے تبرک سے ہمارا پہلا کرتا نہ سِل گیا۔ خدا علیم و خبیر ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس عقیدت و ارادت میں مصلحت و مصاحبت کو کتنا دخل تھا۔ ہم نے اپنے ہوش میں پہلی دفعہ جے پور کا میوزیم دیکھا تو بڑا تعجب ہوا کہ صدیوں پرانی مورتیاں اور بُت البرٹ ہال کے کاریڈور میں قطار اندر قطار سجے ہیں۔ ہر طرح صحیح و سالم۔ لیکن ناک ہر ایک کی ٹوٹی ہوئی۔ جب ذرا سوجھ بوجھ پیدا ہُوئی تو سمجھ میں آیا کہ اس آذر کدے سے ہر دور، ہر صدی میں نام بدل بدل کر، کوئی ابراہیم علی خاں مع اپنے مشیر با تدبیر کے گزرتا رہا ہے۔

ہمارے برہمچاری آشرم میں چھ ہفتے کی توسیع

"تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کوئی معقول وجہ؟" ذہن پر بہتیرا زور دیا۔ وہ اگر معقول کی پخ نہ لگاتا تو ہم ایک ہزار ایک وجوہات گنوا سکتے تھے۔ اور اگر اس نے ہماری سچ بولنے کی عادت کو اس شدّت سے نہ سراہا ہوتا تو ہم یہ جھوٹ بول کر پیچھا چھڑا لیتے کہ حساب

کتاب سے ہمیں پیدائشی لگاؤ ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ بزرگ ہمارے حساب کے نمبر دیکھ کر مشتعل ہو جاتے اور ہر سوال پر صفر کو صحبت بد کا ثمرہ سمجھتے۔ (حاشا و کلاّ! مرحوم بزرگوں کی خطا کی گرفت کرنا ہمارا کام نہیں، فرشتوں کا فرض ہے۔ لیکن صحبتِ بد کی وضاحت اور "ریکارڈ درست رکھنے" کی خاطر خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتے ہیں کہ جتنی بھی گالیاں ہمیں یاد تھیں وہ سب ہم نے اپنے بزرگوں اور ماسٹروں ہی سے سیکھی تھیں۔) ان دنوں ہمیں اس کا بڑا ارمان تھا کہ کاش ہمارے سر پر سینگ ہوتے تو بزرگ ہمیں کم از کم گدھا تو نہ سمجھتے۔ مرزا کے ددھیالی بزرگ تو ان کی پیٹھ پر باکسنگ کی مشق بھی کرتے تھے۔ ساتویں جماعت میں جب ہمیں انگریزی میں ۱۰۰ میں سے ۹۱ اور حساب میں پندرہ نمبر ملے تو ہم نے گردھاری لال شرما سے رجوع کیا جس نے بالکل یہی نمبر حاصل کیے تھے۔ مضامین کی ترتیب البتہ اُلٹی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ریاضی داں رامانج رات کو چراغ کی روشنی میں اس طرح پڑھتا تھا کہ ایک ڈوری سے اپنی چوٹی کو چھت کے کڑے سے باندھ لیتا تھا تاکہ نیند کا جھونکا آئے تو آنکھوں کے آگے بجلی سی کوند جائے۔ لیکن ہم نے اسے بتایا کہ ہماری چھت کے کڑوں میں تو پہلے سے ہی فرشی پنکھا لٹک رہا ہے، جسے صرف بقرعید پر اتارتے ہیں تاکہ قصائی ان میں بکرے اُلٹے لٹکا کر کھال اُتار سکے۔ بغل تک ہاتھ اور بند مُٹھی کھال میں گھسا گھسا کر۔ گردھاری لال شرما نے ہاتھ جوڑ کر ہمیں مزید تفصیلات میں اُترنے سے روکا اور اپنی تجویز فوراً واپس لے لی۔

کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ چنتا نہ کرو۔ بچار کر کے کل تک کوئی اور اُپائے نکالوں گا۔ دوسرے دن اُس نے اپنا بچن پورا کیا اور حساب میں ۹۱ نمبر لانے کے دو گُر بتائے۔ پہلا تو یہ کہ بھوگ بلاس سے دُور رہو۔ آج سے پرتگیا کر لو کہ امتحان تک برہمچریہ کا پالن کرو گے۔ ہٹیلی کامنائیں یا چنچل بچار ستائیں تو تین دفعہ "اوم! شانتی! شانتی! شانتی!" کہنا۔ اس سے بیاکل ساگر اور بھٹکتا جوالا مُکھی بھی شانت ہو جاتا ہے۔ اوم! شانتی! شانتی! شانتی!

ہم نے کہا نہ بابا! یہ ہم سے نہ ہو گا۔ بولا بھائی جی! تم مُسلے ہوتے ہو بڑے کٹّے۔ ہم نے کہا یار! یہ بات نہیں۔ ہمیں تو اس سے شانتی کھنّا یاد آنے لگے گی۔ بولا نا! نا! پھر تو

سوتے سمے پرانے پیڑے کی لسّی پی لینا۔ کسی کو لُوگ جائے تو پلاتے ہیں۔ اور جیسے ہی سُندر سُپنا دکھائی دینے لگے تو انتڑول میں ہی اُٹھ کھڑے ہونا اور ایک لال مرچ کی دھونی لے لینا۔ ایک پل، ایک چھن کے لیے بھی استری کا دھیان من میں نہ لانا۔

"کوئلے سے گرم ہونے والی کا بھی نہیں؟" ہم نے وضاحت چاہی۔

"پاس ہونا ہے تو برہمچریہ کا پالن کرنا ہوگا۔"

خیر۔ اس شرط سے تو ہم زیادہ بددل نہ ہوئے۔ اس لیے کہ بارہ برس کی عمر میں ڈیڑھ دو مہینے اور برہمچاری رہنا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ ہم نے حتی الامتحان کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرا گُر یہ بتایا کہ چوٹی کا کشٹ نہیں اٹھا سکتے تو سر پر باریک مشین پھروالو۔ اور بیچ میں اُسترے سے مُنڈوا کر ایک پان بنوالو۔ اور اسے سردلی آم کی گُٹھلی سے رگڑواؤ۔ ساری بھُوسی جھڑ جائے تو اس پر گائے کے مکھّن کی ٹکیہ رکھ کر کھلے آکاش تلے سوال نکالا کرو۔ ہاں! تالُو اس کارن منڈواتے ہیں کہ دھرماتماؤں کے پران کھوپڑی کے رستے ہی نکلتے ہیں۔ پھر اس کا چمتکار دیکھنا۔ میری چوٹی ٹائیفائڈ کے بعد جھڑ گئی تھی۔ مَیں نے تو یہی کیا۔ اور یار میاں جی! اساد ھلن جیون بتانا سیکھو۔ گرم چیزوں سے ایک دم پرہیز۔ گوشت، گرم مصالحے، گُڑ کی گجک، اور اُردو غزل سے چالیس دن الگ رہنا۔

اس کے بدلے، انگریزی میں ۹۱ نمبر حاصل کرنے کا جو نسخہ ہم نے اس رامانج کے لیے تجویز کیا اس میں صرف وہ اجزا شامل تھے جن سے اس نے ہمیں پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی۔ بہرحال، ہم نے اس کی ترکیب پر ۱۲، ۱۳ شب عمل کیا، جس میں یوم الحساب کی چاندرات بھی شامل تھی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ کھلے آسمان کے نیچے پان اور اس کے متصلہ علاقے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگتی تو آنکھیں آٹھ بجے آپ ہی آپ بند ہو جاتیں۔ بُرے بُرے خیال آنے کا انتظار ہی رہا۔

ہمیں تو نیند ہی آئی شباب کے بدلے

سمندری موت کی ہوائی موت پر فضیلت

مسٹر اینڈرسن نے آخری مرتبہ بڑی دھیرج سے سوال کیا "تم اس پیشے میں کیوں آنا چاہتے ہو؟ میں یہ سوال تمھیں انٹرویو میں فیل کرنے کے لیے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ اگر یہی منشا ہوتا تو میں یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ بتاؤ اِس کتّے کے والد کا کیا نام ہے؟ ہوا! ہوا! ہوا!"

"میرا تقرر مسٹر ایم۔ اے۔ اصفہانی نے اورینٹ ایئرویز میں کیا تھا۔ مَیں سِول سروس چھوڑ کر ہندوستان سے کراچی آیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ حال ہی ایک ہوائی جہاز گر گیا ہے۔"

"تم پائلٹ ہو؟"

"نہیں تو! ایئر کریش میں وفات پانے کے لیے آدمی کا پائلٹ ہونا ضروری نہیں۔"

"You're telling me!"

"سَر! مجھے یوں بھی ہوائی جہاز سے سخت نفرت ہے۔" ہم نے جھوٹ بولا جس میں سچ کا عنصر صرف اس قدر تھا کہ مناباؤ سے کھوکھراپار تک ہندوستان و پاکستان کا سرحدی علاقہ ہم نے اونٹ کے کوہان پر بیٹھ کر طے کیا تھا۔ (اونٹ کے بقیہ حصّوں پر دوسروں کا اسباب رکھا تھا۔) انٹرویو کے دن تک ہماری ٹانگوں کا درمیانی فاصلہ اسی کوہان کے برابر یعنی ایک گز تھا۔ جیسے کسی نے چمٹے کو چیر کر سیدھا کر دیا ہو۔

"ہا ہا ہا! عالی دماغ لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ مجھے بھی اس شیطانی ایجاد سے سخت چڑ ہے۔ سمندری سفر سے بہتر کوئی سفر نہیں۔ شاہی سواری صرف ایک ہے —— اسٹیمر۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ چوبیس گھنٹے کا سفر چوبیس دن میں طے ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ فری ڈرنکس۔ مَیں تو پچھلے تیس سال سے لندن سے ہمیشہ بحری جہاز سے آتا ہوں

Afterall, a ship-wreck is much safer than an air-crash! Don't you agree?

مجھے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ تم بھی ہوائی جہاز سے الرجک ہو۔ آج سے تم خود کو بینک کا COVENANTED OFFICER سمجھو۔"

پسلی پھڑک اُٹھی نگہِ انتخاب کی

اس انٹرویو کو تیئیس سال ہو گئے۔ ہمارا خیال کیا، پختہ یقین ہے کہ اس نے ہمیں بینک میں محض اس لیے ملازم رکھ لیا کہ ہمیں بھی ہوائی جہاز سے نفرت تھی۔ ہوائی کمپنی اور خدا ہمیں معاف کرے، ہمیں اس ایجاد سے ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تادمِ تحریر ہم کسی ہوائی حادثے میں ہلاک نہیں ہوئے، جیسا کہ بہت سے ذہین قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا لیکن کبھی کبھی احمقانہ فقرے سے بھی آدمی کے دن پھر جاتے ہیں، بشرطیکہ سننے والا بھی اس صنفِ سخن کا قدردان ہو۔ اینڈرسن کم و بیش نو سال پاکستان میں رہا، لیکن لاہور محض اس لیے نہیں گیا کہ وہاں پانی کا جہاز نہیں جاتا۔ لاہور کو "کنٹری سائیڈ" کہتا تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے آبائی گاؤں کی آبادی دو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ نصف آبادی وہسکی بناتی اور بقیہ نصف اسے پیتی تھی۔ خیر، ہم ٹوکنے والے کون۔ کنوئیں کے مینڈک کو تالاب کے مینڈک کا مذاق اڑانے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہم خود اندرون سانگانیری گیٹ، جے پور، کے رہنے والے تھے اور عرصہ دراز تک باقی ماندہ برصغیر کو OUTSIDE SANGANERI GATE سمجھتے رہے۔

ہماری سیہ پوشی

اس نے ہمیں تقرری پر مبارکباد دی۔ ہم نے بھی جی کھول کر اُس کے حسنِ انتخاب کی داد دی۔ ابھی ہم نے انگریزی کا دوسرا جُملہ اپنے خراد پر چڑھایا ہی تھا کہ اُس نے پوچھا:

"اسکاٹ لینڈ کی کس چیز کی ساری دنیا میں دُھوم ہے؟"

"بیگ پائپ میوزک، وہسکی اور کنجوسی۔"

"اور؟" اس نے مُنھ بگاڑ کر پوچھا۔

"بُل ٹیریر کتے، گاف کلب، HAGGIS اور KILT ★" ہم نے سب کچھ اُگل دیا۔

★ KILT مردوں کا گھٹنوں سے اوپر تک کا اسکرٹ جو صرف اسکاٹ لینڈ والے پہنتے ہیں۔
HAGGIS دِل، کلیجی اور پھیپھڑے کو اوجھڑی میں بند کر کے دم پخت کرتے ہیں۔

وہ انگارہ ہوگیا۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا سارا جنرل نالج ان گندے لطیفوں سے کشید کیا ہے جو انگریزوں نے اسکاٹ لینڈ کے بارے میں گھڑ رکھے ہیں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسکاٹ لینڈ کا سب سے قیمتی سرمایہ، سب سے مشہور چیز تمھارے سامنے بیٹھی ہے — اسکاٹ بینکر۔ ہمارا لوہا ساری دنیا مانتی ہے۔ ہم جب قرض دیتے ہیں تو اس میں سے سارا سُود پیشگی مجرا کرکے دھروا لیتے ہیں۔ ہمارا سُود کبھی نہیں ڈوبتا۔ اصل رقم بھلے ہی ڈوب جائے۔ اور محتاط اور وہمی اتنے کہ جب تک یکم جنوری کے سورج کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں، اسکاٹ لینڈ میں کوئی شخص دیوار پر نئے سال کا کیلنڈر نہیں ٹانگتا۔ مجھے تو تمھاری خوش نصیبی پر رشک آ رہا ہے کہ تم ایک اسکاٹ بینکر سے اس پیشے کی ابجد سیکھو گے۔ اولین فرصت میں لندن سے RAE'S COUNTRY BANKER منگوا کر حفظ کرلو۔ ہمارے پیشے کی بائیبل ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ چسیٹر فیلڈ کے خطوط پڑھا کرو۔ دو سو سال سے ان کا شمار کلاسکس میں ہوتا ہے۔ پند و نصائح اور 'ورڈلی وزڈم' (فراستِ ارضی) سے بھرپور۔ اخلاقیات، نفسیات اور آدابِ مجلس کے بڑے باریک نکتے ملیں گے۔ خونِ جگر سے لکھی ہوئی یہ کتاب مجموعہ ہے ان خطوط کا جو اس نے تیس سال کی مدّت میں اپنے NATURAL SON کو لکھے تھے۔ جانتے ہو، انگریزی میں حرامی اولاد کو فطری بیٹا کہتے ہیں؟ اس لحاظ سے ہم تم غیر فطری اولاد ہوئے۔ ہاہاہا!"

اُس کا مُوڈ بدل چکا تھا۔ ہم رخصت ہونے لگے تو اس کے کتّے نے پھر اٹھ کر چُوماچاٹی کی الوداعی رُسوم ادا کیں اور دروازے تک دُم اٹھائے مشایعت کو آیا۔ ہم دروازہ کھول کر نکلنے والے ہی تھے کہ "جسٹ اے منٹ!" کہہ کر واپس بُلایا۔ ربّ العزّت! اب کون سی کسر باقی رہ گئی؟ یہ اہانتوں کا ٹھیکرا جسے پاپی پیٹ کہتے ہیں، یہ تو کبھی کا بھر چکا۔

"اور اگر تم تھری پیس سُوٹ پہن کر ہی بھرے دفتر میں کراچی اسٹیم باتھ لینے پر مُصر ہو، جس کی وجہ اندر پھٹی قمیض بھی ہوسکتی ہے، ہاہاہا! —— تمھاری خوشامد مجھے مقصود نہیں، لیکن ایمان کی بات ہے، اس سے زیادہ WELL-DRESSED SCARE-CROW میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا —— اگر کچھ پہننا ہی ہے تو یہ شطرنج کی بساط جیسا چوخانے دار

سُوٹ اور میرے دیس کی ٹارٹن ٹائی پہن کر بینک نہ آنا۔ ساری دُنیا میں بنکروں اور کسبیوں کا روایتی پہناوا سیاہ لباس ہے۔ سیاہ سوٹ پہنا کرو۔ ٹریڈ مارک!"

اور یوں ہماری زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ بلکہ، بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، صفحہ پلٹنے کی آواز بھی دُور دُور تک سنائی دی۔ اگر ہم نے اپنے دانا دوست میاں محمد شفیع کے مشورے پر عمل کیا ہوتا تو آج ہم ایک ناکام سے بنکر کے بجائے ٹوٹا باسمتی چاول اور کریانا کے ناکام آڑھتی ہوتے۔

رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

روٹی تو بہرطور کما کھائے مچھندر

ازبسکہ ہماری ہر تباہی اور خانہ بربادی ہمارے مخدوم مرزا عبدالودود بیگ کی ذاتی نگرانی میں ہوئی ہے ہم نے جا کر انھیں خوش خبری سنائی کہ ہم بینکنگ کے پیشے میں حادثاتی طور پر داخل ہو گئے ہیں۔ بولے "دست بخیر! بینک کو چوٹ تو نہیں آئی؟" مبارکباد کے بجائے انھوں نے اسے اس صدی کا سب سے بھونڈا مذاق قرار دیا۔ ہم نے کہا "تمھیں یقین نہیں آتا۔ ہم تو کل صبح سے بینک جانا شروع کر دیں گے"۔

فرمایا "جب تک کوئی شخص نشے میں دُھت نہ ہو، تمھیں بینک میں ملازم نہیں رکھ سکتا"۔

"جس شخص نے ہمیں ملازم رکھا وہ اسی عالم میں تھا"۔

"سچ؟"

"سچ۔ خدا خیر کرے! ہم نے اندھیرے میں چھلانگ لگائی ہے"۔

"چھلانگ تو ضرور لگائی ہے، مگر کپاس کے ڈھیر میں۔ بدن پر سریش مل کر۔ عیش کرو گے دوست! آدمی اپنی گرہ سے پیسہ اُدھار دے اور وہ ڈوب جائے تو احمق کہلاتا ہے۔ وصول ہو جائے تو سُودخور۔ لیکن دوسروں کا روپیہ بیاج پر چلائے اور مونچھیں داڑھی سے بڑھ جائیں، یعنی بیاج مول سے زیادہ ہو جائے تو بینکر باجے! سُود میں بڑی برکت ہے۔ سود اور سرطان کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مرزا تو جب تھا کہ

پیشہ بھی ڈھونڈ، سُود کا سودا بھی چھوڑ دے"

"بقول غالب، پیشہ میں عیب نہیں۔"

"حضور نے تو شرعی عیب ہی کو پیشہ بنا لیا۔ خیر بینک کے پاس تو تمھیں ملازم رکھنے کی ایک نہایت معقول وجہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ اس کا جنرل مینجر نشے میں تھا۔ لیکن تمھارے پاس کیا جواز ہے؟"

"بینک میں تنخواہ ۲۶ تاریخ کو ہی مل جاتی ہے۔"

"ہمیں اس سے بھی پہلے مل جاتی ہے۔ ۴ تاریخ کو!"

"سُنو۔ ہمارے پاس ایک چھوڑ تین معقول وجہیں ہیں۔ اوّل، اس پیشے میں دیانت، ذہانت اور نجابت کی بڑی قدر ہے۔ دوم، پاکستان بن رہا ہے۔ قوم کو نئے خون، ایثار و قربانی کی اشد ضرورت ہے۔ سوم، ہمیں کوئی اور ملازمت نہیں ملی۔"

"ملازمت! ملازمت! کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ آخر حیاتِ انسانی کا مقصدِ اعلیٰ کیا ہے؟"

"ہم تو زمین پر محض اس لیے اُتارے گئے ہیں کہ آپ کو ہماری اصلاح کا موقع ملے۔ نہیں تو آپ کی ساری زندگی بے مقصد ہو جاتی۔"

"پھر بھی۔ یہ سُوجھی کیا؟ ایک تو اذیتی تھی ہی دِوانی، اُوپر سے گھنگھرو اور باندھ لیے۔"

"پہلے تو اس نے ہمیں رُوئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیا۔ پھر یکبارگی اتنے پیار سے آفر دی کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھ ڈرتی نے کر لیے قول و قرار۔ تنخواہ تک پوچھنی بھول گئے۔ وہی حال ہوا جو جیمز جوائس کی سادہ و کمسن MOLLY کا ہوا تھا:

'He asked me with his eyes, Yes, and with his hands, Yes, and Yes, I said, Yes, I will, Yes !' "

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس ایجاب و قبول پر تیئس سال گزر گئے۔ اور ان تیئس برسوں میں دنیا نے کیا کچھ نہیں دیا۔ لیکن اپنا قرض جو اپنے آپ پر تھا، وہ آج تک نہ اُتر سکا۔ حساب کتاب سے دِلی نفرت تھی۔ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا۔ اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ آدمی ایک غلط پیشہ اپنائے اور اس میں کامیاب

ہوتا چلا جائے۔ اور پھر، تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا۔ روپیہ اور اس سے متعلق تمام تر کاروبار میں کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی ہر چیز سے ناتا توڑ کر اسی کا ہو رہے۔ پیسہ ہی اس کے لیے بس ہے۔ بھروسا رکھنے والے اسی پہ بھروسا رکھتے ہیں۔ عالمِ نزع میں بھی وہ "پانی ! پانی !" نہیں پکارتا۔ "پیسہ ! پیسہ !! پیسہ !!!" دولت، سیاست، عورت اور عبادت، کامل یکسوئی، مکمل خود گزاشتگی، سراپا سپردگی چاہتی ہیں۔ ذرا دھیان بھٹکا اور منزل کھوٹی ہوئی۔ رچی بسی، جامع الحیثیات و حسیات شخصیت کا اس کوچے میں گزر نہیں۔ جب تک آدمی اپنے دل و دماغ سے ہر آرزو کو رخصت اور ہر آدرش کو اَرپَن کر کے، خود کو ان کے لیے خالص نہ کر لے، یہ چھلاوے کہیں ہاتھ آتے ہیں۔ پھر جب مسافر اپنے قافلے سے بچھڑ کر ان کی جستجو میں بہت دُور اکیلا نکل جاتا ہے اور شام کا جھٹپٹا سا ہونے لگتا ہے تو یکبارگی اسے احساس ہوتا ہے کہ منزل تو وہیں تھی جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اتنے میں سُورج ڈوب جاتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے راجپوت سرداروں کے ایک جَیش کو ایک دور دراز مہم پر بھیجا تھا۔ جگ بیت گئے۔ چاندنی راتیں آئیں اور اپنی چاندی لٹا کے گزر گئیں۔ کتنے ہی ساون آئے اور نَین کٹوروں کو چھلکا کر چلے گئے۔ پر وہ نہ لوٹے۔ نہ نیند نیناں، نہ انگ چینا، نہ آپ آویں، نہ بھیجیں پتیاں۔ آخر برہ کی ماری ٹھکرائنوں نے بادشاہ کو ایک عرضداشت پیش کی جو صرف ایک دوہے پر مشتمل تھی:

سوَنا لاون پی گئے، سُونا کر گئے دیس
سوَنا ملا نہ پی ملے، رُوپا ہو گئے کیس★

چاہیں تو اسے انسانی روح کے سفر کی داستان سمجھ لیجیے۔

گڈ مارننگ کے جواب میں گڈ آفٹر نون

پہلے دِن ڈیوٹی پر رپورٹ کرنے ہم سوا نو بجے مسٹر اینڈرسن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہماری

★ پیا سونا لینے گئے اور ہمارا دیس سُونا کر گئے۔ ہمیں تو نہ سونا ملا، نہ پی ملے۔ اور بال روئی کے گالے ہو گئے۔

"گڈ مارننگ" کے جواب میں فرمایا "گڈ آفٹر نون! اس پیشے میں پابندیِ وقت کا نمبر ایمانداری سے بھی پہلے آتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، یہاں لوگ دفتر اتنے لیٹ کیوں آتے ہیں۔ میری اور تمھاری پیدائش میں اتنا لمبا وقفہ ہے کہ اس میں ایک نسل پیدا بھی ہوئی، بدراہ بھی ہوئی اور ہار جھک مار کر راہِ راست پر بھی آگئی۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب لندن میں کار کو HORSE-LESS CARRIAGE (بغیر گھوڑے کی گاڑی) کہتے تھے۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب ٹرام کو گھوڑے کھینچتے تھے۔ اس لیے اس کی رفتار موجودہ ٹرام سے کہیں زیادہ تیز ہوتی تھی۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، یہاں لوگ آفس اتنے لیٹ کیوں آتے ہیں۔ آج سے پینتالیس سال پہلے جب میں نے اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے بینک میں ملازمت کی تو صبح برف گرتی ہوتی تھی۔ سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں ہوتی تھی۔ لیکن میں صفر سے بھی دس ڈگری نیچے ٹمپریچر میں ٹھیک آٹھ بجے بینک پہنچ جاتا تھا۔ تم لوگ ۱۱۳ ڈگری★ ٹمپریچر میں بھی وقت پر نہیں آسکتے!

اسٹول کی ایجاد کا اصل مقصد

اس پند سودمند کے بعد اس نے چپراسی کو حکم دیا کہ اس "کوونٹڈ افسر" کو اس کے آفس تک پہنچا آؤ۔

چپراسی جس مقام تک ہمیں لے گیا وہ زمین سے ساڑھے چار فٹ کی بلندی پر ایک چوبی سطح مرتفع تھی۔ یہ تختہ جس کی قسمت میں ہماری دارِ منصبی ہونا لکھا تھا، ۱۲ × ۱۲ انچ سے زیادہ نہ ہوگا۔ بینکوں میں ایسے گوانیز کلرک موجود تھے جو بیس بیس برس سے ایک ہی اسٹول پر بیٹھے ٹٹ پونجیوں کو کروڑپتی بنتے دیکھ چکے تھے۔ انگلش بینکنگ کی یہ دیرینہ روایت تھی کہ کلرک جس اسٹول پر پہلے دن آن کر بیٹھتا ہے، اسی سے ریٹائر ہو کر اترتا ہے۔ اس خیال سے وحشت ہونے لگی کہ ایک انسان کی پوری زندگی، دیوار کی طرف منھ کر کے، ایک مربع فٹ تختے پر بیت سکتی ہے۔ اس پر سے کودنا، اس پر چڑھنے سے زیادہ دشوار تھا۔ اور گرم تھری پیس سوٹ، بغیر فریم کی عینک اور سنہری پاکٹ واچ کے ساتھ یہ کرتب انگلش بینکنگ کے بجائے کسی انگلش کامیڈی کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ اسٹول کے

★ ۱۱۳ ڈگری = ۴۵ سینٹی گریڈ

بیچ میں گردے کی شکل کا ایک کثیر المقاصد سوراخ تھا۔ گدّی کا تکلّف بھی نہ تھا، جس میں غالباً یہ مصلحت تھی کہ اس سے اصلی بر ماساگوان کے ابر اور جوہر چھُپ جانے کا احتمال تھا۔ اپنے "آفس" کو دیکھ کر ہماری نومولود اُمیدوں پر روایتی اوس کی بجائے اولے پڑ گئے۔ ہم پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے کہ جس بینک میں "کووننٹڈ افسر" اسٹول پر قبضہ جمالیں وہاں غریب کلرک کیا کرتے ہوں گے۔ لیکن ہمیں کوئی گھڑونچی نظر نہ آئی۔ کچھ دن بعد ہم نے جمعدار اجمل خاں کو ڈانٹا کہ ہمارا اسٹول گرد سے اٹا رہتا ہے۔ ہم انگلی سے اس پر سودے سلف کا حساب کر لیتے ہیں۔ صبح کوئی اسے صاف نہیں کرتا۔ بولا "بادشاہو! ایس بینک دے سٹول نویں افسراں دے پنیدے نال صاف کیتے جاندے نے"★ ایک دن ہم نے لیکچرر شفیع قریشی سے کہا کہ گرو جی! گیارہ گھنٹے روز اسٹول پر بیٹھنے سے آپ کے چیلے کے کولھے سلیٹ کی طرح سپاٹ اور چورس ہو گئے ہیں تو اس نے مطلع کیا کہ اسٹول تو کہنی ٹکانے کے لیے ہوتا ہے۔ اسٹول کی ایجاد کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کے تلفظ و املا پر پنجابی اور غیر پنجابی ایک دوسرے پر ہنس سکیں۔

اب اور تب

اس زمانے میں بینکوں میں یہ طمطراق نہ تھا جو آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض بینکوں میں تو ویسا ہی فرنیچر ہوتا تھا جیسا چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں اور قصباتی پوسٹ آفسوں میں، جہاں کرسی کی بید کی بُنائی اُدھڑنے کے بعد اس میں فارغ التحصیل صاحبزادے کی تختی جڑ دی جاتی ہے۔ اور ریٹائر ہونے سے پہلے ہر بابو چاقو سے اپنا نام میز پر کندہ کر جاتا ہے۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔ میز کرسیوں کی ٹانگوں کو ابھی پولیو نہیں ہوا تھا۔ اور بینکوں میں کیکڑے جیسی ٹانگوں والے مُڑے تُڑے فرنیچر نے "پیریڈ فرنیچر" کا روپ دھار کر رواج نہیں پایا تھا۔ باتھ رُوم کی دیواروں پر بھی پنسل سے جو GRAFFITOS (باتصویر عبارتیں) تحریر ہوتی تھیں، ان کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ نسل کشی کے گھوڑے اگر اپنی خواہشات قلمبند کرنے پر قادر ہوتے تو یہی کچھ رقم کرتے۔ (پروفیسر قاضی عبدالقدّوس کو ایسی عبارتوں کے فحش مضمون پر اتنا غصّہ نہیں آتا جتنا کہ

★ بادشاہو! اس بینک میں اسٹول نئے افسروں کے پیندے سے صاف کیے جاتے ہیں۔

اِملا کی فاش غلطیوں پر) صورت حال اب بحمد اللہ روبہ اِصلاح ہے۔ غسل خانوں میں اب فحش اور ناشائستہ فقرے بالکل نظر نہیں آتے۔ باتھ روم ٹائلز اتنی چکنی اور "گلیزڈ" ہوتی ہیں کہ ان پر پنسل سے کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔

اور کمرشل بینکوں کا کیا ذکر، خود اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا صدر دفتر جس میں اعلیٰ حکام بیٹھتے تھے ایک ایسی عمارت میں واقع تھا جس نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ مطلب یہ کہ یہاں پہلے ایک عجائب گھر تھا جس میں ہڑپہ، موئن جو دڑو، اور گندھارا کے گڑے ہوئے مُردے اکھاڑ کر سجائے گئے تھے جو کسی کو آزار نہیں پہنچاتے تھے۔ اس عمارت میں کبوتروں کی اتنی کثرت تھی کہ چپراسی گلے میں چپراس کی بجائے غلیل ڈالے پھرتے تھے۔ چہار سُو غٹرغوں اور "بسم اللہ، اللہ اکبر" کا غلغلہ! سادگی و پُرکاری کا یہ عالم کہ بینک دولت پاکستان کے خزانوں پر کنڈلی مار کے بیٹھنے والے ایک اعلیٰ افسر ۲۵ انچ چوڑے پائینچے کی پتلون پہن کر (جس کا ایک پائینچہ ہی ان کی اور ہماری ضروریات کے لیے کافی تھا) سائیکل پر اسٹیٹ بینک آتے تھے۔ اور ہم انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ہمارے پاس تو وہ بھی نہ تھی۔ وہ سائیکل کو تالا لگا کر نظروں کے سامنے اپنے کمرے ہی میں پارک کرتے تھے۔ تالے کا تکلّف اس لیے کہ سائیکل عربی گھوڑے کی طرح وفادار تو ہوتی نہیں کہ اپنے سوار کے علاوہ کسی کو پُٹھّے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دے اور زخمی مالک کو مُنھ میں دابے میدانِ جنگ سے بگٹٹ جراح کے پاس لے جائے اور تلوار اور اپنے ہی دانتوں کے لگے ہوئے زخموں پر مومیائی رکھوائے۔ چپراسی کا بیان تھا کہ موصوف ہر ملاقاتی کے جانے کے بعد دو اُنگلیاں رکھ کر ٹائروں کی نبض دیکھ لیتے ہیں۔ پھر دیکھتے دیکھتے نقشہ بدل گیا اور دم بھر میں یہ ماجرا ہو گیا کہ عمارتوں کا جنگل کا جنگل کھڑا ہو گیا۔ زردی مائل بھُربھُرے پتھر کی جگہ سیمنٹ نے لے لی۔ کھُلے "فرنٹ" اور ننگ دھڑنگ دیواریں کم کم نظر آنے لگیں، اس لیے کہ بینک ذرا سیانے ہوئے تو ستر پوشی کے لیے سنگ مرمر استعمال کرنے لگے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مغلوں نے سرخ اور سنگِ مرمر کا استعمال حتی الامکان مقبروں کے لیے مختص و محدود رکھا۔ ذوقِ سلیم مانع تھا، ورنہ کس چیز کی کمی تھی۔ وہ چاہتے تو تالاب کے پشتے، منجنیق سے پھینکنے

کے پتھر اور توپ کے گولے تک سنگِ مرمر کے بنوا سکتے تھے۔ اور قلعے کی فصیلیں بھی، جن پر سے معتوب کو زندہ نیچے پھنکوایا جاتا تھا۔ چونکہ اسٹیٹ بینک کو دوسروں کے مقبرے بنوانے کی قانونی اجازت نہیں ہے، اس لیے اس نے اپنی آرام گاہ کی نہ صرف دیواریں بلکہ فرش بھی رنگین سنگِ مرمر★ کا بنوا ڈالا جو اتنا چکنا اور پھسلنا تھا کہ پہلے ہی ہفتے میں پندرہ آدمیوں کی سولہ ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ چنانچہ بہ نظرِ احتیاط یہ حکم صادر ہوا کہ چپراسی چمڑے کے جوتے نہ پہنیں، کریپ سول کے پہن کر آئیں تاکہ ہڈی پسلی تڑوا کر اپاہج نہ ہو جائیں۔ افسروں کو تاکید تھی کہ صرف چمڑے کے جوتے پہنیں۔ اس زمانہ میں خوش خلقی کا یہ عالم تھا کہ کرایہ دار، مالک مکان کو گالی دیئے بغیر پانچ پانچ منزلہ زینہ چڑھ جاتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسٹیٹ بینک نے صرف پہلی منزل تک جانے کے لیے زینۂ رواں (ESCALATOR) کا بصرفِ زرِ (مبادلہ) کثیر چونچلا کیا تو ڈیڑھ دو مہینے تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب اس کی آخری سیڑھی میں پھنس کر ڈیڑھ دو سو لاوارث جوتے جمع نہ ہو گئے ہوں۔ ان جوتوں کا سابقہ تعلق ان خواتین سے تھا جو شوہروں کی اجازت کے بغیر چوری چھپے "ایسکے لیٹر" دیکھنے آئیں اور بمشکل تمام پیر سلامت لے کر گھر لوٹیں۔ صبح کی بھولی اگر شام تک ننگے پیر بھی لوٹ آئے تو اُسے بھولی نہیں کہنا چاہیے۔ ان جوتوں میں کبھی کوئی مردانہ جوتا نہیں پایا گیا، جس کے دو سبب تھے۔ اوّل تو مرد جوتے چھوڑ کر بھاگنا بزدلی سمجھتے ہیں۔ دوم، وہ اپنے جوتوں کے فیتے کس کر باندھتے ہیں۔

دارالخلافہ اسلام آباد ابھی پاکستان کے نقشہ پر نہیں اُبھرا تھا اور کراچی ہی دارالخون خرابا تھا۔ کراچی کا نقشہ ہی نہیں، تلفظ اور املا تک گنوارو سا تھا۔ زکام نہ ہو، تب بھی لوگ کراچی کو کرانچی ہی کہتے تھے۔ چیف کورٹ کے سامنے گاندھی جی کا ایک نہایت بھونڈا مجسمہ نصب تھا جس کی کوئی چیز گاندھی جی سے مشابہت نہیں رکھتی تھی، سوائے لنگوٹی کی سلوٹوں کے۔ گوانیز جوڑے وکٹوریہ گاڑی میں بندر روڈ پر ہوا خوری کے لیے نکلتے اور نورانی شکل کے پیرانِ پارسی شام کو الفنسٹن اسٹریٹ کی دکانوں کے تھڑوں پر ٹھیکی لیتے۔ الفنسٹن اسٹریٹ پر کراچی والوں کو ابھی پیار نہیں آیا تھا اور وہ

★ سنگِ مرمر سفید ہوتا ہے۔ افسوس کہ رنگ برنگے ONYX کا اردو مترادف مجھے معلوم نہیں۔ عتیق زنگار رنگ، جزع اور سنگِ باباغوری اُردو میں کشتہ جات کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

"ایلیٹ" نہیں کہلاتی تھی۔ سارے شہر میں ایک بھی نیون سائن نہ تھا۔ اس زمانے میں خراب مال بیچنے کے لیے اتنی اشتہار بازی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ نیپیر روڈ پر طوائفوں کے کوٹھے، ڈان اخبار کا دفتر اور اُونٹ گاڑیوں کا اڈا تھا۔ یہاں دن میں اونٹ گاڑیوں کا اوّل الذکر حصّہ کلیلیں کرتا اور رات کو تماشبین۔ اہلِ کمال اس زمانے میں بھی آشفتہ حال پھرتے تھے۔ کچھ ہماری طرح تھے کہ محض آشفتہ حال تھے۔ شریف گھرانوں میں جہیز میں سنگر مشین، ٹین کا ٹرنک اور بہشتی زیور دیا جاتا تھا۔ اُردو غزل سے معشوق کو ہنوز شہر بدر نہیں کیا گیا تھا اور گیتوں اور کجریوں میں وہی نَندیا، نِنْدیا اور نَندیا کا رونا تھا۔ سیٹھانیوں اور اُونچے گھرانوں کی بیگمات نے ابھی ساریاں خریدنے اور ہندوستانی فلمیں دیکھنے کے لیے بمبئی جانا نہیں چھوڑا تھا۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے پٹ سن کے بڑے تاجر "ویک اینڈ" پر اپنی آرمینین داشتاؤں کی خیر خیریت لینے اور اپنی طبیعت اور امارت کا بار ہلکا کرنے کے لیے کلکتے کے ہوائی پھیرے لگاتے تھے۔ کیا زمانہ تھا۔ کلکتے جانے کے لیے پاسپورٹ ہی نہیں، بہانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ آم، کیلا اور شاعر ہندوستان سے اور لٹھا جاپان سے آتا تھا۔ بینکوں میں ابھی ایئر کنڈیشنر، میز پر فنانشل ٹائمز، ایرانی قالین، سیاہ مرسڈیز کار، قلم چھوڑ ہڑتال، رشوت، آسٹن رِیڈ کے سُوٹ، مگرمچھ کی کھال کے بریف کیس اور اتنی ہی موٹی ذاتی کھال رکھنے کا رواج نہیں ہُوا تھا۔ فقیر ابھی ہاتھ پھیلا پھیلا کر ایک پیسہ مانگتے اور مِل جائے تو سخی داتا کو کثرتِ اولاد کی بددُعا دیتے تھے۔ اور یہ فقیرِ پُرتقصیر؟ اپنی اوقات کو نہیں بھولا تھا۔ کنڈوں کی آنچ پر چکنی ہانڈی میں ڈوئی سے گھُٹی ہُوئی اُرد کی بے دُھلی دال چٹخارے لے لے کر کھاتا اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا تھا۔

ہم اُلٹے، بات اُلٹی یار اُلٹا

جن صاحب کے ذِمّے ہمیں بینکنگ کے اسرار و رموز سے واقفیت پیدا کروانی تھی، اُن کی خِسّت کا عجیب عالم تھا۔ عقل کے استعمال میں بھی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ دن بھر آئی ہوئی ڈاک کے لفافوں کو جمع کرتے رہتے اور اُنھیں اُلٹ کر "رف پیڈ" کے طور پر استعمال کرتے۔ اپنی دُور افتادہ بیگم کو بھی اسی کاغذ پر اپنی عدم خیریت سے مطلع فرماتے۔ ان کے ایک نامۂ محبت کا فقرہ آج تک

لوحِ دِل پر نقش ہے۔ لکھا تھا "بیگم! اس دُنیا میں صرف تمہی میری مونث و غمخوار ہو۔" پنسل جب گھِستے گھِستے اتنی سی رہ جاتی کہ بغیر چمٹی کے گرفت میں نہ آسکے تو وہ ٹوٹے پر اسی کاغذ کی نلکی چڑھا کر اتنا لمبا کر لیتے تھے کہ لکھتے میں دُوسرا سِرا اُن کی عینک کے شیشے پر "وائپر" کی طرح پچارا پھیرتا رہتا تھا۔ اس نلکی میں ایک خلال اور پانچ چھ لونگیں ڈال لیتے تھے۔ درد بہت ستاتا تو ایک لونگ نکال کر ڈاڑھ کے نیچے رکھ لیتے۔ جتنی دیر لونگ ڈاڑھ تلے دبی رہتی، اسٹاف لذّتِ دشنام سے محروم رہتا۔

ایک دن ہماری تربیت پر توجہ فرمائی تو ہمیں بھی نلکی بنانی سکھائی اور رسان سے سمجھایا کہ باتھ روم جائیں تو پنکھے کا سُوئچ آف کر کے جایا کریں۔ اور خدارا! اپنے غصّے اور مثانے کو کنٹرول کرنا سیکھیں۔ ٹِک مارک لگانا بھی اسی دن سکھایا۔ کہنے لگے "بینک میں ٹِک مارک اس طرح (✓) نہیں، بلکہ اس طرح اُلٹا (>) لگایا جاتا ہے۔ تم ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی ہو۔ اتنا بھی معلوم نہیں! ہم اس غلطی سے اتنے نادم اور خائف ہوئے کہ اپنی ہر بات کو غلط اور اُلٹی سمجھنے لگے۔ تین چار دن بعد پھر ہمارا چالان ہوا۔ کہنے لگے "مَیں تو عاجز آگیا۔ آپ کی ہر بات اُلٹی ہے۔ تقسیم کا نشان اس طرح ۰۱۰ بنا ہوا مَیں نے تو خدا کی قسم اپنے پورے بینکنگ کیریر میں نہیں دیکھا۔" ہم نے معذرت کی کہ ہم نے ازروئے احتیاط و خوف اسے کھڑا کر دیا ہے۔ خیریت گزری کہ انھوں نے ضرب کے نشان × میں کوئی تبدیلی نوٹس نہ کی، ورنہ ہم نے تو اپنی طرف سے دائیں ڈنڈے کو بائیں طرف اور بائیں کو دائیں طرف کر دیا تھا۔

یعسوب الحسن غوری، کہ ان کا یہی نام تھا، کسی کلرک سے خفا ہوتے تو بزبانِ انگریزی اس کے درجات بلند کرتے۔ اس سے سیری نہ ہوتی تو آخر میں اصلی دیسی گالی کا کڑکڑاتا بگھار دیتے۔ مُنھ زور ماتحتوں کو ان چپراسیوں اور کلرکوں کی فہرست دکھاتے جو گزشتہ تیس سال میں ان کی چھنگلیا کے اشارے سے برخاست ہوئے تھے۔ بابر نے بھی دو تین دفعہ اپنے دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کے مینار بنوائے تھے تاکہ پسماندگان عبرت پکڑیں۔ ہاں کبھی ہمیں ترقی پر اکسانا مقصود ہوتا تو دراز میں سے ایک گراف نکال کر دکھلاتے۔ اس میں لکیروں کے ذریعہ یہ دکھایا گیا تھا کہ انھوں نے پچھلے تیس برسوں میں سال بسال کتنی ترقی کی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ۴۷ سال تک، یعنی پاکستان بننے سے پہلے، ان کے کیریر کے گراف کی جو لکیریں زمین پر لوٹیں لگا رہی تھیں وہ ۱۹۴۷ میں کپڑے جھاڑ کر ایکدم کھڑی ہو گئیں اور

اب ان کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ ان کی ترغیب و تشویق پر ہم نے بھی اپنے کیریر کا چار سالہ گراف بنایا۔ اگر اسے اُلٹا کر کے دیکھا جاتا تو ہم نے بھی بڑی تیزی سے ترقی کی تھی۔

کچھ تو فطرتاً وہمی، اور کچھ شک و شبہ کو پیشہ ورانہ ڈسپلن کے طور پر اپنا لیا تھا۔ موقع بے موقع یہی نصیحت کرتے کہ ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنا سیکھو۔ جو کس بینکر نوٹ کھڑکنے کی آواز سے بھی چونک پڑتا ہے۔ آٹھ کروڑ کی آبادی میں کچھ نہیں، کچھ نہیں تو سولہ کروڑ تالے ضرور ہوں گے۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ ہم ایک دوسرے پر کتنے فی صد بھروسا کرتے ہیں۔ اکثر فرماتے کہ جب ہر دستخط اور چہرہ جعلی اور ہر ہندسہ میں ہتھکڑی نظر آنے لگے تو سمجھ لو کہ اب تم اکاؤنٹنٹ بننے کے لائق ہو گئے ہو۔ ٹائپ کیے ہوئے خط کی تین چار کاپیاں ہوں تو ہر کاپی کا ایک ایک حرف از سر نو چیک کرتے۔ رجسٹروں کے اندراجات کا محدب شیشے سے بار بار معائنہ کرتے کہ کسی نے ربر سے مٹا کر کچھ اور تو نہیں لکھ دیا۔ کسی کے قبضے سے چرس یا بغیر لائسنس کی بندوق یا بیوی برآمد ہو جاتی تو غالباً اتنا تہلکہ نہ مچتا جتنا ہماری دراز سے ربر برآمد ہونے پر۔ حد یہ کہ اپنی قسمت کی لکیر میں بھی انھیں کاتبِ تقدیر کی کچھ جعلسازی نظر آتی تھی۔ قاعدے قانون کے پابند تھے۔ باتھ روم میں بھی سڑک کے بائیں طرف چلتے تھے۔ اُن کے دشمنوں کا کہنا تھا کہ کبھی ٹرین سے لاہور جانا ہو تو اپنی برتھ پر رات اکڑوں بیٹھے اسٹیشنوں کو ٹائم ٹیبل سے، اور ہر دو سے اپنی گھڑی کو ملاتے رہتے ہیں۔ اس خوف سے آنکھ نہیں جھپکتے کہ خوابِ غفلت میں کہیں ان کا ڈبہ نہ کٹ جائے اور انجن انھیں جنگل بیابان میں چھوڑ کر خالی ہاتھ پسٹن ہلاتا لاہور پہنچ جائے۔ ایک دن ہمارے سامنے جمعدار اجمل خاں کو اپنی بیگم کے نام خط دیا کہ اندر کی جیب میں رکھ کر لے جاؤ اور جنرل پوسٹ آفس کے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔ وہ پوسٹ کر کے آیا تو اس پر یہ جرح ہوئی:

"خط ڈال آئے؟"

"جی ہاں! ڈال آیا۔"

"لیٹر بکس کے تالے کو زور سے کھینچ کر دیکھ لیا تھا کہ ٹھیک سے بند ہے یا نہیں۔"

"میں زور زور سے کھینچ رہا تھا کہ ایک ڈاکیے نے پکڑ لیا۔"

"ابے فارن میل کے ڈبے میں تو نہیں ڈال آیا؟ لیٹر بکس کے اندر چاروں انگلیاں ڈال

کر پوسٹ کیا تھا؟"

"یس سر! میں نے تو انگوٹھا بھی ڈال دیا تھا۔"

"لیٹر بکس سے کان لگا کے لفافہ گرنے کی آواز سُنی تھی؟ یا اس دفعہ بھی دور سے ہی مستی کر کے آ گیا؟"

وہ ایک چھوٹے سے برساتی گاؤں میں پلے بڑھے تھے، جہاں قدم قدم پہ سانپ بچھو اور مشترکہ بزرگ کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ چنانچہ اب بھی یہ حال تھا کہ صبح جوتے میں اس ڈر سے پاؤں نہیں ڈالتے تھے کہ سانپ دبکا نہ بیٹھا ہو اور پیر ڈالتے ہی ڈس لے۔ لہٰذا پہلے ہاتھ ڈال کر اطمینان کر لیتے تھے۔ دفتر میں بنی ہوئی چائے کبھی نہیں پیتے تھے مبادا کوئی کچھ ملا دے۔ ملباری ہوٹل سے ایک آنے کی کڑک سلیمانی چائے منگا کر دن میں تین چار دفعہ طلب مٹا لیتے تھے۔ اسے چائے کہنے کے لیے رواداری کے علاوہ ضعفِ بصارت و شامہ بھی درکار تھا۔ اس میں پودینہ، بڑی الائچی، اجوائن، سفید زیرہ، لاہوری نمک، زعفران، تمباکو کے پتوں پر پلی ہوئی مکھیوں کا شہد، لیموں، دار چینی اور کیوڑہ تو ہم بھی پہچان لیتے تھے۔ سُننے میں آیا تھا کہ عبداللہ ملباری اس میں دُودھ کے بجائے "پہلن" (پنجابی میں پہلی بار بیائی ہوئی گائے یا بھینس کو کہتے ہیں) کی کھیس ڈال کر افیم اور سلاجیت کی سلائی پھیر دیتا ہے۔ جس نے ایک دفعہ اس کے ہاتھ کی چائے پی لی، ہمیشہ کے لیے اسی کا ہو رہتا۔ یعسوب صاحب تو چائے کا جوگا تک حلق میں انڈیل لیتے تھے۔ کسی حکیم کو بھنک نہیں پڑی ورنہ اس نسخے سے تو یونانی امراض کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ بہت سی روٹھی ہوئی، اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی ہوئی جوانیوں کو منایا جا سکتا تھا۔

ہم نے ایک دِن شکایت کی کہ ہمیں ایک ہی سُولی پر لٹکے چار مہینے ہو گئے۔ دوسرے شعبوں کا بھی ذائقہ چکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ دوسرے دن انھوں نے ہمیں رانگی واڑہ میں شیخ شمس الدین اینڈ سنز کے چمڑے کے گوداموں اور کچّی کھالیں کمانے کے حوضوں کا معائنہ کرنے بھیج دیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ دوزخ میں، منجملہ دیگر ضیافتوں کے، بدبُو کا تکلّف بھی ہو گا یا نہیں۔ لیکن اگر ہوا تو دیکھ لیجیے گا یہی ہو گی۔ تین دن تک ہر چیز میں سے وہی سڑاند آتی رہی۔ دماغ میں

بس کے رہ گئی۔ تھوڑی بہت اس وقت نکلی جب چوتھے دن ہم مرچوں کے گودام کا معائنہ کر کے دو دن تک چھینکتے پھرے۔ یہ بُو، بقول شاعر، وصل کی حسرت کی طرح نکلنے کو تو نکلی، مگر جیسی نکلنی چاہیئے ویسی نہیں نکلی۔

پرانے خیال کی حیادار بی بیباں ہر مرد کا نام لے سکتی ہیں، سوائے اپنے میاں کے۔ اپنے مرد کا نام لینا بے حیائی میں شمار ہوتا ہے۔ یعسوب الحسن غوری بھی کبھی کسی محرم انگریز کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کا ذکر آتے ہی "بڑا صاب" "باس" اور "چیف" کا گھونگھٹ نکال لیتے تھے۔ اینڈرسن کے کمرے سے اُلٹے قدموں نکلتے، کبھی پیٹھ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آخری قدم تک مُنھ در مُنھ ڈانٹ کھاتے نکلتے۔ اینڈرسن کبھی اچانک آنکلے تو جلتے ہوئے سگرٹ کو مٹھی میں دَم پُخت کر دیتے۔ ناک اور مُٹھی سے دیر تک دُھواں "لیک" (LEAK) ہوتا رہتا۔ وہ گالی بھی دیتا تو بالکل اس طرح سُنتے جیسے ہز ماسٹرز وائس کے ریکارڈ کی تصویر میں دکھایا جاتا ہے۔ سخت جاڑے میں اس کی بات کا جواب محض گردن کے اشارے سے دیتے۔ انگریز کے سامنے مُنھ سے بھاپ نکالنے کو گستاخی جانتے تھے۔ غرض کہ انگریز کی تعظیم و تکریم میں غلو برتتے اور انھیں فطری تقاضوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ انگلستان کی ملکہ معظمہ کے ہاں بچّہ ہو گیا تو ہفتوں شرمائے شرمائے پھرے۔

آئندہ اس واقعہ کو نہ دُہرایا جائے

اگر کسی سے غلطی ہو جائے یا لندن کیبل بھیجنے میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر کے باعث بینک پر ایک دِن کا سُود چڑھ جائے تو خطاوار کو وہ رقم گرہ سے بھرنی پڑتی تھی۔ برٹش بینکوں میں یہ تاوان عام تھا۔ رخصت کا نام لیتے ہی "بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں" والا نقشہ ہو جاتا تھا۔ ہمیں یاد ہے۔ جُون کا مہینہ، فری امپورٹ کا زمانہ تھا۔ کام بے اندازہ، آدمی کم۔ ہم چار آدمیوں کے برابر کام اور آٹھ آدمیوں کے برابر غلطیاں بڑی تندہی سے کر رہے تھے۔ ایک منحوس صبح خبر آئی کہ ٹنڈو آدم میں اخبار پڑھتے پڑھتے ابّا جان پر دل کا دورہ پڑا اور زمین نے اپنی امانت واپس لے لی۔ حیدر آباد میں ان کی تدفین کے سلسلہ میں تین دن کی رخصت اتفاقیہ لینے

کی پاداش میں یعسوب الحسن غوری نے ہماری تنخواہ کاٹ لی، جو کچھ عرصہ بعد اینڈرسن نے اس "وارننگ" کے ساتھ واپس دلوا دی کہ "آئندہ اس واقعہ کو نہیں دُہرایا جائے گا"۔ سلطان علاء الدین خلجی کا بھی کچھ ایسا ہی دستور تھا۔ اگر کوئی سوار لڑائی کے وقت غیر حاضر ہو جائے تو سلطان اس سے گزشتہ تین برس کی ساری تنخواہ دھروا لیتا تھا۔ اور احمد شاہ دُرّانی نے تو ذرا سی حکم عدولی پر دو سو سپاہیوں کی مُشکیں بندھوا دیں۔ ناک میں تیروں سے چھید کر کے نکیلیں ڈالیں اور اونٹوں کی طرح ہانک کر شجاع الدولہ کے پاس بھیج دیا کہ چاہے قتل کرو، چاہے ازراہِ ترحّم معاف کر کے اسی حالت میں دشمن سے لڑواؤ۔

ہاتھ کی لکیریں بولتی ہیں

ہم ریوڑ میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ ہر ایک سینگ مارتا تھا۔ کی جس سے بات اس نے ہدایت ضرور کی۔ یوں تو سارے جہاں کی کھڑکیاں ہمارے ہی آنگن میں کُھلتی تھیں، لیکن یعسوب الحسن غوری کا انگوٹھا ہمارے ٹینٹوے پر ہی رہتا تھا۔ روز روز کے طعن و تشنیع سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ بلکہ چھلنی میں چھید بھی ہو گئے تھے جن میں سے اب تو موٹے موٹے طعنے پھسل کر نکلنے لگے تھے۔ منجملہ دیگر الزامات کے ہم پر ایک الزام یہ تھا کہ ہمارے دستخط گستاخانہ حد تک لمبے ہیں۔ اتنی قلیل تنخواہ اتنے بڑے دستخط کی کفالت نہیں کر سکتی۔ یعسوب الحسن غوری کو اینڈرسن دن میں کئی بار طلب کرتا۔ کبھی کچھ پوچھتا، کبھی کچھ۔ اندر جانے سے پہلے وہ اپنی ہتھیلی پر "کاپنگ" پنسل سے وہ تمام متعلقہ و غیر متعلقہ اعداد و شمار نوٹ کر لیتے جن کے بارے میں اینڈرسن سوال کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ سوال کرتا یعسوب الحسن غوری مُنھ پھیر کر ید بیداغ کے متعلقہ حصّہ کو زبان سے چاٹ کر حروف کو روشن کرتے اور کھٹاک سے صحیح اعداد و شمار آنے پائی سمیت بتا دیتے۔ ایک دن ہم نے عرض کیا آپ کاغذ پر لکھ کر کیوں نہیں لے جاتے؟ ارشاد ہوا، آپ کو بینک میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ آپ انگریزوں کے مزاج سے واقف نہیں۔ کاغذ پر نوٹ کر کے لے جاؤں تو وہ یہ سمجھے گا کہ میرا حافظہ جواب دے چکا ہے۔ مَیں خدانخواستہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ابھی تک تو وہ ولایتی اُلّو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے تمام اعداد و شمار مُنھ زبانی

یاد ہیں۔

اس کے کچھ دن بعد اینڈرسن نے ہمیں طلب کیا اور پوچھا کہ نرائن گنج برانچ کے بٹّے کھاتے قرضوں کی مجموعی رقم اور تعداد کیا بنتی ہے؟ صحیح صحیح بتاؤ۔

صحیح صحیح تو درکنار، ہم تو غلط جواب دینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہمیں شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو کہنے لگا "ہری اپ! جلدی سے ہتھیلی چاٹ کر بتاؤ"۔

اس دن ہم نے دیکھا کہ اینڈرسن کی میز پر پیتل کے نقشین پیپر ویٹ کی جگہ پلاسٹک کے چھ گھٹیا پیپر ویٹ رکھے ہیں۔ ہم نے جمعدار اجمل خاں سے کہا کہ پیتل کے پیپر ویٹ اچھے لگتے تھے۔ کیوں بدل دیئے؟ کہنے لگا غوری صاب بولتے ہیں کہ پلاسٹک کی چوٹ سیپٹک نہیں ہوتی۔

کیا بیئر حرام ہے؟

ایک دفعہ جمعہ کی اذان کے وقت ہمیں بینک میں گپ شپ کرتے دیکھا تو اشارے سے تخلیہ میں، یعنی باتھ روم کے دروازے تک، لے گئے اور نصیحت کی کہ نماز پڑھا کرو۔ اس سے دھیان غبن کی طرف نہیں جاتا، بشرطیکہ پنج وقتہ پڑھی جائے۔

اتوار کی صبح کو حضرت غلام احمد پرویز کا درس سننے جاتے۔ دو تین دفعہ ہمیں بھی لے گئے۔ پر طبیعت ادھر نہیں آئی۔ فلسفہ اور اشعار کی بھرمار سے وعظ و درس پر ہمیں اپنی نثر کا گمان ہونے لگا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی "رولر اسکیٹ" پہن کر سجدہ کرنے کی کوشش کرے۔ رہے ابوالکلام آزاد، سو وہ اپنی انا کے قتیل تھے۔ اسلام میں اگر انسان کو سجدہ روا ہوتا تو وہ اپنے آپ کو سجدہ کرتے۔ یعسوب الحسن غوری کہتے تھے کہ عالمِ دین کی صحبت سے روح کا سارا زنگ اُتر جاتا ہے۔ البتہ دل پر جو پھپھوندی لگ گئی تھی، اسے اتوار کی سہ پہر کو بیئر سے رگڑ رگڑ کر دھوتے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ تمھارے گُردے میں جو سنگریزے ہیں وہ اس ہفتہ واری عمل سے فلش ہو جائیں گے۔ اکثر فرماتے کہ یوں بھی بیئر کو کٹھ مُلّاؤں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے۔ ایران میں تو اسے آبِ جَو کہتے ہیں۔

خدا جانے کہاں تک صحیح ہے، دشمنوں نے اُڑائی تھی کہ ایوب خاں کے عشرۂ انحطاط میں سرکاری مفتیِ اعظم ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہ میگل یونیورسٹی سے علمِ دین کی سند لائے تھے، یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ ازبسکہ بیئر میں فقط پانچ فی صد الکحل اور ۹۵ فی صد پانی ہوتا ہے، اس کا پینا از روئے شرع حلال ہے۔ اسی نوع کے دو تین فتاویٰ پُر فتور کی پاداش میں انھیں جلاوطن ہو کر دس گنی تنخواہ پر امریکہ جانا پڑا۔ اگر ڈاکٹر صاحب قبلہ ذرا بھی سمجھ اور سائنس سے کام لیتے تو فتویٰ میں عاقلوں کو بس اتنا اشارہ کافی تھا کہ بیئر ۹۵ فی صد حلال ہے!

نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

غبن، خیانت مجرمانہ اور جعلی نوٹ اور دستخط بنانے کی جتنی بھی بامشقت یا بے مشقت سزائیں تعزیراتِ پاکستان میں ہیں، ان کی متعلقہ دفعات ہمیں سامنے بٹھا کے حفظ کروا دی تھیں۔ چار پانچ سبق کے بعد ہم اس قدر رواں ہو گئے کہ اپنا ہر فعل کسی نہ کسی دفعہ کے تحت نظر آنے لگا۔ ہر لحظہ قانون کے لمبے ہاتھ کا بوجھ اپنے کندھے پر محسوس کرتے کرتے ہماری چال میں فرق آ گیا تھا۔ پھر ایک دن معاً خیال آیا کہ ہمارے اور غبن کے درمیان تو کئی مضبوط تجوریاں اور ہم سے بھی زیادہ بدنیت افسر حائل ہیں۔ پھر ڈر کاہے کا۔ اب سر اٹھا کر چلنے لگے۔ ابتدائی مغلیہ عہد کے شاعر نوریؔ نے بھی اسی قسم کی بے خوفی کا اظہار کیا ہے حالانکہ اس نے تو خود کو ایماندار ثابت کرنے کے لیے کسی بینک میں بھی ملازمت نہیں کی تھی:

ہر کس کہ خیانت کُند البتہ بترسد
بے چارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

بیماری اس علاج سے بہتر ہے

اکثر فرماتے کہ تفکرات سے میرے گُردے میں پتھریاں ہو گئی ہیں۔ خان سیف الملوک خان کی تشخیص تھی کہ پتھریوں کی تعداد اُن کے دیلے ہوئے بٹے کھاتے قرضوں کے برابر ہے۔ انھیں

نکالنے کے لیے ہر پندرہ منٹ بعد ایک گلاس پانی پیتے اور اس کی ایک لکیر اپنے سگرٹ کے پیکٹ پر کھینچ دیتے۔ شام کو خالی پیکٹ جمع کرتے اور اُن پر لگائے ہوئے نشانوں کو جوڑ کر یہ دیکھتے کہ آج کتنے گلاس پانی پیا۔ پھر FACIT مشین پر گلاسوں کے گیلن اور گیلن کے پیکٹ بنا کر دیکھتے کہ بقیہ سنگریزوں کو خارج کرنے کے لیے سگرٹ کے کتنے پیکٹ اور پھونکنے پڑیں گے۔

بلا کے وہمی تھے۔ مزاج پوچھو تو جواب نہیں دیتے تھے۔ کراہنے لگتے تھے۔ اس عمل سے فارغ ہوتے تو "الحمدللہ" یا "خدا کا شکر ہے" اس طرح کہتے گویا محض عقیدے کی پختگی کا اعلان مقصود ہے، خیریت کہاں؟ چالیس سال سے اپنی زندگی سے مایوس تھے۔ اینڈرسن کے اصرار پر ایک دفعہ ڈاکٹر سِم کاکس سے بھی رجوع کیا تھا۔ انہی کا بیان ہے کہ میرا حال دیکھ کر ڈاکٹر سِم کاکس کی نبضیں چھُوٹ گئیں۔ اپنے پلنگ کی پائینتی ایک قدِ آدم ANATOMY CHART (انسانی ڈھانچے کا نقشہ جیسا فٹ پاتھ پر مجمع لگانے والے دوافروش ساتھ رکھتے ہیں) کھڑا کر رکھا تھا۔ دن میں جسم کے کسی نہ کسی حصّے میں درد ضرور ہوتا۔ کہیں ٹیس اُٹھتی۔ شام کو چارٹ کے سامنے کھڑے ہو کر، مُنھ سے مُنھ، ہڈّی سے ہڈّی، گُردے سے گُردہ اور رگ سے رگ ملا کر تشخیص کرتے کہ آج کون سا عضو یا عضلہ اُدُ ماؤف ہوا۔ پھر اس کا علاج کشمیر ہوٹل کے اُدلے کے قورمے اور بریانی سے کرتے جس میں برابر کے بادام پڑے ہوتے تھے۔

ہم نے تو انھیں اپنی تنخواہ اور تندرستی کی طرف سے ہمیشہ فکرمند (یا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں، متردّد و متشوّش) ہی دیکھا۔ ایک سال پہلے ان کے چچا جان قبلہ صبح سو کر اُٹھے تو پتہ چلا کہ لقوہ مار گیا۔ اوپر کا ہونٹ ٹیڑھا ہو گیا۔ دو مہینے بعد فالج کا حملہ ہوا اور دائیں ٹانگ بھی بیکار ہو گئی۔ چچا جان قبلہ پر ان حملوں سے ان کی اپنی طبیعت ایسی مفلوج ہوئی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی آئینے میں اپنا اوپر کا ہونٹ ضرور چیک کر لیتے تھے۔ اور نلکے کے نیچے نہانے سے پہلے گھٹنے پر ڈاکٹر کی طرح چھوٹی سی ہتھوڑی مار کر REFLEXES دیکھ لیتے تھے کہ رات فالج گرا یا نہیں۔ غسلخانے کی اندر سے چٹخنی بھی نہیں لگاتے تھے تاکہ میّت نکالنے میں آسانی رہے۔

یہ تھے ہمارے معلّمِ اوّل!

— ۲ —

ڈی سوزا کی قینچی

اس زمانے میں نہ کوئی ٹریننگ ہوتی تھی نہ لیکچروں کا بکھیڑا۔ نووارد گھس بیٹھ کر خود کچھ سیکھ لے تو سیکھ لے، ورنہ کوئی کچھ بتا کے نہیں دیتا تھا۔ واحد ہدایت یہ تھی کہ ہر بات "آبزرو" کرتے رہو۔ بس دیکھتے چلے جاؤ۔ نئے رنگروٹ پر جگادریوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جیسے ایک زمانے میں روم میں حق و ناحق کا فیصلہ بھوکے شیر کیا کرتے تھے جنھیں مسیحیوں پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ شیر ویجی ٹیرین نہ تھے۔ خلقت تالیاں بجا بجا کر حق یعنی شیر کی فتح پر مسرّت کا اظہار کرتی تھی۔

بینک اپنے تار اور کیبل خفیہ "کوڈ" میں بھیجتے ہیں۔ فائدہ اس کا یہ کہ جن کو بینک کے ساتھ فراڈ کرنا ہو، انھیں پہلے اس کا کوڈ چُرانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ کوڈ اتنی ہی ضخیم ہوتی ہے جتنی عام ڈکشنری۔ ڈی سوزا پچیس سال سے سادہ انگریزی کو "پیٹرسن کوڈ" میں منتقل کرنے اور پھر اس آملیٹ سے دوبارہ انڈہ بنانے پر مامور تھا۔ ساری کوڈ حفظ ہو گئی تھی اور بغیر دیکھے ترجمہ کر لیتا تھا۔ تنہا پانچ آدمیوں کے برابر کام کرتا تھا۔ اس کے ذمّے ہمیں اس جنّاتی زبان میں تار بنانا سکھانا تھا۔ مراقی تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ پندرہ سال پہلے اسے ایک گوانیز ٹائپسٹ سے عشق ہو گیا تھا لیکن وہ ایک ہندو تاجر سے شادی کر کے ہانگ کانگ چلی گئی۔ اس دن سے اس کا یہی حال تھا۔ فرصت کے اوقات میں محبوبہ کے نام "پیٹرسن کوڈ" میں ایکسپریس تار ڈرافٹ کرتا اور پھاڑتا رہتا۔ کوئی قریب جاتا تو تار کو ہاتھ سے ڈھانک کر کہتا کیا تمھاری ماں بہین نہیں ہے؟

بڑی بڑی آنکھوں میں جو اُبلی پڑتی تھیں، بے خوابی کے سُرخ ڈورے۔ سر آگے سے گول، پیچھے سے چپٹا۔ گندمی (میکسی پاک وراۓٹی) رنگ۔ چہرے پر دائمی وحشت۔ رات کو دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا تھا۔ دفتر آتے ہی اپنا سیاہ کوٹ، جس کا کالر روزانہ استری کرنے سے چمکنے لگا تھا، کرسی پر ٹانگ دیتا۔ نظر اتنی کمزور کہ جب تک ہمارا چہرہ اس کی آنکھ کے ڈھیلے سے تین انچ فاصلے پر نہ ہو ہمیں پہچان نہیں پاتا تھا۔ اس فاصلے سے ہمارے سر میں پڑے ہوئے گارڈینیا تیل کی خوشبو سے ہمیں فوراً پہچان

لیتا تھا۔ عینک کی قسم تھی۔ صبح ۸ ½ بجے رجسٹر پر سجدہ ریز ہوتا تو چھ بجے سلام پھیرتا تھا۔ کبھی کوئی جھوٹوں بھی چھیڑ دیتا تو دفتر میں بھونچال آجاتا۔ مار پٹائی کے بعد وہ بائیں ہاتھ پر کوٹ ڈال کر چیف اکاؤنٹنٹ کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ دائیں ہاتھ سے اپنے سولا ہیٹ کو چھوتا۔ دہرا ہو کر BOW کرتا اور بغیر کچھ کہے سُنے دروازے سے گولی کی طرح نکل جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس نے وہیں اور اسی وقت استعفےٰ دے دیا ہے۔ کل سے بینک نہیں آئے گا۔ شام کو دو تین چرب زبان افسر اسے منانے گھر جاتے اور منتیں کر کے دوسرے دن آنے پر رضامند کرتے۔ جون جولائی میں بھی کمبل اوڑھ کر سوتا۔ کہتا تھا کمبل نہ اوڑھوں تو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ دفتر میں جہاں بیٹھتا وہاں پنکھا نہیں چلنے دیتا تھا۔ کہتا تھا پنکھا چلنے سے مجھے خونی بواسیر ہو جاتی ہے۔ اس سے بینکنگ کے رُموز اگلوانا ایسا ہی تھا جیسے کسی خونخوار کتے کے جبڑے میں دبی ہوئی نلی میں سے گُودا نکالنا۔

ڈی سوزا کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمھاری تندرستی کا کیا راز ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں کبھی چت نہیں سوتا۔ اور میں نے پچیس سال سے کوئی چھٹی نہیں لی۔ ایک روز وہ اچانک غیر حاضر ہو گیا۔ دوسرے دن اس کے گھر ایک افسر بھیجا تو وہ خبر لایا کہ ڈی سوزا پولیس تھانہ پریڈی اسٹریٹ کی حوالات میں بند، جہازی سائز کی گالیاں بک رہا ہے۔ اس کے باپ کی سمرسٹ اسٹریٹ میں ٹیلرنگ کی بڑی پُرانی دکان تھی۔ کسی بات پر باپ سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے جہازی سائز کی قینچی اس کے کولھے میں گھونپ دی۔ ٹونٹا نکلے آئے۔

اس واقعہ سے بینک میں دہشت پھیل گئی۔ لوگ اس کے دائیں بائیں دو دو کرسیاں چھوڑ کر بیٹھنے لگے۔ ڈسپیچ ڈیپارٹمنٹ نے اپنی قینچی کیش بکس میں مقفّل کر دی۔ دوسرے قسم کی قینچیاں بھی تالو سے لگ گئیں۔ بڑے بڑے افسر کمر پر پیچھے ہاتھ باندھ کر چلنے لگے۔ ڈی سوزا کو پنسل کی نوک بھی تیز کرتے دیکھتے تو لرز اُٹھتے۔ ایک دن چار پانچ کلرک ہماری قیادت میں چیف اکاؤنٹنٹ کے سامنے وفد کی صورت میں پیش ہوئے۔ اور فریاد کی کہ دو دن سے ڈی سوزا کے سامنے ایک سات انچ پیوست ہونے والا پیپر نائف (کاغذ تراش) پڑا ہے جس سے وہ کھیلتا رہتا ہے۔ ہمیں ٹانکے لگوانے سے ڈر لگتا ہے۔ چیف اکاؤنٹنٹ نے ڈی سوزا کو بلا کر نرمی سے سمجھایا کہ تم چاقو واپس کر دو۔ ان بچاروں کو

ڈر لگتا ہے۔

کہنے لگا یہ سالا لوگ کائے کو بوم★ مارتا ہے۔ بے فضول ڈرنا پڑا ہے۔ یہ میرے فادر تھوڑا ہی ہیں۔

— ۳ —

عبادالرحمٰن قاآلب

ہجرت کرنے سے پہلے نہ جانے کیوں یہ خیال تھا کہ ارض موعود میں ہر شخص کباب پراٹھا کھاتا ہوگا۔ دالیں اور سبزیاں صرف ہندوستان برآمد کرنے کے لیے اگائی جاتی ہوں گی۔ حجام، سارنگیے اور فری اسٹائل کشتی لڑنے والے بھی داڑھی رکھتے ہوں گے۔ بازاروں میں ہر قدم پر ہمارے ایمان کی آزمائش کے لیے اتنے سارے حسین نہ چھوڑ رکھے ہوں گے۔ لفظ سُود کا استعمال صرف پندِ سُود مند کے ساتھ جائز و مباح ہوگا۔ ہر شخص اینٹ کا جواب شعر سے دیتا ہوگا۔ الحمدللہ کہ ان میں سے بعض خدشات غلط ثابت ہوئے۔ البتہ یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہُوئی کہ بینک میں سب سُوٹ یا قمیص پتلون پہنتے ہیں، سوائے عبادالرحمٰن قاآلب کے۔ وہ ہمیشہ ٹسر کی شیروانی پہنتے اور اس کی اوپر کی جیب میں، فاؤنٹن پین کی طرح، مسواک لگاتے، جس کا فعّال سِرا باہر نکلا ہوتا تھا۔ نچلی جیب میں بیاض اور ساپخی پان کی ڈبیا۔ ڈبیا میں پانوں کے اوپر چنبیلی کے تین پھول۔ انھوں نے ہمیں کروڑپتیوں کے کرنٹ اکاؤنٹ کی جھلکیاں دکھائیں۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کوّے کی طرح کالا "کریڈٹ بیلنس" کِس طرح دھیرے دھیرے سرمئی ہوتا ہے اور پھر لال بھبھوکا ہو جاتا ہے۔ مُنّے مُنّے سیونگ ڈپازٹ سے بڑے بڑے اوورڈرافٹ بنتے ہیں اور ان سے بڑے بڑے کارخانے، جو انہی سیونگ ڈپازٹ رکھنے والوں کو نوکر رکھ لیتے ہیں۔

عبادالرحمٰن قاآلب اخبار بڑی توجہ سے پڑھتے تھے۔ جہاں کہیں بُری خبر نظر آجائے، ٹانک لیتے۔ اکثر فرماتے، دیکھا! آخر میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ دن بھر بیٹھے اخبار کی جوئیں بینتے رہتے۔ شام تک ــــ خدشہ خدشہ ہم شود خطرہ۔ کبھی کسی اچھی خبر پر نظر پڑ جائے تو دوسرے دن تک

★ بوم مارنا (گجراتی) شور و غوغا کرنا۔

طبیعت منغض رہتی۔ ایک دن بہت ہی خبرناک صورت بنائے بیٹھے تھے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ آہِ سرد کے بعد فرمایا "میرے رٹیائرمنٹ میں کل ۲۲ سال باقی رہ گئے ہیں۔ کچّا ساتھ ہے۔" اس زمانے میں بینک کا بیشتر عملہ گجراتی بولتا تھا۔ اہم عہدوں پر گجراتی بولنے والے حضرات فائز تھے جن کا اردو بولنے والوں کے بارے میں غالباً یہ خیال تھا کہ انھوں نے شعروشاعری کے لیے نہایت موزوں طبیعت پائی ہے لیکن "کیش" (نقد) اور ان کے ذہنِ رسا کے درمیان ایک محتاط فاصلہ ضروری ہے۔ عباد الرحمٰن قالب اس پر بہت کڑھتے تھے۔ شعروشاعری کے بہتان کی تردید میں وہ ایک طویل مسدّس "مکالمہ جبریل و ابلیس" لکھ رہے تھے، جس کا مرکزی خیال دانتے کے جہنم اور مرکزی کردار بینک سے لیے گئے تھے۔ اس نظم میں فرشتے فارسی میں، آدم اُردو میں اور حوّا ریختی میں گفتگو کرتے تھے۔ داروغہ جہنّم ہم سے گجراتی میں خطاب کرتا تھا۔ تاریخ گوئی میں البتہ اپنی نظیر آپ تھے۔ معمولی سے معمولی واقعہ اور تازہ سے تازہ واردات میں سے سارا تاریخی مادّہ ومواد کھینچ کر نکال لیتے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ قالب صاحب کے والد مرحوم بھی شاعر تھے اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانتے تھے۔ چنانچہ مرتے وقت بھی اپنا ہی ایک مقطع زبان پر جاری تھا۔ قالبؔ تخلص کرنے کی بادی النظر میں تو یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ غالبؔ کے مقطعوں میں بغیر رندا مارے یا پچّر ٹھونکے فٹ ہو جاتا تھا۔ بینک میں شعروادب کا معیار معلوم۔ غالبؔ کے شعر اپنے بتا کر سخن ناشناسوں سے داد لیتے رہتے۔ مجیب صاحب بھی اکثر یہی کرتے تھے۔ ایک دن قالبؔ صاحب نے اپنا ایک ایسا شعر سُنایا جو ایک ہفتہ پہلے مجیب صاحب اور ایک صدی پہلے غالب اپنا کہہ کر سُنا چکے تھے۔ ہم نے تخلیہ میں توجہ دلائی تو قالبؔ صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے اعتراف کر لیا کہ سرقہ میں توارد ہو گیا ہے!

وہ نیم کہاں سے لائیں؟

عباد الرحمٰن قالبؔ بلند شہری، ثم ٹونکی، ٹونک کی میونسپل کمیٹی میں متصدّی تھے۔ مشاہرہ ۳۰ روپے چہنور شاہی کہ جس کے ۲۰ روپے کلدار بنتے تھے۔ مگر یہ نشہ کیا کم تھا کہ چار دانگ ٹونک میں کوئی کتّا ان کی منشا کے بغیر بھونک نہیں سکتا تھا۔ اور نہ کوئی پرنالہ ان کی منشا کے بغیر غلط جگہ گر سکتا تھا۔

اپنی متروکہ حویلی سے زیادہ اس شفیق نیم کو یاد کرتے جسے آنگن میں سر جھکائے تنہا کھڑا چھوڑ آئے تھے۔ کہتے تھے مکان کے عوض مجھے مکان الاٹ ہو گیا لیکن حکومت وہ نیم کہاں سے لائے گی جس کی چھاؤں میں نیند کی پریاں جھولا جھلاتی تھیں۔ جس کے نیچے ایک بچے نے نبولیوں سے آم کی دکان لگائی تھی۔ جہاں بہنیں گڑیاں کھیلیں۔ شادی کی شہنائی بجی۔ باپ کا جنازہ رکھا گیا۔ پھر اسی بوڑھے نیم کی سینک سوگوار ماں نے کانوں میں پہن لی۔ روایت ہے اورنگ زیب عالمگیر نے جب یہ خبر سُنی کہ کشمیر کی تاریخی مسجد میں آگ لگ گئی ہے تو اس نے کہا مسجد تو دوبارہ تعمیر ہو جائے گی لیکن صحنِ مسجد کے چنار جل گئے تو ایک ہزار عالمگیر مل کر بھی ایک بوڑھا چنار پیدا نہیں کر سکتے۔

اب انھیں کون بتاتا کہ یادوں کے ایسے بوڑھے نیم تو ہر گاؤں، ہر دل کے آنگن میں سایہ فگن ہوتے ہیں۔ ہاں جب دل کی آگ بجھ جائے تو ان کی جڑیں شریانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔

کیا وہ بھی بُلَن شے کا ہے؟

جب تک ٹونک میں رہے اپنے مولد و آبائی مسکن بُلن شے (بلند شہر کا وہ اسی طرح تلفظ فرماتے تھے) کے گن گاتے رہے۔ کراچی کو اپنا دار القرار بنانے کے بعد بھی ان گلیوں سے نہیں نکلے جہاں جوانی کھوئی تھی۔ کہیں کسی بھلے آدمی کی تعریف ہو رہی ہو تو فوراً پوچھتے:

"کیا وہ بھی بُلن شے کا ہے؟"

کبھی کوئی لاہور کے موتیا، چناب روپ، یا کراچی کی سہانی سلونی شام کی تعریف کر دے تو مقابلے پر فوراً صبحِ بنارس، بدایوں کے پیڑے، ٹونک کے خربوزوں اور دہیں کی برقع پوش پٹھانیوں کو کھڑا کر دیتے۔ دریائے بناس کے کنارے کنارے گلو دگھاٹ کی ان مہکتی فالیزوں کو یاد کرتے، جہاں چاندنی راتوں میں لونگ کے لشکارے سے لہو میں شرارے ناچنے لگتے تھے۔ چھولداریوں کے سامنے دَف اور دائرہ پر وحشت بھرے "چاربیت" گاتے گاتے ذرا سی بات پر پنڈاری خانزادوں کے دم قائم خانی پٹھانوں کے سان چڑھے خنجر اور مرصّع پیش قبض لہرانے لگتے۔ ارمان بھرے سینے ان کے نیام بن جاتے اور خون میں نہائے ہوئے جسم اسی بالو پہ تڑپ تڑپ کے ٹھنڈے

ہوتے جہاں کیوڑے میں بسی ہوئی سُرخ صافی سے ڈھکی ہوئی، پانی کی قدِ آدم گول★ ٹھنڈی ہونے کے لیے دریائی ریتہ میں گلے گلے تک گڑی ہوتی تھی۔ بناس کی موجیں روز یہی منظر دیکھتی تھیں۔ پچھلے پہر تک جُواسے کی باڑھ، بیلے کے گجروں، تازہ خون، لُو میں پکے ہوتے خربوزوں، خَس کی پنکھیا، مہندی رچے ہاتھوں کی نمی، سوندھے چھڑکاؤ، کوری ٹھلیا اور کورے پنڈے کی مہکار سے ہوائیں دیوانی ہو جاتیں۔ اور رات چاند کا جھومر اتار دیتی۔

ہر شاخ پہ پنچھی بیٹھا ہے

اور دریائے بناس بہتا رہتا اور وہ لہروں لہروں "ٹُمبن شُٹے" پہنچ جاتے۔ کہاں ٹُمبن شُٹے کہاں کراچی۔ ٹُمبن شُٹے کی کیا بات ہے۔ "ایک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے!" اوپر کوٹ پہ برسات کی بہاریں، کیا کہنے! رِم جھم رِم جھم مینہ برس رہا ہے۔ ندی نالے اور پاینچے چڑھے ہوئے ہیں۔ ننگی کھُلی حالیت میں کوئی یاں پہ رپٹ رئی ہے، کوئی واں پہ رپٹ رئی ہے۔✪ کچّی کچّی امبیا پہ رُوم جھوم پانی برس ریا ہے۔ کوئل کوک رئی ہے۔ دِل میں ہُوک سی اُٹھ رئی ہے۔ امبوا کی ڈالی پہ جھُولا پڑا ہوا ہے۔ بہو بیٹیاں کمر لچکا لچکا کے گا رئی ہیں، چھا رہی کالی گھٹا جیارا مورا لہرائے ہے۔ سہیلیاں جھونٹے دے رہی ہیں۔ کاسنی دوپٹے ہوا میں اڑتے جا ریے ہیں۔ حرام کے جَنے لمڈے دِن کو حریان کر ریے ہیں۔ بُلبلیں چہچہا رئی ہیں۔ مینائیں چہک رئی ہیں۔ دوسری ڈال پہ مور بول ریا ہے۔ دِس کی جُرو الگ ایک ٹہنے پہ مستا رئی ہے۔ تیسری ڈال پہ شاما ایسا جی توڑ کے گا رئی ہے مانو جی جان سے گزر جاوے گی۔ چوتھی پہ، کیا نام دِس کا، پاپی پپیا پی اُو! پی اُو! کر ریا ہے!"

"پی اُو! پی اُو!" پر خان سیف الملوک خان کے صبر کا پیمانہ ایک دن لبریز ہو گیا۔ وہی لہجہ

★ گول: پانی یا اناج رکھنے کے بڑے بڑے ماٹ۔ راجستھان میں انہی طبوترے گھڑوں میں اودے پور تراوائی ٹ کے سُورج ونشی راجپوت سردار نوزائیدہ بیٹی کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔

✪ ہم نے بہت ضبط و اختصار سے کام لیا ہے ورنہ وہ تو اپنے پھسلنے حافظے پر گھنٹوں پٹخنیاں کھلواتے رہتے تھے اور اس وقت تک دم نہیں لیتے تھے جب تک سراپا کی تمام تفصیلات بتا کر فارغ التفصیل نہ ہو جائیں۔

بنا کر بولے "اماں بس کرو۔ سالا آم کا پیڑ نہ ہوا، شہر کراچی ہو گیا کہ دنیا جہان کا جِنا ور اپنی اپنی بولی بولے چلا جا رہا ہے اور خدُ بی قسم اُڑنے کا نام نہیں لے رہا!"

پُھٹکر آدمی؟

ہر بینک کا ایک اپنا محکمہ تفتیش و سراغ رسانی ہوتا ہے جس کا کام کم و بیش وہی ہوتا ہے جو اگلے وقتوں میں شادی بیاہ کے موقع پر نائنوں اور مغلانیوں کا ہوتا تھا۔ یعنی چال چلن وغیرہ کی پوری طرح چھان بین کر کے غلط فیصلہ کرنا...... طرفین کی کون سی پُشت میں نی ہے؟ دولہا کی بائیں آنکھ دبی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ معمولی لقوہ ہے یا چال چلن کی مستقل خرابی؟ دلہن کی ننھیال برقع سے باہر کب نکلی؟ نئی کوٹھی کی نیو میں سیمنٹ، سریا، بجری اور بلیک کا تناسب معمول کے مطابق ہے یا کمی بیشی کی ہے؟ اگر مقروض نہیں ہے تو وجہ بتاؤ۔ کیا لوگ بھروسا نہیں کرتے؟ خاندان خالص ہے یا جدِّ امجد پاندان اٹھاتے تھے؟ آدمی ایماندار، شریف اور سو فیصد قابلِ اعتبار ہے یا نہیں؟ مطلب یہ کہ محکمہ انکم ٹیکس کے علاوہ کسی اور کو دھوکا تو نہیں دیتا؟ اچانک روئی کی قیمت گرنے سے اس کی رُوئی آگ تو نہیں پکڑتی؟ ہارٹ اٹیک نہ ہونے کا کہیں یہ سبب تو نہیں کہ نفع نقصان کا حساب ہی نہیں کرتا؟ دفتر سے سیدھا جمخانہ جاتا ہے یا گھر گھُستا ہے؟ کون سے دوالے کے بعد نام سے پہلے حاجی لکھنا شروع کیا؟ یہ سارا محکمہ حسن احمد فاروقی کی تنہا ذات پر مشتمل تھا کہ وہ خود اپنے باس تھے اور خود ہی ماتحت۔ ہم نے ان کی شاگردی اختیار کی تو کہنے لگے برخوردار! جس تندہی اور بے جگری سے تم کام کر رہے ہو، اس پر تو ناکام اقدام خودکشی کا گمان ہوتا ہے۔ خودکشی کی اور بھی ترکیبیں ہیں جن میں اتنی محنت نہیں پڑتی۔ ہمیں وہ باتونی، بے فکرے، آسانی سے گھل مل جانے والے پُھٹکر آدمی لگے۔ سنیچر کی سہ پہر کو شطرنج کھیلنے بیٹھتے تو اتوار کی رات کو دو بجے اٹھتے۔ پان کی لت ایسی کہ رات کو بھی کلّے میں دبا کر سوتے۔ دِلّی کے روڑے تھے۔ انھیں ہمارے ذہن کی اصلاح سے زیادہ زبان کی فکر کھائے جاتی تھی۔ ہر ایک کے لہجے، چال، اور MANNERISMS کی بڑی اچھی نقل اتارتے تھے۔ کوئی لکھنؤ جاتا تو اس سے صغر علی محمد علی

کے عطر شمامتہ العنبر کی فرمائش ضرور کرتے۔ بیگم کو بہت پسند تھا۔

بانس بُدّھی

ہمارے سامنے کی بات ہے، ایک عامتہ الورود واقعہ ــــ موت ــــ نے فاروقی صاحب کی ساری زندگی یکلخت منقلب کردی۔ ان کے ایک ساتھی اور ہم عمر کو ان کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے اچانک سینہ میں درد محسوس ہوا اور دیکھتے دیکھتے ان کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ اسے دفنا کر لوٹے تو شطرنج کا دوسرا کھلاڑی بھی مر چکا تھا۔ فراقؔ گورکھپوری کہتے ہیں کہ بُدّھی (عقل) کی تین قسمیں ہوتی ہیں: گھڑا بُدّھی، نمدہ بُدّھی، بانس بُدّھی۔ گھڑا بُدّھی وہ کہ چکنے گھڑے پر کتنا ہی پانی ڈالو، وہی سوکھے کا سوکھا۔ نمدہ بُدّھی ــــ نمدے کی سمان کہ جب تک سُوئی نمدے کے اندر ہے، سوراخ قائم ہے۔ سُوئی نکلی اور گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ اور سب سے اُتم بُدّھی بانس بُدّھی کہ اوپر ایک ذرا چوٹ پڑی اور بانس نیچے تک چِرتا چلا گیا۔ سو اُن کی چھاتی شق ہو چکی تھی۔

عیاشی سے توبہ

کئی دن گُم صُم رہے۔ پھر ایک دِن سُنا کہ سہون شریف کے ایک بزرگ سے بعیت ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد بلیڈ کو رُخسار سے نہ لگنے دیا۔ بڑی بھرواں داڑھی نکلی۔ ایسی ہی داڑھی کو دیکھ کر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے کہا تھا کہ حضرت آپ تو میدانِ حشر کے بھیڑ بھڑکے میں اپنی داڑھی کے چھپّر تلے چھُپ جائیں گے، میں خُدا کو اپنا ننگا مُنھ کیسے دکھاؤں گا۔ پیر و مرشد کبھی کراچی تشریف لاتے تو جمعہ اور اتوار کو عصر و مغرب کے درمیان منگھو پیر کی طرف سفید گھوڑی پر سیر کو نکلتے۔ یہ رکاب تھامے ساتھ ساتھ چلتے۔ انھیں سے مروی ہے کہ حضرت جتنی دیر گھوڑی پر سوار رہتے ہیں، لید میں سے شمامتہ العنبر کی خوشبو آتی ہے۔ حجرے میں تہجد سے پہلے ببر شیر اپنی دُم سے جھاڑو دیتا ہے۔

ہم نے ٹوکا "شیر ببر تو افریقہ کے جنگلوں میں ہوتا ہے۔"

فرمایا "یہ میں نے کب کہا کہ وہ منگھوپیر کی جھاڑیوں میں سے آتا ہے؟ اپنی طرف سے آپ بات خوب جوڑتے ہیں۔"

ہمیں بھی نیک رہنے اور باز آنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ہمیں اس کا بڑا قلق تھا کہ خدا نے ہمیں بدی کی استطاعت دی ہوتی تو آج ہم بھی اس سے توبہ کرکے ثواب لوٹتے۔ ابھی تک یاد ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ رات کے بارہ بجا چاہتے تھے۔ ہم مع اپنے چار بچوں اور بیوی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے کوارٹر کے چھوٹے سے کمرے میں فرش پر دیا سلائیوں کی طرح ایک طرف سر کیے پڑے تھے کہ کسی نے گھر کے سامنے حیدرآبادی انداز سے تالی بجائی★۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے تو دیکھا کہ فاروقی صاحب سر پر روئی کا ٹوپا پہنے، ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑے ہیں۔ ان کے دانت اور گھٹنے بج رہے تھے۔ گھبراہٹ میں ہم بھی ململ کا پھٹا کرتا پہنے، ننگے پیر بستر سے نکل آئے تھے۔ بہتیرا ہاتھ سے جبڑے کو تھاما لیکن دانت تھے کہ اس آلے کی طرح کٹ کٹ، کٹ کٹ "مارس کوڈ" میں بجے چلے جا رہے تھے جو ٹیلی گراف آفس میں تار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سادہ زبان میں سلام وکلام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دیر تک دونوں آمنے سامنے کھڑے بصد خلوص کٹکٹاتے رہے۔ ہمارے تصرّف میں ایک ہی کمرہ تھا۔ اس لیے ہم انھیں اندر آنے کو بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ خود بھی خاصی عجلت میں تھے۔ انھوں نے بکمال شفقت ہمیں اپنی داڑھی سے لگایا۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑی دیر تک چمٹے رہے۔ اس میں خلوص کی شدّت سے زیادہ جاڑے کی شدّت کو دخل تھا۔ وہ اپنی شلوار اور ہم اپنے پاجامے میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بار بار مصافحہ اور مسلسل معانقہ کی گرمائی سے الفاظ پگھلے تو انھوں نے چھوٹتے ہی ہمیں شراب اور زنا سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔ ہم نے ننگے پیر، پھٹے کرتے کے نیچے دھڑکتے دل پر ٹھٹھرا ہوا ہاتھ رکھ کر رئیسانہ طرزِ زندگی اور عیّاشی سے اجتناب اور پرہیزی زندگی گزارنے کا وعدہ کیا۔ اور عرض پرداز ہوئے کہ حضرت! آپ نے رات گئے بڑی زحمت فرمائی۔ جواب میں انھوں

★ حیدرآباد دکن میں شرفا کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دے کر بلانا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ تالی بجاتے ہیں۔

نے (اپنے یخ ہاتھ کو، دونوں طرف سے، ہماری گُدّی پر اس طرح گرم کرتے ہوئے جس طرح نائی اُسترے کو چموٹے پر چلاتا ہے) فرمایا کہ انھوں نے اپنے پیرِ صاحب قبلہ کے سامنے مترجم قرآن اٹھاکر عہد کیا ہے کہ روزانہ کم از کم سات آدمیوں کو شراب اور زنا سے باز رہنے کی تلقین کریں گے۔ عشا کے بعد وہ اپنی "راؤنڈ" پر نکلے ہوئے تھے۔ آج کی رات ہم چوتھے آدمی تھے۔ مگر ان کی لالٹین میں ابھی کافی تیل باقی تھا اور بتّی خاصی لمبی تھی۔

وقتِ رخصت سکوت کیا اور فرمایا کہ ہمارے شیخ کا قول ہے کہ جاڑے اور بڑھاپے کو جتنا زیادہ محسوس کرو اتنا ہی لگتا چلا جاتا ہے۔ پیرِ صاحب کا سنِ شریف ۱۰۵ سال تھا۔ چالیس حج کر آئے تھے۔ بال کالے ہوتے جا رہے تھے۔

وہ پَو پھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی

سادہ دِل کثیر العیال آدمی تھے۔ اس مرحلہ پر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان کے ہاں تنگ دستی پہلے آئی یا اولاد۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ہمیں اپنے گھر لے جاتے جو برنس روڈ کے گنجان علاقے میں ادیبؔ سہارنپوری کے فلیٹ کے قریب تھا۔ راستے میں ادیبؔ کو ساتھ لیتے۔ چائے، شاعری اور اسکینڈل کا دور چلتا۔ اس کے بعد تینوں کباب کھانے نکل جاتے۔ ادیبؔ کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے اور بھاوج سے اس قدر خوفزدہ کہ کبھی اپنے فلیٹ میں گندے لطیفے اور اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ اور نہ وہاں بیگم . . . کے قصّے سناتے۔ وہ ان کا کلام انہی کے ترنّم میں اس طرح پڑھتیں کہ جب خود ادیبؔ یہی غزل پڑھتے تو اصل پر نقل کا گمان ہوتا۔ آنکھیں بند کر کے لہک لہک کر پڑھتے تھے۔ بعض حسینوں کے بال گھنگریالے ہوتے ہیں۔ ادیبؔ کی آواز گھنگریالی تھی۔ رسیلی اور پُر امید تان میں نہ جانے درد کی گونج کہاں سے آتی تھی۔ جیسے ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں اور چہرہ ہنستا رہ جائے۔ یہ مسکراہٹ

وہ پَو پھٹی، وہ کرن سے کرن میں آگ لگی

کے لہرے کے ساتھ اُبھرتی اور "اے مری عمرِ رواں! اور ذرا آہستہ!" اور ذرا آہستہ! اور ذرا آہستہ میں گم ہو جاتی۔

ادیب بڑے میٹھے اور ملائم لہجے میں بات کرتے۔ نجی محفلوں میں دیکھا کہ لطیفے کے پہلے ہی فقرہ پر اپنی نشست چھوڑ کر، لطیفہ گو کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر، داد اس طرح دے کر آتے جیسے ریس میں پستول چلنے سے پہلے ہی بعض بے صبرے دوڑ پڑتے ہیں اور واپس بلائے جاتے ہیں۔ پھر سب کے ساتھ اسی جوش و خروش سے دوڑتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک مدّاح نے جوشِ عقیدت میں ادیب کی غزل کو ایک دوسرے شاعر کی اسی زمین میں کہی ہوئی غزل سے بہتر قرار دیا۔ اس شاعر کا ادیب بہت احترام کرتے تھے۔ کہنے لگے یہ سب انہی کا فیضان ہے۔ پھر انھوں نے حضرت جگرؔ مرادآبادی کا قصّہ سنایا کہ انھوں نے اپنے بھتیجے کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ ایک دن وہ ان کے کاندھے پر بیٹھ کر کہنے لگا کہ ابّا! میں آپ سے بڑا ہوں۔ جگرؔ صاحب نے کہا بیٹا! تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمھاری اس بڑائی میں میرے جسم کی لمبائی بھی شامل ہے۔

ٹاٹ کا ایک تھیلا، جس میں بیاض، عینک، تین چار کتابیں اور رسالے، قلم، ڈائری اور چھوٹا سا کٹوردان، بالعموم ہاتھ میں رہتا۔ بغلگیر ہونے سے پہلے اسے اپنی اور فریقِ ثانی کی ٹانگوں کے درمیان رکھ دیتے۔ بحریہ کی ایک لائبریری میں ملازم تھے۔ تنخواہ قلیل۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں کا ساتھ، جن کے یہ باپ بھی تھے اور ماں بھی۔ بیوی کے انتقال کو کئی برس گزر چکے تھے۔ کبھی کوئی دوسری شادی کا مشورہ دیتا تو ہنس کر کہتے کہ بجلی ایک ہی جگہ دوبارہ نہیں گرا کرتی۔ کبھی انھیں دلِ گرفتہ و مغموم نہ پایا۔ شام کو کسی نہ کسی کے ساتھ SNAKES AND LADDERs کھیلتے اور اپنی ہار پر قہقہے لگاتے ہی دیکھا۔ ٹوکتے ہی ہمارے ساتھ ہو لیتے۔ ساتھی سانپ پٹیارہ جاتا۔ بارہ تیرہ سال کے عرصہ میں صرف ایک موقع ایسا آیا جب ادیب نے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ اتوار کی سہ پہر کو ہم پہنچے تو کہنے لگے کہ جناب آج بندہ شعر سنائے گا نہ کباب کھلائے گا۔ مجھے اشد ضروری کام ہے۔

ادیب نے جو اپنی دلداری و دلنوازی کے لیے مشہور تھے، ایسا کورا جواب ہمیں ہی کیا، کسی کو نہ دیا ہو گا۔ کُرید اتو معلوم ہوا کہ ہندوستان سے ایک فٹ بال ٹیم میچ کھیلنے آئی ہوئی ہے۔ اس میں ایک سکھ کھلاڑی بھی ہے۔ ”یوسفی بھائی! مجھے فٹ بال سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مگر خدا کی قسم! سات سال سے کوئی زندہ لطیفہ نہیں دیکھا۔“

دَف کیسے مارا جاتا ہے؟

گرم چائے، تازہ غزل اور تیز چونے کے پان سے تواضع کے بعد فاروقی صاحب دِلّی کے کبابیے کی دکان پر لے جاتے اور گولے کے کباب کھلاتے۔ پیٹ بھرنے سے پہلے آنکھیں بھر آتی تھیں۔ پہلی دفعہ دکان پر لے گئے تو دِلّی کے کلچر اور قیمے کی باریکیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کباب کھانے کے ادب آداب اتنی تفصیل سے بتائے کہ ہم جیسے مارواڑی رانگڑ کی سمجھ میں بھی آ گیا کہ سلطنت ہاتھ سے کیسے نکلی۔ دِلّی کے کبابیوں کا کیا کہنا۔ بالکل وہی تیزابی مصالحے جو بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تھے، وہی شاہی رکابداروں کی ترکیبیں سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔ اور وہی امراض بھی معدہ بہ معدہ۔ حالانکہ اب نہ وہ تگڑی راسیں رہیں نہ وہ قدر دان۔ کچری اور پپیتے کی ایسی گلاوٹ لگاتے ہیں کہ موٹے سے موٹا گوشت پل بھر میں سرمہ ہو جائے۔ بقول شخصے مست بچار کے یہ مصالحہ لگا دیں تو وہیں کھڑا کھڑا گل کے قیمے کا ڈھیر بن جائے۔ یوں تو دنیا میں غیبت سے زیادہ زود ہضم کوئی چیز نہیں، لیکن یہ کباب بھی حلق سے اُترتے ہی جزو بدن ہو جاتے ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ گولے کے کباب میں ایک حصّہ قیمہ، ایک حصّہ مرچیں اور ایک حصّہ دھاگے★ پڑتے ہیں۔ سیخ سے اُتار کے کڑکڑاتے گھی کا بگھار دیتے ہیں۔

"سیخ کباب میں بگھار؟ یہ کس خوشی میں؟" ہم نے پوچھا۔

"اس سے مرچوں کا دَف مر جاتا ہے۔ ساتھ بھرت کی سبک سی کٹوری میں گرم مصالحہ رکھ دیتے ہیں۔ پھر کبابوں میں بکری کا بھیجا اور اَلھڑ بچھڑے کی نلیوں کا گودا علیحدہ سے ڈالتے ہیں۔"

"یہ کیوں؟"

"اس سے گرم مصالحہ اور جائفل جاوتری کا دَف مر جاتا ہے۔ پھر بڑی پیاز کے لچھّے اور ادرک کی ہوائیاں۔ اور ان پر ہری مرچیں کتر کے ڈالتے ہیں۔ یہ میسّر نہ ہوں تو محض سی سی کرنے سے بھی

★ دھاگے: کباب پر کثرت سے لپیٹے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ دِلّی میں دھاگے اور سُوت کے گولے کے کارخانے انھی حضرات کے تھے جو گولے کے کبابوں کے رسیا تھے۔

لذّت بڑھتی ہے۔ خمیری نان کے ساتھ کھاتے وقت برف کا پانی خوب پینا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"برف سے خمیری روٹی اور ہری مرچوں کا دَف مرتا ہے۔ مُصلح ہے۔ بعض نفاست پسند تو کبابوں پر پتّیا مرچ کی چٹنی چھڑک کر کھاتے ہیں۔ پھر حسب حیثیت دہی بڑے یا قلفی فالودے کی ڈاٹ لگاتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"اس سے چٹنی کا دَف مرتا ہے۔"

"اگر یہ سارے چونچلے فقط کسی نہ کسی کا دَف مارنے کے لیے ہیں تو چٹوروں کی سمجھ میں اتنی سی بات کیوں نہیں آتی کہ یکے بعد دیگرے دَف مارنے کے بجائے، شروع ہی میں کم مرچیں ڈالیں یا پھر زبان پہ ربر کا دستانہ چڑھا کر کھائیں۔"

ادیب سہارنپوری نے (جو پیدائش و توطّن ہی نہیں، طبیعت کے لحاظ سے بھی دِلّی اور پنجاب کی سرحد پر واقع ہوئے تھے) اس مرحلہ پر شعر کا سفید پرچم لہرا کر جنگ بندی کرائی۔ ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے حضرت! دُنیا میں ہر بات منطق کے مطابق ہونے لگے تو خدا کی قسم زندگی اجیرن ہو جائے۔ اسی بات پر ایک ظالم کا شعر سُنیے:

سپرد خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں؟

بعد ازاں اسی نکتۂ راز کو پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے نے اپنے بقراطی انداز میں یوں ذہن نشین کرایا کہ جوانی دیوانی کا دَف بیوی سے مارا جاتا ہے۔ بیوی کا دَف اولاد سے مارتے ہیں۔ اور اولاد کا سائنسی تعلیم سے۔ سائنسی تعلیم کا دَف اپنے ہاں دینیات سے مارا جاتا ہے۔ ارے صاحب! دَف کا مرنا کھیل نہیں ہے، مرتے مرتے مرتا ہے۔

فاروقی صاحب ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو دستر خوان کے بجائے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ انھیں کھانے سے زیادہ کھِلانے میں مزا آتا تھا۔ ہر لقمے کے ساتھ دہلوی دستر خوان کی نزاکتیں

بھی ذہن نشین کراتے جاتے۔ ایک دن کہنے لگے کہ دِلّی میں تو جو شخص شیرمال اور تافتان میں فرق نہ کر سکے اسے کلچرڈ نہیں سمجھتے۔

”یہ کون سی مشکل بات ہے“۔ ہم نے کہا۔

”بتائیے۔ کیا فرق ہوتا ہے؟“

”ایک زیادہ بدمزہ ہوتا ہے“۔

اجرک

بیعت کے بعد فاروقی صاحب نے اپنے شیخ کے ایما پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عارفانہ کلام سے کسبِ فیض کی خاطر سندھی سیکھنی شروع کی۔ قلب گداز ہو چکا تھا۔ ویسے بھی صلح کل آدمی تھے۔ سِندھی کی پہلی کتاب سبقاً سبقاً پڑھ کر بولے کہ صاحبو! مجھے تو اردو اور سِندھی میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ سندھی کے نقطوں کو اُلٹا لگا دیا جائے تو اُردو بن جاتی ہے۔ گھر پر سیاہ کُرتا اور ٹخنے سے اونچی شلوار پہننے لگے تھے۔ شانے پر شیخ کی بخشی ہوئی ایک چھوٹی سی سندھی اجرک جسے لمبا رومال یا انگوچھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کثیر المقاصد شے ہم نے نہیں دیکھی۔ ہائیڈروجن بم اور قمری راکٹ بنانے والے ایسی کوئی چیز ایجاد کر کے دکھائیں تو ہم جانیں۔ فاروقی صاحب اس سے مُنھ پونچھتے۔ دسترخوان کا کام لیتے۔ کہیں پیدل منزل مارتے تو اسی سے گردِ سفر جھاڑتے۔ لُو چلنے لگے تو اسے پانی میں تر کر کے عربوں کے غُترہ دعقال کی طرح سر پر ڈال لیتے۔ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم ہوں اور عین غیبت میں اگر وقت نماز آجائے، تو اسی کو فرش پر قبلہ رُو بچھا کر سربسجود ہو جاتے اور رب کا شکر ادا کرتے جس نے اِنسان کو قوتِ گویائی عطا کی۔ دِن میں پنکھے اور رات کو مچھر ستاتے تو اسے مُنھ پر تان کر سو جاتے۔ جاڑے اور زکام میں یہ مفلر کا کام دیتی۔ اور رات کو حلوائی کی دکان سے بیمار بچّے کے لیے اونٹتا دُودھ لاتے تو اس کا اینڈوا بنا کر ہتھیلی پر رکھ لیتے۔ بیوی کو اچانک ننگے سر دروازہ کھولنے جانا پڑے تو اس کی بُکل مار کے اوڑھنی بنا لیتی۔ خود نروس یا کھسیانے ہوتے تو کونے کو بل پہ بل دیتے یا یونہی عینک کا شیشہ صاف کرنے

لگتے۔ سودا سلف لینے بازار جائیں تو یاد دہانی کے لیے بیوی اس میں گرہیں لگا دیتی تھی، مگر یہ بھول جاتے کہ کون سی گرہ کس شے مطلوبہ کا سمبل ہے۔ پہلی تاریخ کو مہینے کا سودا خریدنے نکلتے تو یہ دیہاتن کی مینڈھی کی طرح گوندھی ہوئی ہوتی تھی۔ رات کو بچے اس کا کوڑا بنا کر اگلے پچھلے حساب چکاتے۔ عُجلت میں ہوں یا کسی خاص مہم پر جا رہے ہوں تو کندھے سے اُتار کر ہاتھ میں لے کر چلتے۔ کوئی گھر ملنے آئے تو بٹھانے سے پہلے اسی سے مونڈھے کو صاف کرتے۔ خانقاہ میں ایک دن وضو کرتے ہوئے مسجد کے حوض میں گر پڑے اور کُہنی زخمی ہو گئی تو دوسرے دن اسی کے 'سلنگ' میں ہاتھ کو، ۷ کے ہندسہ کی طرح رکھ کر بینک آئے۔ کوئی بھری محفل میں نازیبا بات یا مذاق کر بیٹھے تو اسے مُنھ میں ٹھونس کر کُھس کُھس ہنسی کو چھانتے رہتے۔ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو خانقاہ سے ایک جلالی وظیفہ پڑھ کر لوٹ رہے تھے کہ راستے میں چار غنڈوں نے گھیر لیا۔ اب کیا تھا۔ انھوں نے امام ضامن کا کلدار روپیہ اجرک کے کونے میں باندھ کر بنوٹ کے ایسے ہاتھ دکھائے کہ ایک غنڈے کی کنپٹی میں بھمّا تا کُھل گیا۔ وہیں کھیت رہا۔ پسماندہ غنڈے تھانے میں رپٹ لکھوانے بھاگے۔ ہماری مسکراہٹ میں انھیں استہزا کی جھلک نظر آئی تو طیش میں آ کر فرمایا کہ آپ جیسوں کو تو چٹکی میں ہی ڈھیر کر سکتا ہوں۔

دوپہر کو فرش پر کھانا کھانے بیٹھتے تو بیوی اسی اجرک کی چنوری بنا کر مکھیاں جھلتی رہتی۔ روز صبح اسے دھو کر شام کے استعمال کے لیے سجل کر دیتی۔ بڑی بیٹی کی شادی طے ہوئی تو بینک سے پانچ سو روپے قرض لیے اور ایک دن شام کو شاداں و فرحاں اپنی بٹیا کے جہیز کے سارے کپڑے اس میں باندھ کر دکھانے لائے۔ پھر وہ گھڑی بھی آئی جب سکھی سہیلیوں نے ایسی رندھی ہوئی آواز میں "لکھی بابل مورے! کاہے کو بیاہی بدیس رے، لکھی بابل مورے!" گایا کہ دولہا والوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ جس باپ نے جہیز میں چاندی کا زیور، ململ کے دوپٹے اور ایلومینیم کے برتن دیے، اس کے سینے سے لگ کے بیٹی جس طرح پھوٹ کے روئی ہے، ہم نے کسی امیر کبیر کی بیٹی کو اس طرح تڑپ کر روتے نہیں دیکھا۔ شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی تو میاں بیوی کو اطمینان ہوا کہ بارے بوجھ ہلکا ہوا۔

لیکن مشیّت کو کچھ اور منظور تھا۔ تین مہینے بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ بیوی کو ٹائیفائڈ ہوا۔ پانچ چھ دن تک تیز بخار میں کھانا پکاتی، جھاڑو بہارو دیتی اور بچّوں کو نہلا دُھلا کر اسکول بھیجتی رہی۔ قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا۔ شام کو گھر جاتے تو پاکستان چوک سے ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر سے چار آنے کی پُڑیا لیتے جاتے۔ کسی سے تذکرہ تک نہ کیا۔ رات کی جگار سے سُوجی سُوجی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مَل مَل کر دن بھر کام کرتے رہتے۔ دس دن بیمار رہ کر وہ نیک بی بی اپنے رَب سے جا ملی۔ دِل پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی۔ لیکن کیا مجال کہ حرفِ شکایت زبان پر آئے۔ یہی شیخ کی ہدایت تھی۔ جنازے میں محلّے کے سبھی لوگ شریک تھے۔ بیٹا جو مشکل سے نو سال کا ہوگا اسی اجرک میں پھولوں کی چادر، اگر بتّی، گلاب جل اور شمامتہ العنبر باندھے بے خبر پیچھے چل رہا تھا۔ اس میں ابھی تک کچھ یاد دِلانے کے لیے، ایک ننھّی سی گرہ مرحومہ کے ہاتھ کی لگی ہوئی تھی جسے انھوں نے تین دن سے نہیں کھولا تھا۔ ڈولا لحد کے پہلو میں رکھا گیا اور سرہانے سے غلافِ کعبہ کا پارچہ ہٹا دیا گیا۔ میّت قبر میں اتارنے لگے تو اپنے ہاتھوں سے اجرک کمر میں ڈال کر دُکھ درد کے ساتھی کو مٹّی میں سُلا دیا۔ اسی سے گوشۂ چشم پونچھا۔ دھیرے سے گرہ کھولی۔ اور پھر اپنے شیخ کے اس تبرّک کو کفن پر ڈال دیا۔

کیا کوئی وحشی اور آپہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا؟

سدا سہاگن راگنی

رات کے دس بجا چاہتے تھے۔ بینک میں دس بارہ شب زندہ دار رہ گئے ہوں گے۔ بسیں چلنی بند ہو گئی تھیں اور اندر باہر سنّاٹا تھا۔ بھوک بھی تھوڑی دیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری نہیں تو ایسی گہری نیند ضرور سو گئی تھی جو سسکیاں لے لے کر رونے کے بعد بچّوں کو آجاتی ہے۔ اچانک عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔ جیسے چیل، مینڈک اور بوڑھی میم مل کر قوّالی گا رہے ہوں۔ ہم نے ہال میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تمام آوازیں ایک نوگرفتار، آزاد منش (سابق) سیکنڈ لفٹین این۔ ایم۔ ایم۔ ایم۔ این۔ پی۔ کُنجو کے گلے میں رڑک رہی ہیں۔ انھیں بینک میں وارد ہوئے کوئی ایک مہینہ ہوا ہو گا اور اس وقت وہ ملیالم زبان کا ایک رومینٹک لوک گیت گا رہے تھے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ دریائے کاویری کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہو کر ایک دراوڑی دوشیزہ نے انھیں سکھایا تھا۔ یہ دعویٰ درست ہی ہو گا، اس لیے کہ اگر وہ واقعی دریائے کاویری کے اُس پار کھڑی تھی تو اس کی دوشیزگی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھی کی زبانی اس کا خارا شگاف ترجمہ سُن کر ہمارے تو پسینے چھوٹنے لگے۔ اس کے شِرنگار رَس کے سامنے اردو کی ساری عشقیہ شاعری بالکل نرسری رہائم اور گُڈے گڑیا کا کھیل معلوم ہونے لگی۔ حق نواز جیمہ، اکاؤنٹنٹ، اسٹرانگ رُوم (محافظ خانہ) کی بالشت بھر لمبی چابیاں چھنکا کر سنگت کر رہے تھے۔ ہر ملیالم بول کے بعد این۔ ایم۔ این۔ پی۔ کُنجو کچھ دیر مُنھ سے مِردنگ بجاتے۔ اور جب وہ گانا موقوف کر کے اور ٹھاٹ بدل کر مُنھ سے

طبلے کی سی آوازیں نکالتے لگتے تو چاچا فضل دین چوکیدار آٹا گوندھنے کے تسلے پر تھاپ لگا کے اعلانِ جنگ کرتا اور پنجابی ٹپّہ کا ٹکڑا "بارھیں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندا چھاداں"★ لگا کے اہلِ درد کو لُوٹ لیتا۔

پاکستان تازہ تازہ نقشہ پر اُبھرا تھا اور خطِ تقسیم کی روشنائی ابھی اچھی طرح خشک نہیں ہوئی تھی۔ بینک میں لکھتے سب انگریزی میں تھے۔ گفتگو اُردو میں۔ لیکن گالی ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی دیتا تھا:

زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

انگریزی کی گالی بالکل پھیکی، بے باس اور گھٹیا ہوتی ہے۔ یہ گالی آدمی اپنے آپ کو بھی دے سکتا ہے۔ اُردو کی مروّجہ گالی، جس کی طرف غالبؔ نے ایک خط میں اشارہ کیا ہے، مُسن اور بوڑھے آدمی کو نہیں دی جا سکتی۔ کاٹ اور زورِ بدکلامی کے لحاظ سے البتہ مارواڑی گالی کا جواب نہیں۔ لیکن یہ اتنی گندی اور گنجلک ہوتی ہے کہ اس کے صحیح مخاطب و مستحق صرف مارواڑی ہو سکتے ہیں جن کی تعداد، بشمول راقم الحروف، پاکستان میں اتنی کم ہے کہ جی کی بھڑاس نہیں نکل سکتی۔ اِسی طرح اُس زمانے میں بے سُرا گانا بھی ہر شخص اپنی ہی زبان میں گاتا تھا اور کسی کو اس سے یہ گلہ نہیں ہوتا تھا کہ ہماری مادری زبان میں مردم آزاری کیوں نہیں کرتا۔ ایک رات واحد بخش گھوسو نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا عارفانہ کلام بھیرویں میں سُنا کر دلوں کو ایسا گرمایا کہ اسی وقت یہ طے پایا کہ بول کسی بھی زبان کے ہوں، جُملہ آلاتِ موسیقی —— لحمی و غیر لحمی —— مستقل بھیرویں ہی بجایا کریں گے۔ یوُں بھی بھیرویں اور خوشامد سدا سُہاگن راگنیاں ہیں۔ ہر وقت، ہر محفل اور موسم میں مزا دیتی ہیں۔ سننے والے کا جی نہیں بھرتا۔ پکّے راگ راگنیوں میں ہمیں بھی صرف بھیرویں پسند ہے۔ اس لیے کہ محفلِ موسیقی کے آدابِ برخاست کے مطابق اس کے بعد کوئی اور راگ نہیں گایا جا سکتا۔ چنانچہ مارے باندھے ہمیں کسی محفل میں جانا پڑے تو چھوٹتے ہی اس کی فرمائش کر دیتے ہیں۔

★ تو بارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا چھاوناں!

واحد بخش کھوسو ہر بول کے بعد فقط "اُلا" سے کماڈُپوت کی مُشکیں کس کے وادیٔ مہران میں لے آتے۔ ہلی جلی قوّالی کے تیور کچھ ایسے ہوتے تھے :

نصیر احمد خاں : گناہ کا اپنے معترف ہوں، یہ التجا ہے کہ پاکباز
کرو مجھے سنگسار لیکن گناہ کی داستاں تو سُن لو !

چاچا فضل دین : بارھیں برسیں کھٹّن گیا تے کھٹ کے لیاندا اچھاواں، اُلا !

حق نواز چیمہ : مُوسیٰ سے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے
جانے میں قدم اور تھے آنے میں قدم اور

کورس : بارھیں برسیں کھٹّن گیا تے کھٹ کے لیاندا گنھٹیا، اُلا !
(تو بارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا گٹھیا، اُلا !)

عباد الرحمٰن قالب : یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

کورس : بارھیں برسیں کھٹّن گیا تے کھٹ کے لیاندا بٹیرا، اُلا !
(تو بارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا بٹیر، اُلا !)

سامعین میں سے اگر دیوار اور میز کرسیوں کو نکال دیا جائے تو جانداروں میں لے دے کے صرف ہم تھے جو اس بے زبان زُمرے میں آسکتے تھے۔ سبھی حاضرین آرکسٹرا کے سرگرم رکن تھے کہ اسی میں عافیت تھی۔ دوسروں کی آواز کے عذاب سے بچنے کے لیے ہر شخص اپنا ذاتی شور سُنتا اور کانوں میں انگلیاں دے کر گاتا تھا۔ کچھ دن ہماری موجودگی بارِ خاطر ہُوئی۔ مُنہ سے تو کسی نے کچھ نہ کہا، لیکن بیزار نگاہیں پکارتی رہیں :

چلے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ایک دن دبے لفظوں میں ہم سے شکایت بھی کی کہ آپ کے اس طرح کام کرنے سے ہمارے شور شرابے میں خلل واقع ہوتا ہے ! ہم کٹے کٹے سے رہنے لگے تو بولے آپ کیوں دِل چھوٹا کرتے ہیں ؟ اور انھوں نے ہمیں منہ سے سیٹی بجانے اور اس پر میرا بائی کے دوہے پیش کرنے

کا پروانۂ رامش گری دے دیا، بشرطیکہ وہ پنجابی ٹپّے کی دُھن میں ہوں تاکہ تسلے والے بھائی کو تکلیف نہ ہو اور وہ حسبِ معمول اپنے جھانویں سے دِلوں کا میل دُور کرتا رہے۔ چاچا فضل دین کبھی خود ہی بے سُرا ہو جاتا تو تسلا پھینک کر کہتا کہ ٹپّہ کا سماں تو اس وقت بندھتا ہے جب دُور سے ہر بول کے ساتھ ڈاچیوں اور گائے بکریوں کے گلے میں پڑی ہوئی ٹمیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آتی رہے۔

فضل دین چاچا کو وہ لوگ بھی چاچا کہتے تھے جو خود تایا کہلانے کے لائق تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ پہلی ملاقات ہوئی اور ہم نے نام پوچھا تو اس نے سارا آموختہ سُنا دیا تھا: "موضع تھوٹیاں، دربار بابا حضرتِ شاہ کلی، علاقہ تھانہ علی پور چھٹہ، ضلع گوجرانوالہ، نزد لاہور، معرفت اللہ دِتّہ سائیکل پنکچر مستری پہنچ کر چودھری فضل دین پنشن یافتہ لانس نائک کو مِلے۔"

بندۂ مزدور کے اوقات

بینکوں میں ان دنوں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک لگاتار کام ہوتا تھا، جب کہ گورنمنٹ دفاتر کے اوقاتِ بے کاری نو سے ساڑھے چار تک تھے۔ اوّل تو رات گئے تک کام کرنے کی کوئی شکایت نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی سر پھرا آواز اٹھاتا تو اس کا تبادلہ بارش میں چنگاتنگ، گرمی میں سکھر اور سردی ہو تو کوئٹہ کر دیا جاتا تھا جو اس زمانے میں شوریدہ پُشت بینکروں کے لیے کالے پانی کی حیثیت رکھتے تھے لیکن جو گردن زنی ہوتے، ان کو "لائن حاضر" کر دیا جاتا تھا۔ یہاں ان کے طُرّہ پُرپیچ و خم کے سارے پیچ و خم ایک ایک کر کے نکالے جاتے۔ ہمیں یاد نہیں کہ دو ڈھائی سال تک ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے کبھی چودہ گھنٹے سے کم کام کیا ہو۔ دن اور رات کا فرق مِٹ چکا تھا۔ اور اگر تھا تو، حضرت امیر مینائی کے الفاظ میں، صرف تذکیر و تانیث کی اُلٹ پھیر تک:

دِن مرا روتا ہے میری رات کو
رات روتی ہے مری دن کے لیے

دوپہر کو کم ہی لوگ کھانا کھاتے تھے۔ گھر گھر سے سائیکل پر کھانے کے ڈبّے بٹور کر لانے والوں نے اپنی سروس اور باری باری ہر ایک ڈبّے سے بوٹیاں غائب کرنے کا دھندا شروع نہیں

گیا تھا۔ عملے کے بیشتر افراد، منجملہ راقم آثم، ایرانی ہوٹلوں کی طرف چہل قدمی کر کے بے کھائے پیئے واپس آجاتے۔ جہاں تک ہماری عادات کا تعلق ہے، ہوا خوری کا یہ سلسلہ ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ آج بھی تم نے کھانا کھایا یا نہیں۔ آٹھ نو بجے رات تک پیٹ کا الاؤ بھڑک اٹھتا۔ اسی کو دبانے، بہلانے کے لیے دراصل یہ گت ہوتی تھی۔ سبھی بھوک کو نکوٹین یا پان سے بہلاتے رہتے تھے۔ البتہ چاچا فضل دین چوکیدار وُوڈ اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر دو اینٹیں رکھ کر آٹھ بجے مکئی کی ایک روٹی ڈال لیتا تھا۔ لیکن جب تک دفتر میں ایک آدمی بھی خالی پیٹ بیٹھا کام کر رہا ہوتا، چاچا فضل دین لقمہ توڑنا حرام سمجھتا تھا۔ گیارہ بجے سے پہلے اسے شاذ ہی روٹی نصیب ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سب کو اپنے ہاتھ سے بلیر کے بُھٹے بھون کر کھلاتا اور اپنے گاؤں کے بُھٹوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتا۔

کچھ دن بعد ایسا بجوگ پڑا کہ سگرٹ پینے کی بھی استطاعت نہ رہی۔ استطاعت سے ہماری مراد ساٹھ ستر ہے کہ یہی ہمارا اوسط تھا۔ بُری بات اور بُری عادت کا صحیح لطف و لذّت دراصل کثرت و زیادتی (EXCESS) میں ہی آتا ہے۔ صاحبو! اعتدال پر اتنا ہی اصرار ہے تو نیکی میں کرو۔ کون روکتا ہے؟ ازبسکہ اعتدال کو طبیعت نے کبھی قبول نہ کیا، ہم نے سگرٹ کم کرنے کے بجائے بالکل چھوڑ دیئے۔ اور جوشاندے سے کشید کی ہوئی ملباری چائے کے قدح کے قدح چڑھا کر بھوک اور نیند کو بھگتے رہے۔ چائے دراصل ایجاد بھی اسی کارِ خیر کے لیے ہوئی تھی۔ نشاط سے کس روسیاہ کو غرض تھی۔ کہتے ہیں کہ چھٹی صدی میں ایک تپسوی بودھی دھرم جنوبی چین گیا اور وہاں ایک دیوار پر نگاہ جما کر "دھیان" کرنے لگا۔ ایک روز دھیان کے سمے آنکھیں آپ ہی آپ نیند سے مُند گئیں اور ساری تپسّیا کھنڈت ہو گئی۔ کرودھ میں آکر اس دھیانی نے وہیں اپنے پپوٹے کاٹ کے پھینک دیئے تاکہ آنکھیں کبھی بند ہی نہ ہو سکیں۔ زمین پر جس جگہ وہ پپوٹے اور خون کے قطرے گرے، وہاں نئی کونپلیں پھوٹ نکلیں جنھیں اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا نام چائے پڑا۔ اسی کی یاد میں زین مت والے آج بھی دھیان اور اُپاسنا سے پہلے چائے کا گھونٹ ضرور لیتے ہیں۔ سو ہم بھی اس گھڑی اسی امرت کے گھونٹ لے لے کر اس رات کی باتیں سُنا رہے ہیں۔

ہم نے اہلِ زبان سے کیوں شادی کی

میرِ محفل کا پورا نام (سابق) سیکنڈ لفٹیننٹ نواب محمد عمر مجاہد نخاس پاشا کُنجو تھا۔ بینک میں تازہ وارد تھے۔ خود کو کرناٹک کا نواب بتاتے تھے۔ تیور اور طنطنہ سے نواب ہی لگتے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی قلمرو کے نام سے پہلے انھوں نے "کر" کا اضافہ کر لیا ہے۔ حیدرآبادی اُردو میٹھے مدراسی لہجے میں بڑے فرّاٹے سے بولتے تھے۔ ق کا تلفّظ خ کرتے تھے۔ کمسن حسینہ کو قمری اور قمری کو خمری کہتے تھے۔ اکثر خان سیف الملوک خان کا مذاق اڑاتے کہ وہ خوبانی کو خرُبانی کہتا ہے اور حق نواز چیمہ قربانی کو کربانی! خود قربانی کو خرُبانی کہتے تھے!! اپنے نام کا تلفّظ ین۔ یو۔ یم۔ ین۔ پی۔ کنجو فرماتے تھے۔ ایک دن ہم نے چھیڑا، سرکار نے سارا کرناٹک چھوڑ کر یُوپی کی خاتون سے کیوں شادی رچائی؟

"کھٹا سالن، اِملی چاول اور بگھارے بیگن کھاتے کھاتے دانت اُمل گئے تھے۔ اِتّفاخ سے مُلاخات ہو گئی۔ سلیخہ مند خاندانی خمری، لکھنوی خلیہ خورمہ پکانے میں طاخ، خبُول صُورت، امورِ خانہ داری کے خاعدے اور خانون سے واخِف ــــ اور کیا چاہیے؟" وہ خوخیائے۔

"تو گویا یہ آپ کے کچھ، کڑا، کیش، کنگھی، کرپان ہوئے۔" ہم نے کہا۔

"مگر آپ بھی تو مارواڑی رانگڑ ہیں۔ آپ نے اہلِ زبان سے کیوں عخدِ نکاح کیا؟"

"ہم نے تو یہ گستاخی محض اُردو زبان سے اپنی جھجک نکالنے کے لیے کی تھی۔"

"ایہہ گل ہوئی جواناں والی!★" چاچا فضل دین نے ہماری لسانی منصوبہ بندی کی داد دی۔

(کر) ناٹک کا نواب

بینک میں کنجو شہزادہ گلفام کہلاتے تھے۔ اکہرا بدن، صندلی رنگ اور باتوں میں بھی اسی کی خوشبو۔ تیکھے نقوش۔ تیتّیے جیسی کمر۔ ناک اتنی لمبی اور نکیلی کہ اسے منگنی کی انگوٹھی پہنائی جا سکتی تھی

★ یہ بات ہوئی مردوں والی!

کان پر منّت کی بالی کا رُجھا ہوا سوراخ۔ مُرادی ہوں گے۔ اچھے لباس کے شوقین تھے۔ مشہور تھا کہ سوتے میں بھی کروٹ لینے سے پہلے اپنی مانگ اور پاجامے کی کریز درست کر لیتے ہیں۔ ان کی خوش پوشی، جامہ زیبی اور بربادی میں نسوانی توجہات کو بڑا دخل تھا۔ مئی جون میں بھی گلے میں "پولکا" بُندکیوں کا سِلک اسکارف باندھتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ٹوکا کہ آپ کی ½ تنخواہ بزاز اور ½ درزی کی نذر ہو جاتی ہے۔ پچھلے مہینے آپ نے اپنے خانگی بجٹ کے دوسرے پلڑے میں ہماری حقیر تنخواہ کا پاسنگ ڈالا، تب کہیں ڈنڈی برابر ہوئی۔ ارشاد فرمایا، میلے، پُرانے دھرانے کپڑے پہننے کا حق صرف کروڑپتی سیٹھوں کو پہنچتا ہے۔ نوکری پیشہ آدمی کے تو، اللہ رکھے، یہی اللے تللے رہیں گے۔ مدراسی زبان میں کہاوت ہے، ہیجڑے نے ساری کمائی، مُوچھ مُنڈائی میں گنوائی۔ ہمارے قبیلہ کا عقیدہ ہے کہ جو روپیہ چھوڑ کر مرے اس کے نطفہ میں فرق ہے۔ میرے والد نے نہ جانے کیسے آٹھ ہزار روپے جمع کر لیے تھے جن سے ایک کوآپریٹو بینک میں اکاونٹ کھلوا لیا۔ وہ تو اُن کے مرنے سے ایک ہفتے پہلے بینک فیل ہو گیا ورنہ سارا شجرہ خاک میں مل جاتا۔ مولا نے بڑا فضل کیا۔

ہر شخص کی اپنی مخصوص چال اور آواز ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا معجزہ ہے کہ بعینہٖ ایسی چال اور آواز دنیا میں نہ کسی کی ہوئی، نہ ہو گی۔ لیکن جیسی عجیب و غریب چال ان حضرت کی تھی، ہم نے اس سے ملتی جُلتی بھی نہیں دیکھی۔ تقریباً حالتِ رکوع میں چلتے پھرتے تھے۔ مگر ہاتھوں کی پوزیشن ایسی ہوتی تھی گویا آندھی میں سائیکل کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑے چڑھائی چڑھ رہے ہوں۔ بہت دن بعد معلوم ہوا کہ ہارمونیم کے رسیا ہیں۔ اور ہمہ وقت اسے گود میں اُٹھائے اُٹھائے پھرنے سے اسی پوز میں اکڑ کر رہ گئے ہیں۔ ہارمونیم اُٹھائے ہوئے نہ ہوں تو توازن قائم رکھنا دشوار ہو جاتا۔ قدم قدم پر ڈگمگاتے، لڑکھڑاتے۔ کبھی اُلار ہو جاتے۔ اکثر فرماتے کہ پورے صوبہ مدراس اور کرناٹک میں ہارمونیم پر مجھ سے زیادہ تیز کوئی ٹائپ نہیں کر سکتا۔ ہارمونیم اتنی برق رفتاری سے بجاتے کہ انگلیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ دُھن بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ فی منٹ ڈیڑھ سو الفاظ کا خون کر لیتے تھے۔

قرض لینے میں انھوں نے کبھی بُخل سے کام نہیں لیا۔ کہتے تھے کہ اُدھار سے اخوّت د

مساوات بڑھتی ہے۔ اس زمانے میں سب کا حال پتلا تھا۔ کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند۔ جس کو دیکھو، پاؤں چادر سے گھٹنوں تک باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ایسوں سے قرض لینا، لے کر نہ دینا اور پھر لینا ـــــ یہ انُہی کا جگرا تھا۔ کسی کا ہاتھ تنگ ہوتا تو یار لوگ الٹا اسی سے قرض مانگنے لگتے ـــــ اس ڈر سے کہ کہیں پہلے وہ نہ مانگ بیٹھے۔ اور جب کوئی واقعی قرض مانگتا تو لوگ اپنی اپنی مشکلات کا ذکر اس انداز سے کرتے کہ مانگنے والا بھی آبدیدہ ہو جاتا۔ ہمدردی و دلسوزی کا اس سے زیادہ مؤثر طریقہ ہنوز ایجاد نہیں ہوا۔ برصغیر کے بعض پسماندہ علاقوں میں اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ برادری کی بڑی بوڑھیاں کسی کے ہاں غمی میں شریک ہوتی ہیں تو لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ کے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور اپنے اپنے پیاروں کے نام لے کر بَین کرتی، دھاڑتی ہیں۔ سب اپنے اپنے مُردوں اور مُردوں کی خوبیاں بکھان کر کے خشک آنسوؤں سے روتی ہیں۔ اگر کوئی ناواقفِ حال پہنچ جائے تو وہ ایک گھنٹے بَین سُن کر بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس مجلسِ آہ و بُکا میں دو ڈھائی سو مُردوں میں سے آج کا مرحوم خصوصی کون ہے! ان دِنوں بینک میں بھی یہی رسم و راہ دلسوزی و دستگیری تھی۔ اپنی اپنی عندلیب سے مِل کے کچھ دیر آہ و زاریاں کرنے کے بعد سب اپنی ضرورتوں اور آرزوؤں کو اجتماعی قبرستان میں دفنا دیتے۔ مگر اس طرح کہ دوسرے دِن چھنگلیا سے کھود کر نکالی جا سکیں۔

کنجُو قرض مانگنے سے پہلے اپنی متروکہ جاگیر "زمینات" کا ذکر ضرور کرتے اور رقبہ کو دوہراتے تہراتے اور چوراہتے رہتے۔ ہر دفعہ، پندرہ بیس ہزار ایکڑ کا اضافہ ہی نہیں، بلکہ اپنے غلّہ خیز بیان سے زمین کی فی ایکڑ پیداوار کو بھی دوچند، سہ چند کر دیتے۔ کرناٹک کے سنگلاخ علاقوں میں گھاس کا تنکا بھی نظر نہیں آتا، وہاں نہ صرف گنّے کے جنگل کے جنگل کھڑے کر دیتے، بلکہ انُ میں جنگلی ہاتھیوں اور "خمریوں" کے ریوڑ بھی گھُسا دیتے۔ جس دن ہم سے ہماری ساری تنخواہ بارہ گھنٹے کے لیے قرض لی ہے، اس وقت ان "زمینات" کا رقبہ پھیل کر اتنا ہو گیا تھا کہ سموچا صوبۂ سندھ اس میں سما جائے اور پھر بھی اتنی گنجائش رہ جائے کہ پنجاب کے پانچ چھ اضلاع، محکمہ انہار و پٹواریان بدزبان سمیت، اس میں کھپ جائیں۔ اگلے اتوار کو پاک بوہیمین کافی ہاؤس میں مرزا نے پوچھا "صاحب! آپ نے کرناٹک کی جدّی جائداد کا کلیم کیوں نہیں داخل کیا؟"۔ جھنجھلا کر بولے "مجھے کیا باولے

چوہے★ نے کاٹا ہے؟ میں کلیم میں قلعے کے بدلے کوارٹر نہیں لینا چاہتا۔ ریاستیں بھی کہیں راشن کارڈ پر الاٹ ہوئی ہیں! افسوس، آپ کو کبھی رئیسوں سے واسطہ نہیں رہا۔ پوتڑوں کے رئیسوں کی خوبو سو سال تک نہیں جاتی۔"

"اگر لفظ 'خو' نکال دیں تو مجھے آپ کا دعویٰ حرف بحرف تسلیم ہے۔" مرزا نے اتمام حُجت کیا۔

انڈین آرمی سے ڈِسچارج ہوئے سات آٹھ سال ہونے کو آئے تھے لیکن سرفروشی و سرکوبی کی آگ اپنے ۳۶ اِنچ سینے میں دبی رکھتے تھے۔

میان سے نکلی پڑے ہے مری تلوار ہنوز

ایک دن کہنے لگے کہ جب میں کنارا بینک لمیٹڈ میں چیف کیشیر تھا تو تین ڈاکے پڑے۔

"ڈاکے؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں! بینک پر ڈاکے نہیں تو کیا اولے پڑتے؟"

اپنی حاضر جوابی سے ہمارا دریدہ دہن بند کر کے انھوں نے بڑی تفصیل سے پہلے ڈاکے میں اپنی حاضر دماغی کا قِصّہ سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جیسے ہی ڈاکو نے اپنا ۳۸ بور کا پستول نکالا، انھوں نے بڑی دلیری سے ایک ایک ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈّی اس کی کنپٹی پر رکھ کر پستول لُوٹ لیا۔

اِندر کا اکھاڑا

۱۹۴۰ء میں فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے کوچین (کیرالہ) ہو آئے تھے کہ زندگی کا بھروسا نہیں۔ مرنے کے بعد گناہ کا موقع تو جنت میں بھی نہیں ملنے کا۔ بینک میں روز شام کو اندر سبھا سجاتے اور ارنا کلم کی ناریوں کی چھب دِکھلاتے۔ بے کہے بچے کی گیند کی طرح ٹپّا کھاتی ہوئی ورادڑی کا ٹھی،

★ حیدر آباد دکن میں کسی زمانے میں طاعون کی وبا آئی تھی۔ محلّے کے محلّے صاف کر گئی۔ اسی زمانے میں محاورے میں کتّے کی جگہ چوہا دَر آیا۔

کافی جیسی مہکتی دہکتی رنگت، اُبھرے اُبھرے جامنی ہونٹ، جلد جیسے کنواری تھاپ تلے کسی ہوئی ڈھولک۔ سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں۔ کہتے تھے کہ وہاں کوئی گرہستن، شریف زادی اپنے سینوں اور پیٹ کو نہیں ڈھانکتی۔ اندھیرے اُجالے کوئی عورت چولی پہنے ہوئے نظر آجائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بِکاؤ مال ہے اور دعوتِ شب باشی دے رہی ہے۔ بھلے گھرانوں میں وہ انگ جو رُوپ کی راجدھانی ہیں کپڑے کی صنعت کے مرہونِ منّت نہیں ہوتے۔ ہر چند وہ کوچین میں تین رات سے زیادہ نہیں ٹھیرے، لیکن اس میں ہی جو کچھ ان کی چشمِ تماشا نے دیکھا وہ ہمارے لب پر نہیں آسکتا۔ روز ایک انگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھتے۔ عجلت میں ہوں تو اچھے مال کی مُشکیں باندھ کر الگ رکھ دیتے۔ ہر شام ایک نئی "خمری" کا سراپا کھینچتے اور ہماری آتشِ شوق کو پیٹرول سے بجھانے کی کوشش کرتے۔

مدراس چھوڑے مُدّت ہو چکی تھی، لیکن اس کی بُرائی کسی طور گوارا نہ تھی۔ ایک دن مدراسی کافی، لُنگی، پاپڑ، سر رادھا کرشنن اور اچار کی تعریف کرتے کرتے ان کے مُنھ سے نکل گیا کہ بمبئی والے گنواروں کی طرح چیخ چیخ کر بولتے ہیں اور بمبئی کے علاوہ ہر شہر کو — لندن، نیویارک اور پیرس کو بھی — 'باہر گاؤں' کہتے ہیں۔ اس کا جواب، بمبئی کے نمائندے، سکنہ کراچی، عبدالرحمٰن حاجی قاسم سُتلی والا نے یہ دیا کہ مدراس میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی تہمد باندھے سڑک پر ننگے پیر گھومتا ہے۔ اور عورتیں ساری کے نیچے پیٹی کوٹ نہیں پہنتیں! اس پر دونوں میں خوب دھر ٹیک ہوئی۔ ایک دوسرے کو اس بے دردی سے اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگے جیسے قُلی مال گاڑی میں سے وہ پیٹیاں پھینکتے ہیں جن پر FRAGILE لکھا ہوتا ہے۔ جب دونوں میں پھینکنے اور پھنکوانے کی سکت نہ رہی تو ایک دوسرے سے گتھم گتھّا ہو کر فرش پر پڑ رہے۔ دونوں صُوبے کسی طرح علیحدہ ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بالآخر ہم نے یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کرایا کہ صاحبو! ہمیں دیکھو۔ ہمارے وطن مالوف و متروک راجستھان میں یہ تمام قابلِ ضبطی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ہم نے تو کسی باہر گاؤں والے کا سر نہیں پھوڑا۔ ہری مرچ کے اچار اور کچّی راجستھانی چُنری سے گال لال گُلال، گلے سے ایک بالشت نیچی چولی جس کی گھاٹی میں پھسلنے کے لیے نگاہ بھر کا راستہ، سنگھاڑا سے ٹخنے سے ایک ہاتھ اونچا لہنگا

اور پھر رات ڈھلے کچھ جگمگ جگمگ ہووت ہے۔ کوئی اوڑھے چُنریا سووت ہے"۔ ہم نے تو اِن تبرکات پر کبھی ہاتھا پائی نہیں کی"۔

فرمایا "اصل لڑائی تو ہاتھ پیر کی ہوتی ہے۔ یہ رذیلوں کی طرح زبان چلاتا ہے"۔

ظاہراً لااُبالی پن اور ہُوحق کے باوجود اپنی تندرستی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُلٹی سیدھی یوگا ورزشیں کرتے۔ سورج نکلنے سے پہلے، کنول آسن میں دَم سادھے، اپنی ناف پر نگاہ جمائے کائنات پر غور و فکر فرماتے۔ اکثر نصیحت کرتے کہ بے ضرورت سانس نہ لو۔ سانس بچاؤ۔ کل کام آئے گا۔ جتنے سانس کم لوگے، اتنے ہی عدد سانسوں سے عمر بڑھ جائے گی۔ ان کے اس عمل سے دفتر میں آکسیجن کی کافی بچت ہوتی تھی۔ نہار مُنھ دو گلاس نمک کا پانی پی کر قے کرتے۔ پھر نتھنے میں سُوت کی ڈوری کا فتیلہ چڑھاتے، یہاں تک کہ اس کا سِرا حلق سے برآمد ہو جاتا۔ پھر اسے ہولے ہولے کھینچ کر نکال لیتے۔ اس عمل کو دُہرا کر دونوں نالیں صاف کرتے۔ یہ انہی سے معلوم ہوا کہ اس سے دماغ روشن اور روح بالیدہ ہوتی ہے۔ ورنہ ہم تو اب تک اسی مغالطے میں تھے کہ ناک صاف کرنے سے صرف ناک ہی صاف ہوتی ہے۔ اکثر ہمیں تلقین کرتے کہ کامیابی کے لیے صحّت، محنت، دیانت اور ذہانت ازبس ضروری ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں اپنی ذات کو پیش کرتے۔

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

ان کی ذات سے چھوٹے بڑے جتنے بھی اسکنڈل منسوب تھے، ان سب کے خالق و راوی، مُفتری و مُتّہم وہ خود ہی بتائے جاتے تھے۔ اپنے بارے میں کی گئی بے بُنیاد قیاس آرائیوں کی وہ ہمیشہ تصدیق کر دیتے تھے۔ اپنی شان میں تمام گستاخیوں اور شرارتوں کا سَرچشمہ دراصل وہ خود تھے۔ ایک عمر ایسی بھی آتی ہے کہ آدمی کو تُہمت سے بھی یک گونہ خوشی حاصل ہوتی ہے کہ چلو اس لائق سمجھا تو! بے شمار تہمتیں اپنے اوپر لگالی تھیں جن کی تعداد جوشؔ صاحب کی خود نوشت "شہوانحمری" کے ۱۸ معاشقوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔ جوشؔ صاحب نے تو ۱۸ پر پہنچ کر غالباً اس لیے "ڈکلیئر" کر

دیا کہ محمود غزنوی کے حملوں کی کُل تعداد ۷ا تھی۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ جوشؔ صاحب سومنات میں بلغیر گُرز کے داخل ہُوئے۔

مشہور تھا کہ غزالوں کے تعاقب میں وہ خُتن سے بھی آگے نکل چکے ہیں۔ "پلے ٹِمے"، پُرسُرخ روشنیوں والے کُوچے میں اپنا دل "پشوری" کر لیتے ہیں۔ حالانکہ کراچی کے "بازارِ حسن" میں جتنی بدصورتی فی مکعب انچ کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اس کی مثال دنیا میں شاید ہی ملے۔ سوائے کراچی ٹی۔ وی کے۔ لیکن موصوف اس بابِ خاص میں رنگ، نسل، مذہب، زبان، جُثّہ و جسامت کی تفریق سے بھی بالاتر تھے۔ تیغ تو تیغ ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے! بلکہ اس میدان کے مردِ کہن سال چچا ابتسام بیگ کی صوبائی عصبیّت کی کھلّم کھلّا مذمت کرتے کہ "بڈّھا ہو گیا پر 'ٹھرک' نہیں نکلی۔ چلو معاف کیا۔ مگر رنڈی کے آداب سے بھی آشنا نہیں۔ اس کوچے میں سارے فرق مٹ جاتے ہیں۔ آوارگی میں بھی صوبائی تعصّب برتتا ہے۔ اپنے آبائی صُوبے کی طوائف کے سوا کسی اور کی بے حُرمتی نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ بالکل کھنڈر ہو چکی ہے۔ جس میں اب صرف چمگادڑیں اُلٹے پَیر کرکے لٹک سکتی ہیں۔ ایک دن میں نے بہتیرا للچایا کہ ہیرا منڈی سے کچھ ادھ کچرا، کچھ ادھ کُترا مال آیا ہے۔ اپن کے ساتھ جاپانی روڈ چلو۔ پر بیگ چچا نہیں مانا۔ کہنے لگا نہیں۔ مَیں تو اسی کے پاس جاؤں گا۔ اس نے میرے اچھے دِن دیکھے ہیں!"

خواص چھوارا نکاح

سُنا ہے عورت زندگی میں صرف ایک بار محبّت کرتی ہے۔ اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ عورت ایک ہی مرد سے زندگی میں ایک دفعہ سے زیادہ محبت نہیں کرتی ۔ اسے ہمارا سوئے زن (دوسرا املا بھی درست ہے) ہی سمجھئے، ورنہ ہم تو مَردوں کے بارے میں بھی کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ جو دِن دِل کو بے مہار چھوڑنے کے تھے، اس زمانے میں قریبی اور دُور کے بزرگوں نے دعاؤں اور پند و نصائح سے ہماری جنسی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ مرد بھی عشق عاشقی صرف ایک ہی مرتبہ کرتا ہے۔ دوسری مرتبہ عیاشی اور اس کے بعد نِری بدمعاشی۔ بقول پروفیسر

قاضی عبدالقدوس، ایم اے، انسان خطا و نسوان کا پُتلا ہے! لیکن نحاس پاشا کنجُو کے ہر معاشقہ میں وارفتگی وجنوں کا یہ عالم گویا یہ پہلی اور آخری وارداتِ قلبی ہے۔ اس کے بعد خودکشی کریں گے۔ اور اگر اس میں کامیاب نہ ہو پائے تو نکاح کریں گے۔ چنانچہ تمام عمر خودکشی اور نکاح کی سرحدوں پر ندھا بھینا کھیلتے رہے۔ ایک دن ڈینگ مارنے لگے کہ یہ میرا تیسرا نکاح ہے۔ عرض کیا ہمیں تو ایک بیوی بھی زائد از ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن شرع میں چونکہ ایک سے کم، یعنی بٹر"یا ٹوٹے" کی اجازت نہیں، اس لیے ازدیادِ نعمت کے شکران دُھگتان کے سوا چارہ نہیں۔

قہقہے کے بعد فرمایا، دیہات میں اونٹ کو کوئی بھی مرض لاحق ہو ــــــ دست، قبض، بخار، گٹھیا، اپھارا، رتوندی ــــــ ہر مرض کی دوا ایک ہی ہے: لوہے کی دہکتی سلاخ سے داغ دیا جاتا ہے۔ جاڑے میں مست ہو جائے تو داغ دیتے ہیں۔ مست نہ ہو، تب بھی داغ دیتے ہیں کہ سُست کیوں ہے۔ اسی طرح اپنے ہاں ہر مرض کا علاج، ہر فکر کا نکاس، نکاح ہے۔ ایک سے افاقہ نہ ہو، قرار نہ آئے تو دوبارہ، سہ بارہ داغتے ہیں۔

... نہ مرا عشق فرشتوں جیسا

کچھ دن سے سننے میں آرہا تھا کہ طبیعت پھر بہار پر ہے۔ ایک بیاہی تیاہی پڑوسن کے گلُوں میں رنگ بھر رہے ہیں۔ دن بھر لوہار کی دھونکنی کی طرح آہیں بھرتے اور ڈوب کر عاشقانہ اشعار پڑھتے۔ پڑھتے وقت سکتہ شعر میں پڑتا تھا۔ اور بعد میں خُود پر۔ تسخیرِ زن کے لیے ایک سنیاسی بابا کا دیا ہوا کاجل لگانے لگے تھے۔ ایک دن ہم نے ٹوکا کہ آپ کی مطلوبہ تو شادی شدہ ہے۔ بولے جبھی تو کاجل لگانا پڑ رہا ہے۔ ورنہ سرمہ ہی کافی تھا۔

ان کے میعادی عشق کی مُدّت ایک گھنٹے سے ایک سال تک ہو سکتی تھی۔ لیکن اس ایک گھنٹے میں، جس میں ۳۶۰۰ لذیذ سیکنڈ ہوتے ہیں، وہ بھُوت پریت کی طرح چمٹ جاتے تھے۔ بیان کرتے تھے کہ کوہِ نیلگری کے دامن میں ایک پہاڑی "خرُبی" نے ان سے دغا کی تو انھوں نے وہیں کلہاڑی سے ناک کاٹ لی۔ اس پر چاچا فضل دین چوکیدار نے ٹوکا کہ بھلا کلہاڑی سے ناک کیسے کاٹی جا سکتی

ہے۔ٹانگ البتہ کاٹ سکتے ہیں۔بولے تو پھر ٹانگ ہی کاٹی ہوگی۔کچھ کاٹا ضرور تھا۔

حسینوں کی بھاری اکثریت ہو اور کنجوُ صرف ایک کی اقلیت میں ہوں تو ہمت نہیں ہارتے تھے۔قصاب کہیں گوسفندوں کی کثرت سے گھبراتا ہے؟ یا بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ہاتھی کے سامنے جتنی دفعہ کیلا پھینکو سُونڈ سے اُچک لیتا ہے۔اُن دِنوں کراچی میں پاوندے آئے ہوئے تھے۔ان کے گھر سے دو فرلانگ دُور انھوں نے اپنی پیوندلگی چھولداریاں گاڑ رکھی تھیں۔ایک پاوندے کی بیوی پر جان و مال سے فریفتہ ہو گئے۔کہتے تھے جب وہ چمکیلی دھُوپ میں ایلومینیم کی اُلٹی پتیلی سر پہ اوڑھ کے پانی بھرنے نکلتی ہے تو بالکل ملکہ معلوم ہوتی ہے۔پشمینہ کے خیمہ میں رہتی ہے۔ایک دن بیٹھے بیٹھے کچھ خیال آیا تو اپنی کرسی پر سے گدّی نکال کر ہماری طرف پھینک دی کہ جب وہ پیال کے بچھونے پر سوتی ہے تو مَیں اس گدّی پر کس طرح بیٹھ سکتا ہوُں۔وہ مُنھ اندھیرے فریج جالی کا گٹھّر سر پر رکھ کر اکیلی بیچنے نکل جاتی۔شوہر دن بھر رائفل گلے میں لٹکائے بکری اور مُرغیوں کی رکھوالی کرتا۔سُرخ پشواز میں خنجر اُڑسے رکھتی تھی۔تیسرے چوتھے، نخاس پاشا کنجوُ اس سے ایک آدھ گز کپڑا خرید لیتے، جس کا لنگوٹ بھی نہیں بن سکتا تھا۔اس لیے کہ جہاں تک ہماری عقل کام کرتی ہے، جالی کا لنگوٹ صرف مچھروں سے کُشتی لڑنے کے لیے کسا جا سکتا ہے۔دِن بھر جالی پر ہاتھ پھیرتے اور سونگھتے رہتے۔اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری۔

وہ اُن میں سے تھے جو کیکٹس پر لرزتے ہوئے قطرۂ شبنم پر اپنی زبان رکھ دیتے ہیں۔صوفیائے کرام نے نفس کی تین قسمیں بتائی ہیں۔نفسِ امّارہ ——— وہ نفس جو لذّاتِ جسمانی میں کھو گیا۔نفسِ لوّامہ ——— وہ کہ جس کی لذّتوں پہ زوال آیا اور اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہے۔نفسِ مطمئنہ ——— وہ نفس جو اپنے آپ سے شرمسار نہیں، مطمئن ہے۔ہمارا خیال ہے کہ لمس کی بھی یہی قسمیں ہوتی ہیں۔کیسانووا، خیّام، فالسٹاف، سُولی پر آخری سانس تک انا الحق کہتا ہوا لبِ منصورؔ دردِ زہ میں جان سے گزر جانے والی ماں، قلوپطرہ اور کنجوُ ——— لمسِ مطمئنّہ کے مالک ہیں۔جب کہ گوتم بدھ، اوتھیلو، زلیخا، اور "گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ مَیں" والا جاں دادہ ہوائے سرِ رہ گزار غالبؔ ——— نفسِ لوّامہ کے قتیل ہیں۔اور یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ٹھوس حقیقت جو ماورائے رُوح

ہے ــــ یعنی جسم ــــ اسے صدیوں سے اپنا حق نہیں ملا ہے۔ اسی لیے انسان بیکل ہے۔ دُکھی ہے۔

شہزادہ گلفام لندن اور اُندلس میں

جنگ کے خاتمے پر نہ جانے کس کھاتے میں دو مہینے لندن بھی گزار آئے تھے۔ دس پونڈ کا ایک چیک بھنانے کی تقریب میں ویسٹ منسٹر بینک کا پانچ منٹ تک بہ نظرِ غائر معائنہ فرمایا۔ ان مشاہدات سے دو دو گھنٹے ہمیں مستفید فرماتے رہتے۔ ہر سنیچر کی شام کو ایک نائٹ کلب کے رقص کی ایسی تصویر کھینچتے کہ قیس تو قیس لیلیٰ بھی تصویر کے پردے سے عُریاں نکلتی۔ ایک دفعہ دورانِ رقص ہمیں طنزاً مسکراتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ آپ کیا جانیں؟ ایک ہی جلوے میں آپ جیسوں کی تو نکسیر پھوٹ جائے۔ عینک کے شیشے تڑخ جائیں۔ اِسٹرپ ٹیز ڈانسر کو اس طرح پچولتے کہ وہ بے حجابانہ ان کی آنکھوں کے سامنے کتابِ حسُن کو ورق ورق الٹتی رہتی، یہاں تک کہ ان کا اپنا شیرازہ بکھر جاتا۔ ایک دن ہم نے اسی استعارے کا سہارا لے کر مرزا عبدالودود بیگ کو خال بہ خال، مُو بہ مُو رپورٹ پیش کی اور عرض کیا کہ حضرت کنجُو نے کتابِ حسُن کا مطالعہ بالاستیجاب نہیں، بالاستیعاب کیا ہے۔ فرمایا، جناب کی رپٹ سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ حسُن کے نہیں، صرف عربی زبان کے مزے لُوٹ کے آ گئے۔

عربی کا چٹخارا اپنی جگہ، لیکن کنجُو تو ہسپانوی اور فرینچ زبان کے قتیل تھے، اس لیے کہ واپسی میں میڈرڈ اور پیرس میں ٹھیکی لی تھی۔ ایفل ٹاور کی آخری منزل پر انھوں نے حسیناؤں کی موجودگی میں کانوں میں انگلیاں دے کر اذان دی جو ثانی الذکر نے کانوں میں انگلیاں دے کر سُنی۔ کلِک کلِک کلِک فوٹو پہ فوٹو کھینچے گئے۔ فرماتے تھے "اسپینش بہت ہی آسان زبان ہے۔ میڈرڈ میں میں نے چار سال کے بچّوں تک کو اسپینش بولتے دیکھا" ہماری تشفّی کے لیے انھوں نے اسپینش بول کر دکھائی۔ لگتا تھا سچ مُچ تین برس کا بچّہ بول رہا ہے۔ فرماتے تھے کہ اسپین کی عورت سب سے زیادہ واجب التعظیم اس مرد کو گردانتی ہے جو سانڈ کو زیر کر لے۔ میڈرڈ میں ایک اُندلسی حسینہ کو گورے گورے ہاتھوں سے

بڑا گوشت بیچتے دیکھا تو دِل خوں ہو کے رہ گیا۔ حُسن کو وہ حلال کی روزی کماتے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اکثر اس بیل کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے جس کا گوشت وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بیچ رہی تھی۔ ان کا بس چلتا تو حافظ کی طرح خال کے عوض سمرقند و بخارا نہ سہی، کم از کم کراچی میونسپل کارپوریشن کا نظم ونسق اس اندلسی قصائی کے سپرد ضرور کر دیتے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ آخر واجد علی شاہ نے بھی تو بہشتن اور مہترانی کو نواب آب رساں بیگم اور نواب مصفّا بیگم کے خطاب سے نوازا تھا اور دونوں کو داخلِ حرم کر کے اپنی اور مورخین کی دائمی دلبستگی کا سامان فراہم کیا۔

پہلا ایشیائی

اگر مبالغہ اور جھوٹ بولنا، قابلِ دست اندازیِ پولیس جُرم ہوتے تو ان کے ہاتھ میں مستقلاً ہتھکڑی پڑی ہوتی۔ اور ہم نقلِ مجرمانہ میں ساری زندگی حوالات کے بنگلے کے پیچھے مُنھ پہ رومال ڈالے گزارتے۔ تیسرے چوتھے محفل جمتی۔ وہی ہمہمے وہی ہاؤ ہُو۔ ایک دِن ترنگ آئی تو کہنے لگے کہ مَیں پہلا ایشیائی تھا جس نے ۱۹۴۴ء میں رودبارِ انگلستان "کراس" کرنے کی جسارت کی۔ ورنہ اس زمانے میں تو کالوں کو سوئمنگ پُول میں بھی پیر بھگونے کی اجازت نہیں تھی۔ جس وقت انھوں نے کسرتی بدن پہ گریس لگا کے انگلش چینل میں چھلانگ لگائی تو سینکڑوں فرنگی "قمریاں" انھیں سپردِ آب کرنے آئی تھیں۔ اور آئی تھیں بیاہیوں سے زیادہ کنواریاں۔ ایک ڈچز (DUCHESS) تو گلدستہ بھی لائی تھی اور پھونک مار مار کر خوشبو کا رُخ ان کی طرف کر رہی تھی۔ "اس لیے کہ میں پہلا ایشیائی تھا۔۔۔" وہ ڈوور کے ساحل پر پھولدار لنگوٹ باندھے دیر تک اپنے دامنِ صبر کو فرنگی زلیخاؤں سے کھنچواتے، پھٹرواتے رہے۔ اس دن سردی سے سارا سمندر جم کر نیلا تھوتھا ہو گیا تھا۔ موج جہاں تک اٹھی تھی وہیں کے وہیں منجمد ہو کر رہ گئی۔ ایک موج کے بِلّور میں لالچی بگلا مچھلی کی دُم چونچ میں دبائے صاف نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی انھوں نے یا علی! کہہ کے چھلانگ لگائی، برف کی چادر میں ان کی پوری آؤٹ لائن ترش گئی جس میں ان کے ڈنڑ اور رانوں کی مچھلیوں کے اُبھار صاف نظر آتے تھے۔ 'قمریاں' حیرت سے گھور رہی تھیں۔ "اس لیے کہ میں پہلا ایشیائی تھا۔۔۔"

وہ پھولدار لنگوٹ باندھے سرگرم تجلّی تھے کہ ہماری ہنسی نکل گئی۔ انھوں نے خود کو سنبھالا۔ آخر کو گھاگ تھے۔ کہنے لگے، بات ختم ہونے سے پہلے ہی، ہی ہی ہی ہی! اٹھی ٹھٹی کرنا کیا معنی؟ میں کہہ یہ رہا تھا کہ میں پہلا ایشیائی تھا جو انگلش چینل میں چھلانگ لگاتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کا ہیرو

مہینے میں ایک دو بار ایسا بھی ہوتا کہ رات کے گیارہ بج جاتے اور اکاؤنٹ کسی طرح بیلنس ہونے کا نام نہ لیتا۔ حساب کو ہر زاوئے کے سگرٹ کی دھونی اور چائے کے تریڑے دیئے جاتے، لیکن ۲ اور ۲ کسی طرح ۴ نہ ہو پاتے۔ فرق کبھی ایک لاکھ کا نکلتا اور کبھی سکڑ کر تین پائی رہ جاتا جو اس پیشے میں ایک لاکھ سے زیادہ جان لیوا اور جوکھم کا ہوتا ہے۔ یہ فرقِ بارش میں بھیگی ہوئی چارپائی کی کان کی طرح ہوتا ہے۔ ایک پائے پر بیٹھو تو دوسرا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سارے محلّے کے لونڈوں لاڑیوں کو کدوانا پڑتا ہے۔ ایک رات نحاس پاشا کنجُو نے ترس کھا کر چپکے سے اپنی جیبِ خاص سے ایک پیسہ ڈال کر حساب بیلنس کر دیا۔ اس رات تو سب خوش خوش گھر چلے گئے، لیکن دوسرے دن اصل غلطی مل گئی۔ تین ہفتے تک اس پیسے کی وجہ سے سارے بینک کا اکاؤنٹ بیلنس نہ ہو سکا۔ یہ پیسہ مقتول کی پھولی ہوئی لاش کی طرح سطح حساب پر تیرتا رہا۔ اور ہماری راتیں کالی ہوتی رہیں۔ جب ایسی بھاری رات آتی تو کبھی کبھی ایک ڈیڑھ بجے پٹاخے چلنے کی آوازیں آتیں۔ ہوتا یہ تھا کہ نحاس پاشا کنجُو جب عاجز آجاتے تو ہزار ہزار صفحوں کے لیجر اتنے زور سے بند کرتے اور پٹختے کہ پٹاخے چھوٹنے لگتے۔ یہ اعلان ہوتا تھا اس بات کا کہ حساب کتاب جائے بھاڑ میں اب دوسری عالمگیر جنگ سے متعلق آپ بیتی کا ٹریلر دکھایا جائے گا۔ سب اپنے اپنے بلوں سے نکل کر ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ اور وہ اپنے شاہنامہ کے چیدہ چیدہ حصّے سُناتے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ جرمنی کی شکست میں انھوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ سِدّی رزیغ میں ایک کنوئیں کی مُنڈیر کی اوٹ لے کر انھوں نے تھری ناٹ تھری رائفل سے ایک ہی گولی ایسی ماری کہ لُفٹ وافے جہاز کے دونوں پر جھڑ گئے اور وہ پھڑپھڑاتا ہوا پوٹلے کے بل کنوئیں میں آن گرا۔ طبرق میں جنرل

روؔمیل نے اُن سے ٹکّر لی۔ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ طاغوتی طاقتیں ایک طرف، خُدائی لشکر دوسری طرف۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں خُدا کی حمایت میں ایک تقریر کی جس کے بعد بڑا خون خرابا ہوا۔ "گھمسان کا رَن پڑا۔ ایسا کنفیوژن تھا کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ گولی خود کو لگی ہے یا ساتھی کو۔ جدھر نظراں اٹھا کر دیکھو بندوخاں توپاں ٹھائیں ٹھائیں چل رہی ہیں۔ امواتاں، وفاتاں ہو رہی ہیں۔ زندگی میں پہلا موخعہ تھا کہ یک گھنٹے تک عورتاں کا خیال نہیں آیا۔ الاماں! موت کا فرشتہ سرپہ چکرّاں پہ چکرّاں لگا رہا ہے۔ اسپان ٹینکان یک دوسرے کو ٹکرّاں پہ ٹکرّاں مار رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"اسپ؟ گھوڑے؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا ہاتھی ٹکرّاں مارتے؟ فیلاں کا استعمال تو پورس کی وفات کے بعد ہی متروک ہو گیا تھا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ چاروں اطراف، اتواپ گولہ باری کر رہی تھیں۔ تین عدد گولہ جات میرے ڈنڈ پہ لگے"۔

انھوں نے بائیں آستین اُلٹ کر تین نہایت واضح نشان حاضرین کو دکھائے۔ ایسے ہی تین نہایت واضح نشان ہمارے بائیں بازو پر بھی ہیں۔ آپ کے بازو پر بھی ہوں گے۔ مگر، ایں شہادت بزورِ بازو نیست۔ ہم نے پوچھا "تینوں گولے ایک ساتھ لگے" تلملا اُٹھے۔ کہنے لگے "جی نہیں خبلہ! کیو بنا کر باری باری دخول فرمایا تھا"۔ سب نے ہمارے احمقانہ سوال پر زوردار قہقہہ لگایا۔

ہماری اور اُن کی پیشی

ٹیلیفون سے دس منٹ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ کتنے بھی مصروف ہوں —— ہمارا مطلب ہے گپ میں مصروف ہوں —— فون ضرور کر لیتے تھے، خواہ 07 (معلومات) سے یہی پوچھنا ہو کہ یہ ٹیلی فون "ڈیڈ" تو نہیں ہے۔ ڈائل گھماتے گھماتے ان کی فون کی انگلی میں ٹھیک پڑ گئی تھی۔ کہیں بھی سُوراخ نظر آ جائے، اسے گھُمانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ دن بھر گاہکوں سے یا آپس میں گپ کرتے رہتے۔ شام کو چھ سات بجے قمیض کے کف پر اسکاچ ٹیپ سے بلاٹنگ پیپر چپکا کر بیٹھ جاتے۔ "واؤچرز" اور "لیجر" پر تیزی سے دستخط کرتے جاتے اور کف سے

روشنائی خشک کرتے جاتے۔ کچھ دن بعد کسی بدخواہ نے جڑ دی کہ وہ بغیر چیک کیے، اندھا دُھند دستخط کر دیتے ہیں۔ ثبوت میں رجسٹر اور 'لیجر' پیش کیے گئے جن کے ذیلی اندراجات پر چیکنگ کے ٹک مارک (✓) نہیں تھے۔ مسٹر اینڈرسن کے حضور ان کی پیشی ہوئی۔ خوب لتاڑے گئے۔ لیکن باہر آ کر کہنے لگے کہ میں نے جنرل مینجر کا دروازہ ٹھوکر مار کر کھولا۔ (ثبوت میں اپنا جوتا دکھایا جس کی ٹو پر سے پالش ہی نہیں، کچھ چمڑا بھی دو مہینے سے اُترا ہُوا تھا۔) اینڈی (اینڈرسن کا پیار کا نام) بڑے ہی تپاک سے مِلا۔ دیر تک 'ورلڈ دار' کی باتیں ہوتی رہیں۔

دوسرے دن سے انھوں نے اپنے اختیاراتِ خصوصی چاچا فضل دین کو تفویض کر دیے۔ چوکیداری کے علاوہ اب اس کی یہ بھی ڈیوٹی ہو گئی کہ بندوق کو ندیدے بچّے کی طرح چھاتی سے لگائے لگائے شام کو اکڑوں بیٹھا جھوم جھوم کر ہر اندراج کے سامنے چیکنگ کے ٹک مارک لگاتا چلا جائے۔ جب وہ سرگرمِ عمل ہوتا تو ایسا لگتا جیسے 'لیجر' پر آٹا گوندھ رہا ہو۔ بچارا اَن پڑھ تھا۔ اس لیے ایک گھنٹے میں پانچ سو نشان لگا دیتا تھا۔ خود ان کی ہمت ساڑھے تین سو سے زیادہ کی نہیں پڑتی تھی۔ ذمہ داری کا احساس بُری بلا ہے۔

ابھی اس پیشی کے چرچے ختم نہیں ہوئے تھے کہ ان کا پھر چالان ہو گیا۔ چپراسی نے خبردار کیا "بڑا صاب آج شارٹ سرکٹ کی طرلیں چٹر چٹر چنگاریاں چھوڑ رہا ہے۔" نوعیتِ جرم کی یہ کہ انسٹیٹیوٹ آف بینکرز کے زیرِ اہتمام "قومی بچت اور اس کے موثر طریقے" پر مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں نحاس پاشا کنجوُ نے ایک چار سطری قابلِ ضبطی مقالہ جس میں ہمارے زورِ انشا و منشا کا بھی دخل تھا، سُپردِ قلم کیا۔ چنانچہ ہم بحیثیتِ سلطانی گواہ پیش ہوئے۔ رقمطراز تھے کہ حکومتیں اگر نوٹوں پر مناظرِ قدرت، ٹیڑھے میڑھے درختوں اور ناقابلِ مرمت تاریخی کھنڈروں (جن پر سینٹرل بینکوں کے گورنروں کے دستخط اس طرح ہوتے ہیں گویا وہی اس صورتِ حال کے خالق و ذمہ دار ہیں) کے بجائے NUDES★ چھاپنی شروع کر دے تو آج کل کے نوجوان انھیں خود سے جُدا کر کے خرچ کرنے کے بجائے اپنی جیب میں سینہ سے لگائے رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ فی زمانہ، نئی نسل کو فضول خرچی سے باز رکھنے کی یہی ایک

★ NUDES: لباس سے بے نیاز تصویریں

صُورت ہے۔

جلالی وظیفہ اور لال طوطے

دو تین مہینے سے کبُنجو کو خط اور تحریر شناسی کے مطالعہ کی جھک لگی ہوئی تھی۔ شام کو مختلف "ہینڈ رائٹنگ" اور دستخطوں کے نمونے سامنے رکھ کر اپنی قیافہ شناسی کی بنا پر صاحبِ تحریر کے کردار کے ڈھکے چھُپے گوشوں پر روشنی ڈالتے۔ کہتے تھے کہ میں i پر نقطہ لگانے اور t کاٹنے کے انداز سے بتا سکتا ہوں کہ لکھنے والے کے جُوتے کی ایڑی کس طرف سے گھِسی ہُوئی ہے۔ اتوار کو کس وقت سو کر اٹھتا ہے۔ موزے کتنے دن بعد دھوتا ہے۔ گنجا ہے یا کھپریلا۔ بعض اوقات تو سارا چال چلن ایک شوشہ، ایک تشدید میں نچڑ کر آجاتا ہے۔ یہی نہیں۔ یہاں تک دعویٰ کرتے تھے کہ میں نمونے کی چار سطریں لکھ کر دوں اور آدمی نوّے دن تک بالکل اسی طرز میں اس کی نقل کرتا رہے تو اس کا سارا چال چلن خود بخود بدل جائے گا۔ ہم نے بڑی بے صبری سے پوچھا، کیا بال بھی اُگ آئیں گے؟ بولے، یہ بتایئے، جب کشتی ثابت و سالم تھی، جب سر پہ پورے بال تھے تو آپ کو کبھی ان سے کوئی فائدہ پہنچا؟

پھر ایک دور ایسا آیا کہ وہ فکرمند سے رہنے لگے۔ کوچین کی الف لیلیٰ ختم۔ ملیالم گیت موقوف۔ ایک چُپ سی لگ گئی۔ رات کو چار چار بجے تک بینک میں نہ جانے کس اُدھیڑ بُن میں لگے رہتے۔ اور دِن بھر جماہیاں لیتے رہتے۔ اس اچانک تغیر کا سبب پوچھا تو کہنے لگے میرے والد کا سانحۂ ارتحال ہو گیا ہے۔ دوسرے، ایک جِنّی مجھ پر عاشق ہو گئی ہے، جس کا رن میرے سینے کے تین بال سفید ہو گئے ہیں۔ (ریشمی اسکارف ہٹا کر حاضرین کو متذکرہ صدر تین عددِ عشق زدہ بال دکھاتے) جِنّی کے بیٹے کو عربی کا بغدادی قاعدہ پڑھا رہے تھے۔ ایک دن فرمایا کہ تین ماہ پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے ٹاٹ کا کُرتا پہنا۔ بلیر کے باغ میں چالیس رات شیر کی کھال پہ بیٹھ کے جلالی وظیفہ پڑھا۔ ملیالم گالی، پیاز اور لہسن بالکل چھوڑ دیا۔ جِنّی کو بُو آتی تھی۔ کھجُور اور اُونٹنی کے دودھ پر گزارہ تھا۔ اونٹنی کے دُودھ میں ببُول کے کانٹوں اور آک کا رَس ہوتا ہے۔ فاسد خُون اور خیالات کے لیے مصفّی ہے۔ پرندوں کی بولی سمجھنے

لگ گیا تھا۔ منہ سے طبلہ بجاتا تو سارنگی اور پایل کی آواز نکلتی۔ از کجا می آید ایں آوازِ دوست۔ ذرا آنکھ بند کرتا تو بالکل سامنے آکھڑی ہوتی۔

"کون؟" ہم نے بڑی ہی بے قراری سے پوچھا۔

"موت۔ اور کون؟"

جھنجلاہٹ کے بعد قدرے سکوت فرمایا۔ پھر سلسلہ تجلیات کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوا: انتالیسویں شب کو کہ شبِ نیم ماہ تھی، تہجد کے اول وقت کھجور کھا کر گٹھلی تھوکی تو وہیں پیپل کا درخت اُگ آیا اب جو حوض میں چلتے ہوئے فوارے کے اوپر کھڑے ہو کر غسل کرنے لگا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ہر بوند کا ایک لال طوطا بن گیا ہے اور پیپل کے ایک ایک پتے پر بیٹھ کر حمد باری تعالیٰ کر رہا ہے۔

"لال طوطا؟" ہم سے نہ رہا گیا۔

خان سیف الملوک خاں نے ہمیں ٹھوکا دیا۔ کہنے لگے "چپ کر بدبختا! یہاں اور کون سی بات سائنس کے مطابق ہو رہی ہے جو تجھے طوطے کے رنگ پہ اچنبھا ہو رہا ہے۔"

بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا "اذانوں کے وقت ۱۰۱ تعویذ پتنگ کے کاغذ پر زعفران سے لکھ کر، سہاگن کے ہاتھ کے پسے ہوئے آٹے کی گولیوں میں لپیٹتا اور سیٹھ غفار بھائی نے جو فینسی مچھلیاں حوض میں پال رکھی تھیں انھیں کھلا دیتا۔ جرمنی سے ٹیکسٹائل مل مشینری کے ساتھ فانوس اور مچھلیاں ACCESSORIES دکھا کر امپورٹ کی تھیں۔ سب مجھے پہچاننے لگی تھیں۔ دیکھتے ہی دُم ہلاتی آتی تھیں۔"

"چالیس دن بعد پردۂ غیب سے کچھ ظہور میں آیا؟"

"آیا۔ سب مچھلیاں مر گئیں۔ مالیوں نے مجھے دھر لیا۔ ڈھائی سو روپے دینے پڑے۔ اسے شوت کہہ لو۔ چاہے قصاص کہہ لو۔ اب ایک سفلی عمل پڑھ رہا ہوں۔ صبح بھنے کپورے کھاتا ہوں۔ بینک سے صبح چار بجے سیدھا کلفٹن جاتا ہوں۔ اور سورج نکلنے سے پہلے کمر کمر پانی میں کھڑے ہو کر عمل پڑھتا ہوں۔ سو کے نوٹ کو دس کا تو اسی وقت بنا سکتا ہوں ہے کسی کے پاس؟ پورنماشی کی رات کو شمشان گھاٹ جاتا ہوں۔ اور راکھ آنکھوں سے ملتا ہوں۔ چیک پر کئے ہوئے دستخط کو نگاہ بھر کے دیکھ

لوں تو ساری روشنائی اُڑ جائے۔"

چاچا فضل دین

اس زمانے میں وقت بھی بتلاتے تو اس انداز سے گویا کشف ہوا ہے۔ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی سے اس اطلاع کا کوئی تعلق نہیں۔ چاچا فضل دین بڑی عقیدت سے اُن کی باتیں سنتا۔ ایک سال پہلے اس نے اپنے گاؤں جا کر اس بڑھاپے میں تیسری شادی کی تھی۔ بے اولاد تھا۔ دو بیویاں مر چکی تھیں، مگر وہ عام نسلِ انسانی کے متوازی اپنی ذاتی نسل چلانے کے لیے اولادِ نرینہ چھوڑنا ضروری سمجھتا تھا۔ دُلہن کے حِنائی ہاتھوں سے بالوں میں مہندی کا خضاب (مونچھوں پر ہمیشہ سیاہ خضاب لگاتا تھا۔ کہتا تھا مہندیائی مونچھ کو مُٹیار اور ڈا کو خاطر میں نہیں لاتے۔) لگوا کر عجب ہیئتِ کتخدائی بنلئے، توبہ تلا کرتا لوٹا۔ ایک دن کہنے لگا کہ بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں۔ سوتے میں بھی ایک آنکھ کھُلی رکھنی پڑتی ہے۔ اور چُٹیا پہ ہاتھ رکھ کے سونا پڑتا ہے۔ ہم نے گجراتی کی مثل سُنائی کہ جوانی کی بیماری، ضعیفی کی مفلسی، جاڑے کی چاندنی اور بڑھاپے کی شادی پہ حقّے کا پانی! (یعنی لعنت)۔ بولا میں تو حقّہ ہر دفعہ تازہ کر کے پیتا ہوں۔ ہم نے کہا، چاچا! تم نے تین شادیاں کیں اور کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ بولا کیوں نہیں کیا۔ آئندہ کسی بیوہ یا پکّی عمر کی عورت سے شادی نہیں کروں گا۔ میری توبہ ہے۔

چند روز پہلے گاؤں سے پوسٹ کارڈ آیا تھا کہ آپ کی سب گائیں، ڈھور ڈھنگر خیریت سے ہیں۔ پچ کلیان بھینس کے دو تھن مارے گئے۔ اللہ دِتّہ مستری کی دائیں آنکھ فیوز ہو گئی۔ دیگر احوال یہ کہ رضائے الٰہی سے آپ کے بال بچّے کے یہاں بال بچّہ ہوا ہے۔ نورِ چشمی شلغم مولی کی طرح اُلٹا پیدا ہوا۔ یعنی سر سے پہلے پَیر تولّد ہوئے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ بہت ہونہار اور کالا ہے۔ چاچا فضل دین نے چیک کی سیاہی اڑانے والی کرامات کا ذکر بڑے غور اور عقیدت سے سُنا۔ اس کی خواہش تھی کہ کنجو نومولود کے چہرے کی ساری سیاہی چُوس لیں۔ واپسی ڈاک سے اس کا فوٹو منگوانے کو تیار تھا۔ خط کا جواب ہمیں ڈکٹیٹ کروایا۔ بیوی کی کارکردگی سے خوش ہو کر چاچا نے اس کا مہر مبلغ ۵۱ روپے سکّۂ رائج الوقت سے بڑھا کر ۱۰۱ روپے کر دیا۔ ہم نے قلم روک کر پوچھا معجّل یا موجّل؟ بولا یہ کیا ہوتا ہے؟ کہا معجّل وہ جو

جلدی مچلنے پر فوراً دینا پڑے۔ اور موجل وہ جو آرام آرام سے، بینک اوور ڈرافٹ کی طرح واپس کیا جائے۔ بولا تو پھر ہزار کردو۔ بینک والا۔

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اب نحاس پاشا کنجو اکثر فرماتے کہ میرے دادا جان قبلہ مجاہد و مجتہد عصر تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی جس میں سرِ مبارک شہید ہوا۔ حضرت اپنا بُریدہ سر بائیں ہتھیلی پہ رکھے اور دائیں ہاتھ سے تلوار چلاتے، خُونم خُون، سمندِ شب رنگ پہ سوار سرنگا پٹم سے بنگلور آتے۔ تیرھویں میل پر پہنچ کر وہ اور مُشکی گھوڑا شہید ہوئے۔ اپنی نمازِ جنازہ خود پڑھائی اور سلام پھیر کر غائب ہو گئے۔ پیر گھوڑا شاہ کا مرقدِ منوّر آج بھی زیارت گاہِ انام ہے۔

اس بابِ خاص میں خان سیف الملوک خان نے یہ ریسرچ کی تھی کہ اس کا دادا ایک عربی گھوڑے کی چوری کے الزام میں پکڑا گیا۔ کوتوال نے منھ کالا کیا اور خرِ سیاہ پہ اُلٹا بٹھا کے شہر بدر کر دیا۔ کالک کی وجہ سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ دادا کہاں ختم ہوتا ہے اور گدھا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ خرِ مذکور کی ٹانگوں میں جب تک سکت رہی چلتا رہا۔ آخرش تیرھویں سنگِ میل پر پہنچ کر ایسا بیٹھا کہ پھر نہ اُٹھا۔ یہیں اس کی قبر بنی۔ دادا نے بھی یہیں توطن اختیار کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب انھوں نے بھی دنیا سے پردہ کیا تو یہیں مدفون ہوئے۔ اہلِ بنگلور کی غفلت سے قبریں گڈمڈ ہو گئیں۔ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ان کا مزار خرِ سیاہ کی پائنتی ہے۔ مجاور کہتے ہیں سرہانے۔ بہرحال یہ تحقیق نہ ہو سکا کون کس میں آرام فرما ہے۔ ایک لال بجھکڑ سے یہ بھی مروی ہے کہ راکب و مرکب ایک ساتھ جاں بحق تسلیم ہوتے۔ اور وہ اس پر بیٹھے ہوئے، اسی پوز میں، دفنا دیے گئے اور اسی پہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ چنانچہ مزار کی اونچائی اس کی لمبائی سے زیادہ ہے۔ دوسری قبر غیر مسکونہ ہے۔ واللہ اعلم۔۔۔۔

کم خرچ بالا خانہ نشین

طرح طرح کی خبریں سُننے میں آرہی تھیں۔ خاں صاحب ہی کہیں سے یہ خبر لائے کہ سیکنڈ

لفٹین این۔ایم۔این۔پی کنجوس سراسر فراڈ ہے۔ اوّل درجہ کا جھوٹا لپاٹی۔ سیکنڈ لفٹین نہیں ہے۔ حد یہ کہ کنجو بھی نہیں ہے۔ اصل نام کچھ اور ہے۔ مدراسی بھی نہیں۔ وظیفے اور جنتر منتر سب بکواس۔ گھٹیا آدمی ہے۔ کپڑے کے امپورٹروں سے ایک ایک گز تھا تک لینے سے نہیں چوکتا۔ چاول کے گودام چیک کرنے جاتا ہے تو ہر بوری میں تین تین دفعہ سنبھا★ گھونپتا ہے اور جو بانگی نکلتی ہے اسے جھولے میں بٹور کر لے آتا ہے۔ کپڑا اور چاول نذیر محمد چپراسی کو بخش دیتا ہے۔ جس کے نو بچے ہیں۔ خود انشورنس کمپنیوں سے کمیشن کھاتا ہے۔ بینک کے مقروضوں سے قرض لیتا ہے۔ بیوی بھی سگی نہیں ہے۔ ایک یونہی سی عورت کے ساتھ یونہی رہتا ہے۔ اس یکجائی میں دونوں نے شرع کو دخل انداز نہیں ہونے دیا:

من ترا قاضی بگویم تو مرا قاضی بگو

منھ بولی بیوی ہے۔ وہی اس کی بالائی آمدنی کی بالائی اتارتی ہے۔ اس کے علاوہ قرض کے زور پر کوچہ بکوچہ، دربدر، زن بزن مارا پھرتا ہے۔ پچھلے سال تو ایک طوائف نے اسے گھر میں ڈال لیا تھا۔ کم خرچ، بالا خانہ نشین۔

ہم نے کہا "آوارگی اپنی جگہ، مگر اس میں بھی تو خوش مذاقی، حسنِ انتخاب کا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔"

مرزا بولے "کس دنیا کی بات کرتے ہو۔ بقول اشرف صبوحی، رونا تو یہی ہے کہ جس میں رس ہے، اس پہ بس نہیں۔ اور جس پہ بس ہے، اس میں رس نہیں۔ اور دل کی بات پوچھو تو جب تک سیخ کباب میں سے دہکتے انگاروں اور دھوئیں کی لپٹ نہ آئے، چٹخارا نہیں آتا۔ جیسے بھری پری سمپورن راگنی ہوتی ہے، ویسے ہی سمپورن ناری ہوتی ہے۔ سمپورن راگنی اِکتارے پر نہیں بجا کرتی، میرے سرکار!"

داستانِ غبن

یہ آج سے تقریباً بیس برس اُدھر کی بات ہے لیکن ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن جمعرات

★ سُنبھا (پنجابی) نالی دار سُوا جسے بوری میں گھسا کر اناج کی بانگی نکالی جاتی ہے۔

تھی۔ اس لیے کہ جمعرات کو وہ کام شروع کرنے سے پہلے اپنی ڈیسک پر ایک میسوری اگربتی جلاتے تھے۔ اس دن وہ صبح ساڑھے نو بجے ہی طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن بھی نہیں آئے۔ تیسرے دن کھاتے "بیلنس" کیے گئے تو ایک لاکھ کا فرق آیا۔ رات بھر دس بارہ آدمی غلطی کا کھوج لگاتے رہے۔ صبح پانچ بجے عُقدہ کھُلا کہ نحاس پاشا کنجو نے ایک کھاتے سے ایک لاکھ روپے اپنے جعلی اکاؤنٹ میں منتقل کر کے غبن کر لیے۔ آدمی دوڑائے گئے۔ مگر ان کا سراغ نہ ملا۔ اتوار کو گیارہ بجے شب پولیس اپنی تفتیش سے اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ جمعرات کو نو بجے بینک سے ایک لاکھ روپے نکلوا کر سیدھے ایئرپورٹ گئے اور گیارہ بجے کی فلائٹ سے (جس میں ان کی سیٹ ایک ہفتے پہلے بک ہو چکی تھی) بمبئی چلے گئے، جہاں وہ بینک اور قانون کی گرفت سے باہر تھے۔ اس دن چاچا فضل دین بہت رویا۔ غم میں روٹی نہیں کھائی۔ کبھی طیش میں آکر کہتا "اگر تیئوں چوری کرنی ہی سی تے مرداں وانگوں مجھ گاں چُراندا۔ اے کی جَھک ماری؟ (اگر تجھے چوری ہی کرنی تھی تو مردوں کی طرح گائے بھینس چُراتا۔ یہ کیا جھک ماری؟) پھر سر پیٹ کر کہتا "کی کردا پُتّر؟ جے تینوں پیسے ہی دی لوڑ سی، تے مینوں دَسنا سی۔ مَیں اپنے سارے مہینے دی تنخواہ تینوں دے دیندا۔ ہُن کی ہوسی؟ (بیٹا! یہ تُو نے کیا کیا؟ اگر تجھے پیسے ہی کی ہوس تھی تو مجھے تو بتایا ہوتا۔ مَیں اپنی سارے مہینے کی تنخواہ تجھے دے دیتا۔ اب کیا ہو گا؟) ایک دفعہ اکاؤنٹنٹ رخصت پر تھا اور نیا مینجر تجوری کی دونوں چابیاں کھُلی دراز میں رکھی چھوڑ گیا۔ اس وقت تجوری میں دس لاکھ روپے تھے۔ چاچا فضل دین چابیوں کو سینے سے لگائے رات بھر لاالہ الااللہ، لاالہ الااللہ کا وِرد کرتا، ٹہلتا رہا۔ اس کی بیوی ٹی۔ بی کے آخری درجے میں مُنھ سے خُون ڈالتی، علاج کو ترستی خانیوال میں اپنے میکے میں دم توڑ رہی تھی۔ چاچا کو فقط چار سُورتیں اور ۱۲۷ تک گنتی آتی تھی کہ یہی اس کی تنخواہ تھی۔ دس لاکھ روپے میں تو بقول اس کے اتنی بھینسیں آسکتی تھیں کہ سارے کا سارا گاؤں اپنے پیاروں سے خالی کرانا پڑتا۔ اور اس نے تو صرف آدمی کمائے تھے۔

اس زمانے میں ایک لاکھ روپے کا غبن آج کے دس لاکھ کے برابر ہوتا تھا۔ بینکوں میں برسوں ایسی واردات کے چرچے رہتے ـــــ بالکل اسی طرح جیسے باتونی عورتیں اپنی پچھلی زچگی کی ڈینگیں اس لمحے تک مارتی رہتی ہیں جب تک کہ خود انھیں یا سامعین میں سے کسی کو تازہ ترین زچگی نہ ہو

جلائے۔ جس نے سُنا، سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس ردِّعمل سے ذرا فراغت ہوئی تو ایک دوسرے پر غفلتِ مجرمانہ کے الزام لگائے گئے۔ پولیس نے پہلے تو چار گواہوں کے بیان قلمبند کئے، پھر خود انھیں بند کرلیا۔ مگر روپیہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ کنجو کی دراز سے روشنائی اڑانے کے کیمیکل کے علاوہ، دو کاپیاں اور چیک بک بھی برآمد ہوئیں جن میں وہ جعلی دستخط بنانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ ان میں راقم الحروف کے دستخط بھی شامل تھے۔

پانچ چھ مہینے بعد بمبئی سے آنے والوں نے بتایا کہ اس روپے سے انھوں نے بارہ ٹیکسیاں چلائیں۔ جب وہ چلتے چلتے پانچ رہ گئیں تو اونے پونے ٹھکانے لگا کر فلم پروڈیوسر بن گئے۔ اور کوچین کی ایک لوک کہانی فلمانی شروع کی۔ لیکن کہانی ختم ہونے سے پہلے ادھی پونجی خلاص ہو گئی۔ ہمارا خیال کیا یقین ہے کہ فلم میں ہیروئن کی جگہ جتنی سانولیوں اور "خمریوں" کو انھوں نے ڈالا ہوگا، اس کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہوتا۔ لکشمی جس چور دروازے سے آئی تھی اسی سے راتوں رات اُڑھل گئی۔ پیسے پیسے اور زنانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔

بصد سامانِ رُسوائی

مگر وہ یوں ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ گرہ کشائی کے لیے زر نہ ہو تو پھر زبان کی قینچی چلتی ہے۔ اللہ نے ان کی زبان کو بلا کی تاثیر دی تھی اور آنکھ میں جادو۔ اسی کا کرشمہ کہنا چاہیے کہ اب وہ بمبئی کے قطب الاقطاب بنے بیٹھے ہیں۔ اور ان کا شمار صاحبِ کشف و کرامات پیروں میں ہوتا ہے۔ خانقاہ عالیہ مرجع خلائق ہے اور ان کے جلالی وظیفوں کی سارے مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں دھوم ہے۔ تہجّد سے اشراق تک مصلّے پر قرار پکڑتے اور دعائے قنوت نازلہ کا وِرد کرتے ہیں۔ اپنا آپا مٹی میں ملا چکے ہیں۔ ایک دن محفلِ سماع میں حال آگیا تو اسی عالم میں خانقاہ سے باہر نکل آئے۔ اور سر کے بال نوچتے، سینہ پیٹتے، برہنہ پا چل دیئے۔ پیچھے پیچھے مُریدین اور قوال ہارمونیم اٹھائے "بصد سامانِ رسوائی سرِ بازاری رقصم" گاتے جا رہے تھے۔ آدھ میل تک اسی طرح سڑک پر دیوانہ وار رقص رواں جاری رہا۔ میرین ڈرائیو پر ٹھٹ لگ گئے۔ سارا ٹریفک، جَیم ہو کر رہ گیا۔

۱۹۷۰ء میں بمبئی سے آنے والے ایک اسمٰعیلی واقفکار کے ہاتھ انھوں نے مدراسی کافی، صندل کی تسبیح، سُرمے، اور اپنی تصویر کی سوغات بھیجی۔ تصویر کے نیچے وہ پنجابی ٹپّہ تحریر تھا جس نے کبھی دِلوں کو گرمایا اور آلامِ روزگار کو آسان بنایا تھا۔ جاڑے پالے میں چراغ کی طرف دیکھنے سے بھی گرمائی آجاتی ہے۔ گزری ہوئی صحبتیں ایک ایک کر کے یاد آئیں اور ان کے ساتھ نہ جانے کیا کیا یاد آ گیا۔ جب کوئی کسی ہمدمِ دیرینہ کو یاد کرتا ہے تو دراصل اپنے آپ کو یاد کرتا ہے۔ دیر تک اس تصویر میں اپنے آپ کو دیکھا کیے۔ وہی کشادہ جبیں، وہی نیم وا لب، وہی ذہین مسکراتی آنکھیں۔ پر نہ جانے کس حریص جبّی کی نظر لگی کہ ساری داڑھی سفید گالا ہو گئی ہے۔ تاہم یہ دیکھ کر ذرا ڈھارس بندھی کہ آج کل آنکھوں میں سُرمہ نہیں لگاتے، کاجل لگاتے ہیں۔ دنبالہ دار!

عِلم دریاؤ

نقشہ ہمارے طاقِ نسیاں کا

ہمیں نام، مُردوں کے چہرے، راستے، کاروں کے میک، شعر کے دونوں مصرعے، یکم جنوری کا سالانہ عہد، بیگم کی سالگرہ اور سینڈل کا سائز، نمازِ عید کی تکبیریں، سال گزشتہ کی گرمی سردی، عیش میں نامِ خدا اور طیش میں خوفِ ناخدا، کل کے اخبار کی سرخیاں، دوستوں سے خفگی کی وجہ ——— اور نہ جانے کیا کیا یاد نہیں رہتا۔ ن۔م۔راشد کے جغرافیہ فراموش ہیرو کی طرح ہم اتنا بڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ "اس کا چہرہ، اس کے خدّوخال یاد آتے نہیں۔ اِک برہنہ جسم اب تک یاد ہے۔" اس لیے کہ اس صورتِ حال میں حافظہ کی خرابی سے زیادہ چال چلن کی خرابی نظر آتی ہے۔ اور نہ ہمارا حافظہ اتنا چوپٹ ہوا ہے کہ جوشؔ صاحب کی طرح ساری داستان امیر غمزہ سنانے اور اپنے دامن کو آگے سے خود ہی پھاڑنے کے بعد، جب جرح کی نوبت آئے تو یہ کہہ کر اپنے دعویٰ عصیاں سے دست بردار ہو جائیں کہ

نسیان مجھے لُوٹ رہا ہے یارو

۸ کا ہندسہ اور ہم

دِن مہینہ اور سنہ یاد نہیں رہے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ۲۶ تاریخ تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ کسی سنہ اور مہینے کی ۲۶ تاریخ کو ہی ایک نجومی نے یہ وہم ہمارے دِل میں ڈالا تھا کہ ۸ کا ہندسہ یا وہ عدد جن کا حاصل جمع ۸ ہو، مثلاً ۱۷، ۲۶، سنہ ۱۹۶۱ء وہ کار، مکان یا فون نمبر جس کے ہندسوں

کا میزان ۸ بنے ہمارے حق میں نحس ثابت ہوں گے۔ حد یہ کہ انگریزی کے 8 جیسے نگوڑ والیوں، آٹھویں شادی، ۶۲ سالہ عورت اور سترہویں صدی عیسوی سے بھی خبردار کیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی کی بیشتر مایوسیاں اور ناخوش گوار واقعات انہی تاریخوں میں رونما ہوئے جن کا میزان یہ منحوس ہندسہ بنتا ہے جسے اب تو نوکِ قلم پر لاتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے۔ اس کی دہشت دل میں ایسی بیٹھی ہے کہ گزشتہ سال ہم منگورہ سے پنڈی رات کے ایک بجے پہنچے اور دسمبر کی پوری رات ہوٹل انٹرکانٹی ٹینٹل کے لاؤنج میں بیٹھ کر گزار دی اس لیے کہ منحوس ۵۱۲ نمبر کے کمرے میں ٹھیرنے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔ اور کوئی دوسرا کمرہ صبح سات بجے سے پہلے خالی ہونے کا امکان نہ تھا۔ ہم یہ منظر دیکھنے کے لیے ہرگز تیّار نہ تھے کہ صبح ہم اس کمرے میں مُردہ حالت میں پائے جائیں۔

حتی الامکان ہم کوئی نیا کپڑا، نیا کام یا سفر، منحوس تاریخ (۸، ۱۷، ۲۶) کو شروع نہیں کرتے۔ نحس دن ہمیں جنّت میں بھی جانے کا اختیار دیا جائے (زبردستی کی اور بات ہے) تو ہم کسی مناسب تاریخ تک دنیا ہی میں عزیبا مئو گزربسر کرنے کو ترجیح دیں گے۔ ہونے کو تو ہمارے حق میں ۸ نمبر کا جُوتا بھی اکثر منحوس ثابت ہوا ہے، لیکن ۷ نمبر کاٹا بہت ہے۔ لاکھ اِس SUPERSTITION (توہّم) کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کچھ نہ کچھ بات ایسی ہو جاتی ہے جس سے اس کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک دِن ہم نے اپنی پیدائش کی تاریخ، مہینے اور سنہ کے عدد جوڑے تو حاصل جمع ۸ نکلا! اس دن سے یہ وہم اور راسخ ہو گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جو بات عقل و منطق کے ذریعہ ذہن میں داخل نہیں ہوئی، وہ عقل و منطق سے کیسے نکالی جا سکتی ہے۔ توہّم کے کارخانے کا دستور نرالا ہے۔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔

ہماری معلوماتِ عامّہ کا اِمتحان

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ ۲۶ تاریخ تھی اور شام کے چھ بج رہے تھے۔ صبح ساڑھے چھ بجے ناشتے کے بعد، معدے کو مزید زحمت ہضم نہیں دی تھی۔ باہر سڑک پر ایک ٹھیلے والا دن بھر دودھیا بھٹّوں سے راستہ چلتے لوگوں کو للچانے کے بعد اب خود ہی

بھوُن بھوُن کر کھا رہا تھا۔ سوتی جاگتی انگیٹھی پر بھٹوں اور کوئلوں کے چٹخنے کی چٹر پٹر سے رال بنانے کے غدود اس بری طرح مشتعل ہوئے کہ جب تک ہم نے اپنی اِکنّی کو بھٹے میں تبدیل نہ کر لیا، یار کوئیں نے، مجھے یار نے سونے نہ دیا۔ انگیٹھی سے بھٹا، براہ شاہجہانی رودزن ★، ہم تک پہنچا اور ہم نے بیتابی سے منہ مارا۔ (''بھٹے، مرغی کی ٹانگ، پیار اور گنے پر جب تک دانت نہ لگے، رس پیدا نہیں ہوتا'' ——— مرزا عبدالودود بیگ) ابھی دس بارہ دانوں پر ہی ہماری مہر لگی ہوگی کہ اینڈرسن فائل ہاتھ میں لیے آدھمکا۔ اسے دیکھتے ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم خود کھڑے ہو گئے۔ دونوں ہاتھ چھوڑ کر ''اٹنشن''۔ البتہ بھٹے کو، جس میں ہماری گاڑھی کمائی کا دُودھیا رس بھرا ہوا تھا، دانتوں سے پکڑے رکھا۔ اس صورت میں بھٹا اس کی پتلون پر گرائے بغیر ''گڈ آفٹرنون'' ✪ کہنا ایک ایسے شخص کے لیے جس کے چہرے پر قدرت نے صرف ایک ہی دہن بنایا ہے، ناممکن تھا۔ لہٰذا ہم نے اضطراری طور پر اپنا دایاں ہاتھ، جو نمک اور لیموں کے عرق سے تقریباً دُھل چکا تھا، مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔ جتنا لمبا ہاتھ ہم نے بصد خلوص آگے بڑھایا تھا، ٹھیک اسی قدر موصوف پیچھے ہٹ گئے۔ تس پر ہم نے اپنا لیموں اور خلوص میں لتھڑا ہوا ہاتھ تہ کر کے پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور محض سر اور بھٹے کی متوازی ڈبکی سے سلام کیا۔

کڑوی مسکراہٹ کے بعد فرمایا ''ہیلو! نیرو! بھٹے سے بانسری کیوں بجا رہے ہو؟''

ہم نے اس فقرے کی داد، بغیر منہ کھولے، بند ہنسی یعنی اندرونِ حلق کی ہنسی کو بالا بالا ہی ناک سے خارج کر کے دینی چاہی تو موصوف نے انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنی کٹلری ڈِس انفکٹ کر کے مجھ سے میرے چیمبر میں ملو۔ چنانچہ ہاتھ دھو کر ہم ناخدائے بینک کے حضور

★ اس کی تفصیل ''کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ، مددے!'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

✪ رات کے آٹھ بج جائیں تب بھی، بینک کے آداب کے مطابق، اسے ''گڈ آفٹرنون'' ہی کہنا پڑتا تھا۔ ''گڈ ایوننگ'' سے اس کے آگ لگ جاتی تھی۔ سمجھتا تھا کہ یہ کام چور مجھے یہ جتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھ ہم رات تک بغیر اوورٹائم الاؤنس کے تیری جان کو رو رہے ہیں۔ یعنی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا ہیں! چنانچہ یوم الحساب (سالانہ کلوزنگ) یعنی تیس ستمبر کو جب وہ خود بھی بینک میں موجود ہوتا، رات کے ایک دو بجے تک ''گڈ آفٹرنون'' ہی چلتا رہتا۔

پیش ہوئے۔

فرمایا "یہ شے جس کے سِرے تمہارے دونوں کانوں سے باہر نکلے ہوئے تھے، بتاؤ یہ کہاں پیدا ہوتی ہے؟"

"پاکستان میں"

"شاباش! تم اسے بہشت کا میوہ بھی بتا دیتے تو میں تمہاری ضیعف الاعتقادی میں مخل نہ ہوتا۔ لیکن تمہاری اطلاع کے لیے، صوبہ سرحد میں بہترین مکئی پیدا ہوتی ہے۔ نیشکر بھی۔ بتاؤ نیشکر سے کیا چیز بنتی ہے؟"

"شکر"

دوبارہ شاباشی دیتے ہوئے فرمایا "تم ان لوگوں سے زیادہ قابل ہو جو تم سے کم قابل ہیں! ہاں! خوب یاد آیا شکر سے جس دن تم لوگ میٹھی پٹیس بنا کر مُردوں کو ENTERTAIN کرتے ہو اسے کیا کہتے ہیں؟"

"حلوہ۔ شب برات کا۔"

"شکریہ! اچھا اب یہ بتاؤ کہ زنٹیر میں اور کون سی چیز ایسی بکثرت پیدا ہوتی ہے جو دوسری جگہ نہیں ہوتی؟"

"پٹھان۔"

"شوخی اور گستاخی کی حدِ فاصل بال برابر ہوتی ہے۔ مسٹر غوری نے ابھی آفٹرنون میں شکایت کی ہے کہ تم نے پھر اپنے گوشوارے کی فاش غلطی کو برنارڈ شا کے فحش فقرے سے ڈھکنے کی کوشش کی۔ یہ شکایت دوبارہ نہ سنوں۔ برنارڈ شا کے ڈراموں کے بجائے اکاؤنٹنسی اور کمرشل جغرافیہ پڑھا کرو۔ خالی دماغ شیطان کی ورکشاپ ہوتا ہے۔ لیکن تمہارا دماغ تو اس کی حرم سرا بھی ہے۔ ہا ہا ہا! چمنی کی طرح ہر وقت دھواں دیتے ہو اور یہ بھی پتہ نہیں کہ زنٹیر میں نہایت عمدہ قسم کا ورجینیا تمباکو پیدا ہوتا ہے۔ انگلینڈ کو تمباکو اور سرطان سے ہمکنار کرنے کا سہرا سر والٹر رالے کے سر ہے۔ اس کی کاشت، پیداوار، تجارت اور قرضوں سے متعلق تمہاری معلومات صفر ہیں۔

کیوں نہ آئندہ پیریڈ سے اپنی لاعلمی کی سرحدوں کو معقول حد تک سکیڑ لو۔ سیف الملوک خان اسی نواح کا رہنے والا قبائلی ہے۔ علی قلی خان نے اسے بنیک میں رکھوایا تھا۔ تمھاری طرح فکرِ فردا اور حساب کتاب سے ماورا ہے۔ انتھک محنت اور حماقت کا اس سے حسین امتزاج ایشیا میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ مگر نیک آدمی ہے۔ غوری تم سے ناخوش ہے۔ آئندہ چار ہفتے خان کی ڈیسک پر ٹریننگ لو اور اپنی ناقص معلومات کا خلاصہ اگلے مہینے پیش کرو۔"

تمباکو پر ہماری ریسرچ کے ڈائرکٹر

اور یوں ہم خان سیف الملوک خان کی تحویل میں دے دیئے گئے۔ چھریرا بدن، چوڑا ہاڑ، کندھے قدرے خمیدہ جس کا سبب عجز و انکسار نہ تھا۔ چمپئی رنگ دھوپ سے سنولا چلا تھا۔ ناک گندھارا کے مجسموں جیسی۔ سارے دن آنکھوں سے مسکراتے رہتے۔ ستا ہوا، مگر شگفتہ چہرہ۔ مضبوط ٹھوڑی پر کھلنڈرے بچپن کا بین الاقوامی ٹریڈ مارک یعنی چوٹ کا نشان۔ کان جیسے کسی نے جگ کا ہینڈل لگا دیا ہو۔ سر پہ قراقلی ٹوپی بڑے ٹیڑھے زاویئے سے پہنتے۔ اندر مانگ اس سے بھی زیادہ ٹیڑھی ہوتی تھی۔ منجھلے بریکٹ { کو بہلا پھسلا کر چت لٹا دیا جائے تو ان کی مونچھ بن جائے۔ انگلیاں سگرٹ کے دھوئیں سے عُنابی۔ اتنے لمبے تھے نہیں جتنے لگتے تھے۔ ہنسی آتی تو ایک دم کھڑے ہو جاتے۔ پھر وکٹ کیپر کی طرح رکوع میں چلے جاتے اور اپنے گھٹنے پکڑ کر گردن اٹھاتے اور وہیں سے مخاطب کی صورت دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتے رہتے۔ یہ ان کی خاص ادا تھی۔ صحیح عمر معلوم نہیں لیکن اپنی کو آپریٹیو بینکنگ کی غلط کاریوں کی مدّت کو ہماری جوانی کے برابر بتاتے تھے۔

اگر اس زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی کے مطابق دستور العمل بنایا جاتا تو، محمد حسین آزاد کے الفاظ میں، یہ صاحبِ کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف روانہ ہی نہ ہوتا۔ مطلب یہ کہ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھے۔ پشتو، ہندکو، پنجابی، فارسی اور اردو روانی سے بولتے اور ایک زبان سے دوسری زبان میں اس چابکدستی سے گیئر بدلتے کہ سننے والے کو خبر بھی نہ ہوتی۔ انگریزی صرف ان خاص مقامات پر بولتے تھے جہاں آدمی کچھ نہ بولے، تب بھی بخوبی کام چل جاتا ہے۔ عربی

کی دستگاہ کا اندازہ نہیں۔ لیکن ح اور ع صحیح مخرج سے نکالتے تھے۔ یعنی اس مخرج سے جس سے ہم جیسے بے عِلمے صرف قے کرتے ہیں۔ خوب صورت عورت کے لیے وہ اپنا وضع کردہ مخفف "خوبصورت" استعمال کرتے جو اُن کے منھ سے بھلا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرکّب میں اختصار اور پیار بحصّہ مساوی کوٹ کوٹ کے بھرا تھا۔

اپنی تمام سعی و کاوش کے باوجود کبھی ناکامیابی خان صاحب کے قدم چومنے لگے، یا بیٹھے بٹھائے نقصان و آزار پہنچ جائے تو کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے، آسمان کی طرف منھ کر کے، دنیا بنانے والے کے معیارِ کارکردگی پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار فرماتے۔ ذرا سی بات طبیعت کے خلاف ہو جائے تو ہفتوں سارے نظامِ کائنات سے کھنچے کھنچے رہتے۔ اعزّا کے ہاتھوں کافی تکلیف اٹھائی تھی۔ نیشِ اقرب سے بلبلا اٹھتے۔ ایک دن ہم نے پوچھا آپ کے کتنے بھائی ہیں۔ بولے میرا صرف ایک برادرانِ یوسف ہے۔

اُردو غزل، پتّی اور تواریخ

شعر و شاعری سے طبیعت نفور تھی۔ ایک دفعہ یار لوگوں نے انھیں ڈان اخبار کے سالانہ "عظیم الڈّان" مشاعرے میں لے جانا چاہا۔ کسی طرح رضا مند نہ ہوئے۔ ہمارے منھ سے نکل گیا، چھوڑو بھی۔ ٹکٹ زیادہ بِک گئے ہیں اور جگہ تنگ۔ دنگا فساد کا اندیشہ ہے۔ اب مُصر ہیں کہ ضرور چلوں گا۔ جگر کے ایک ایک شعر کی داد جماہی سے دی اور حفیظ کی "رقّاصہ" کو تو خرّاٹوں پر اُٹھا لیا۔ ہم نے ٹھوکا دے کر کہا، خرّاٹے لینا آدابِ مشاعرہ کے خلاف ہے۔

فرمایا "اُردو کی دو تین غزلیں لگاتار سُن لوں ـــــ توجہ سے ـــــ تو قسم خُدا کی، میرے تو پتّی اچھل آتی ہے"۔

بایں ہمہ غالب کی ہر غزل کا کم از کم ایک شعر پہچان کر اعلان کرتے کہ غالب ہی کا لگتا ہے۔ ہمارا اشارہ مقطع کی طرف ہے۔ بھاگنے کا موقع نہ ہو تو مارے باندھے شعر سُن لیتے تھے۔ سمجھ میں آ جائے تو مسکرا دیتے۔ سمجھ میں نہ آئے تو مصافحہ کرتے تھے۔

علمی اور ادبی گفتگو سے خان صاحب کا قبائلی خون کھولنے لگتا۔ اکثر فرماتے "تمھاری علمناک باتیں سُن سُن کر میرے سر میں تو دانائی کے گومڑے (BUMPS) نکل آئے۔ ٹوپی تنگ ہو گئی ہے۔ کوئی بھی اوٹ پٹانگ شعر پڑھ دے تو اس طرح جھومنے لگتے ہو جیسے ـــــ کیا نام اُس کا ـــــ سانپ کا پھن سپیرے کی پونگی کے سامنے!" البتہ تاریخ سے شغف تھا، لیکن بس اس حد تک جہاں تک وہ میٹرک کے نصاب میں سموئی جا سکتی ہے، یا غافلوں کی تنبیہ کے لیے استعمال کی جا سکے۔ ہمیں نصیحت کرنی یا عبرت دلانی مقصود ہو تو کسی ناکارہ و بدقوارہ مغل بادشاہ کی نظیر پیش کرتے۔ اپنے انجام سے ہم لرز جاتے، اس لیے کہ ہمارے پاس تو کوئی آبائی سلطنت بھی نہ تھی جسے کھو سکیں۔ مغل بادشاہوں نے اگر خاں صاحب سے مشورہ کر لیا ہوتا تو آج بھی سب پر حکومت کرتے ہوتے۔ اور ہم کمر میں زریں پٹکے اور سر پر راجپوتی پگڑیاں باندھے باادب باملاحظہ کھڑے ہوتے۔

ہاتھ لا اُستاد، کیوں کیسی کہی!

عجب مزاج اور زورِ بازو پایا تھا۔ دروازے پر اگر PUSH لکھا ہو تو الٹا اپنی جانب کھینچتے اور PULL لکھا ہوتا تو باہر کی طرف دھکّا دیتے۔ رونا اس بات کا تھا کہ اکثر دروازے ان کی مرضی کے عین مطابق کھل اور بند ہو بھی جاتے تھے۔ کبھی کوئی کثیفہ★ سنانے بیٹھتے تو سننے والے کی سمجھ میں نہ آتا کہ کب اور کہاں ہنسے۔ حفظِ ماتقدّم کے طور پر لطیفہ شروع کرنے سے پہلے خود ہنسنے لگتے اور سننے والے کے پنجہ میں پنجہ ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ہم بھی گھنٹوں ان کے لطیفوں سے پنجہ لڑا چکے تھے۔ بائیں ہاتھ کو آزاد رکھتے تاکہ مخاطب کے زانو پر مار مار کے لطیفے سے لال کر سکیں۔ لوگ ان کے لطیفے پر اخلاقاً بھی نہیں ہنستے تھے۔ اس ڈر سے کہ جھوٹوں بھی داد دے دی تو دوسرے لطیفے کی کاٹھ میں جکڑ دیئے جائیں گے۔

غصّہ ناک پر رکھا تھا جو وقتاً فوقتاً پھسل کر منہ سے مغلظات کی شکل میں ڈھل کر خارج ہوتا

★ کثیفہ : DIRTY JOKE

رہتا۔ گالیاں طبع زاد، برجستہ اور آورد سے پاک ہوتی تھیں۔ نکتہ آفرینی اور سلاست و روانی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ بازی گر کی طرح اپنے دہانے سے بھی بڑے قطر کے گالیوں کے گولے منھ سے نکالتے رہتے۔ پیش پا افتادہ، پامال مضامین اور بزرگوں کی گھڑی گھڑائی ترکیبوں سے احتراز کرتے۔ اپنی راہ الگ نکالی تھی۔ کبھی کوئی بہت ہی نازیبا مضمون غیب سے نازل ہو جائے تو زبان کو آلودہ نہیں کرتے تھے۔ خطِ کوفی میں کاغذ پر لکھ کر ہمیں دکھا دیتے۔ گالیوں کی خطّاطی کا اس سے بہتر نمونہ آج تک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ویسے مرنجان مرنج اور محبتی آدمی تھے۔ بوائے اسکاؤٹ کی طرح روزانہ کم از کم ایک نیکی علی الاعلان کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے کہ کل رات میں نے ایک شخص کو بڑی بے عزتی اور ماں بہن کی گالیوں سے بچا لیا۔

پوچھا "کہاں؟ کیسے؟"

فرمایا "میں نے اپنے غصّے کو کنٹرول کیا۔"

دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض کاہل گلیر، گالی کو تکیہ کلام بلکہ گاؤ تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن خاں صاحب ہر گالی سمجھ کے دیتے تھے۔ جیسے فریدہ خانم سمجھ کے غزل گاتی ہیں۔

ایک دن خان صاحب نے بحثا بحثی کے دوران ایک موقع پرست لیڈر اور چند نودولتیے صنعت کاروں کو "دتّے"★ اور بھڑوے کہہ دیا۔ اس پر حسن ڈبائیوی نے ٹوکا کہ "خان صاحب! کم از کم یو پی میں شرفا کا یہ وطیرہ نہیں کہ کسی کو بھڑوا کہیں"۔ فرمایا "آپ بھی اس زمانے کی بات کرتے ہیں جب سارے شہر میں کُل دو بھڑوے ہُوا کرتے تھے!"

— ۲ —

ابدالی

شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اتوار کو علی الصبح سائیکل پر نکل جاتے۔ کہتے تو یہ تھے کہ کیرتھر اور منگھو پیر کی پہاڑیوں میں سُرخ بکرا (IBEX) مارنے جاتا ہوں، لیکن کراچی سے بیس میل کے دائرے میں فاختہ تک نہیں چھوڑی تھی۔ آخر میں تو چیل کوّوں پر غصہ اتارنے لگے تھے۔ بھرمار ٹوپی دار بندوق استعمال کرتے تھے جس میں بارُود گز سے ٹھونک ٹھونک کر بھرا جاتا ہے۔

★ دتّے: (پنجابی) اُردو میں اسے دیّوث کہتے ہیں۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

بندوق کی لمبائی ہمارے قد سے دُگنی تھی، بشرطیکہ ہم پنجوں کے بل کھڑے ہو جائیں۔ اس کی مکھی اتنی دُور واقع تھی کہ ہمیں تو عینک کی مدد سے بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اسی آلہ سے اُن کے پردادا نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اسی نسبت سے ہم اسے پیار میں ابدالی کہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ عادت سی پڑ گئی ہے۔ اسے اپنے پہلو میں لٹا کر، لبلبی پر اُنگلی رکھے، دائیں کروٹ سوتا ہوں۔ ایک لمحے کو بھی اُنگلی الگ ہو جائے تو پٹ سے آنکھ کھُل جاتی ہے۔ ان کی کیفیت ان ضدّی بچّوں کی سی تھی جو دُودھ چھُڑانے کے بعد چُسنی منھ میں لیے لیے سو جاتے ہیں۔

ہم نے پوچھا لبلبی پر انگلی رکھ کر سونے سے آپ کو ڈر نہیں لگتا؟ فرمایا، ولایتی بندوق تھوڑا ہی ہے۔ آپ ہی تو اس دن مزے لے لے کے بتا رہے تھے کہ مولانا شبلی نعمانی کی بندوق بھی ان کی طبیعت کی طرح نکلی۔ بلا ارادہ چل گئی۔ پر یہ بندوق آج کل کی کٹ کھنی، بے کہی بندوقوں کی طرح نہیں جو چھیڑ چھاڑ سے ہی مشتعل ہو جاتی ہیں۔ بے قصد و ارادہ۔ یہ بھی بندوق کی نہ سہی خانصاحب کی کسر نفسی تھی، ورنہ ہم نے تو یہی دیکھا کہ ارادہ اور کوشش سے بھی نہیں چلتی تھی۔ ہمارے فقروں کی طرح زنگ چاٹ جاتی تھی۔

دال روٹی، یعنی غلّہ سے غلّہ کھانا

ناسازیٔ طبع یا کسی اور مجبوری کے سبب اتوار کو شکار کھیلنے نہ جا سکیں تو سنیچر کو ظہر و مغرب کے درمیان قضا کھیلتے۔ اتوار کو شکار کے گوشت کا ناغہ ہو جائے تو صبح سے بولائے پھرتے اس دن مُرغے کے گلے پر اللہ کی بڑائی بیان کرتے۔ ایسا مُرغا ہرگز نہیں کھاتے تھے جس نے پہلی اذان نہ دی ہو۔ مرغی کو چھُوتے تک نہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ غزنی خیل گاؤں میں بالغ مُرغا زنانے میں گھُس آئے تو عورتیں جھٹ برقع اوڑھ لیتی ہیں۔ ایمپریس مارکیٹ سے خود دیکھ بھال کر ناطق و بالغ مرغا خرید کر لاتے اور قبلہ رُو کر کے بندوق سے ڈھیر کرتے۔ پھر ذبح کرتے۔ اکثر فرماتے کہ دوسرے کا ذبح کیا ہوا گوشت کھانے سے آدمی بُزدلا، یک زوجیہ اور چرب زبان ہو جاتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے آدمی دال روٹی کھا لے۔ مگر ہم قبائلی بھُوک کے بھلے ہی مر جائیں۔ غلّہ سے غلّہ نہیں

کھاتے۔ ★ جبھی تو یہ حال ہے کہ نسوار کی چٹکی لے کر ذرا چھینک دوں تو سارے دفتر کی ناف ٹل جائے۔ ہم حفاظت کے لیے گھر سے بازو پر امام ضامن بندھوا کر نہیں نکلتے۔ گلے میں پستول ڈال کر نکلتے ہیں۔"

"فائدہ؟"

"مغل بادشاہ جس دشمن کو اپنے ہاتھ سے مارنا نہیں چاہتے تھے، اسے حج پر روانہ کر دیتے۔ یا جھنڈا، گھوڑا، نقارہ اور خلعت مرحمت فرما کر دکن و بنگالہ فتح کرنے بھیج دیتے۔ لیکن ہم دشمن کو شارٹ کٹ سے جہنم رسید کرتے ہیں۔"

"دشمنوں کے، حسب عداوت، تین درجے ہیں۔ دشمن، جانی دشمن اور رشتے دار۔"

"ایمان سے، یہ جملہ آپ کا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن رشتے دار پھر بھی رشتے دار ہوتا ہے۔ پشتو میں کہاوت ہے کہ رشتے دار اگر قتل بھی کرے گا تو لاش دھوپ میں نہیں پڑی رہنے دیگا۔"

تمباکو خوردنی دخانی و چشیدنی

یہ تھے خان سیف الملوک خاں جن کے سامنے ہمارا زانوئے ادب ایک مہینے تک صبح و شام تہ ہوتے ہوتے اور کھلتے کھلتے سُن ہو چلا تھا۔ تمباکو پر "اتھارٹی" سمجھے جاتے تھے کہ تمباکو خیز و تمباکو بیز خطّے سے تعلق کے علاوہ، سگرٹ اور حقّہ پیتے تھے۔ تمباکو کھاتے تھے۔ نسوار لیتے تھے۔ غرض کہ شئے مذکور کو ہر ممکن طریقہ سے اپنے وجود میں داخل کرنے کا جتن کرتے رہتے تھے۔ سلام

★ اناج سے اس سختی کے ساتھ پرہیز کرتے تھے کہ ایک افسر کی الوداعی پارٹی میں انھیں مٹن سینڈوچ پیش کی گئی تو انھوں نے اس کے پرت کھول کر گوشت کا ایک ایک ریزہ اور ریشہ بین لیا۔ اور دونوں سلائس جوڑ کر بیرے کو واپس کر دئے کہ یوسفی صاحب کو دے آؤ۔

مُرغے سے رغبت کے باب میں ہم نے ایک دفعہ استفسار کیا تو فرمایا کہ چالیس کے پیٹے میں آنے کے بعد دال، کھٹائی، ہم عمروں کی صحبت اور آئینے سے پرہیز لازم ہے۔ جھنگ کے علاقہ میں یہ دستور ہے کہ کوئی بڑا بوڑھا مر جائے تو اس کے پسماندگان برادری کو چالیس دن تک مُرغے کھلاتے ہیں (اگر کوئی جوان موت ہو جائے تو چہلم تک دال ہی دال کھلائی جاتی ہے۔) چنانچہ کسی بڈھے کو زکام بھی ہو جائے تو گاؤں کے سارے مُرغے سہمے سہمے پھرتے ہیں۔ اذان دینی چھوڑ دیتے ہیں۔

روستائی کے بعد ہم نے عرض مدعا کیا کہ ہم تمباکو سے متعلق بنیادی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جواب میں نسوار کی ڈبیا آگے بڑھاتے ہوئے بولے، حاضر ہے!

"ہماری مراد تمباکو خوردنی و نوشیدنی یا تمباکو دُخانی سے نہیں"۔

"اس میں میری طرف سے قوام چشیدنی کا اضافہ فرما لیجیے۔ تھوکنے والا اور پھونکنے والا تمباکو کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے؟" انھوں نے ہماری فارسی کی تھوتھنی زمین پر رگڑتے ہوئے کہا۔

"ہم اس کی کاشت، تجارت، آڑھت وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔

"تمباکو کے بارے میں پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ کراچی کی آب و ہوا اِسے موافق نہیں آسکتی۔ اسے ہی کیا، کسی کو راس نہیں آتی۔ البتہ جیسا تندرست، قیمتی اور خالص گدھا یہاں دیکھا، رُوئے زمین پر اس کا جوڑی دار نہیں ملنے کا۔ عجب شہر ہے۔ ہر بات اُلٹی۔ وہ قصہ نہیں سُنا؟ دھوبی والا۔ بریلی سے تازہ ہجرت کر کے آیا۔ ایک ہزار رُپئے لے کر گدھا خریدنے نکلا تو گدھے بیچنے والے نے جھڑک دیا 'جا، جا! بڑا آیا گدھا خریدنے والا۔ انٹی میں کُل ہزار روپلّی ہی ہیں تو گھوڑا کیوں نہیں لے لیتا؟' نہ صاحب! تمباکو کراچی کے ریتہ بجری میں جڑ نہیں پکڑ سکتا"۔

"خان صاحب! منی پلانٹ بغیر مٹّی، کھاد اور دھُوپ کے محض پانی کی بوتل میں اُگتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں کامیاب و کامراں لوگوں کی جڑیں وہسکی کی بوتل میں بڑھتی اور پھیلتی ہیں"۔

اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر رکوع میں چلے گئے اور تین مرتبہ سبحان اللہ! سبحان اللہ! سبحان اللہ!!! تجوید سے ادا کرنے کے بعد فرمایا "آپ اچھا ڈائلاگ بول رہے ہیں۔ ایسا ڈائلاگ میں نے ۱۹۲۵ میں پشاور میں سُنا تھا۔ ایک تھیٹریکل کمپنی آئی تھی۔ ہیروئن کا پارٹ ایک مرد نے غضب کا کیا تھا۔ آپ ہی کے وطن کا تھا۔ گرائیں۔ ایمان سے! آپ کی طرف کے مرد بڑے باکمال بے نظیر ہوتے ہیں۔ حالانکہ آپ تو جے پور کی مشہور چیزیں صرف سانڈ، کھانڈ، بھانڈ اور رانڈ★ ہی بتاتے ہیں۔ ہاں تو تمباکو کے ضمن میں دوسری بات یاد رکھنے کے لائق یہ ہے کہ بیوپار کے علاوہ یہ اور کسی مطلب کے لیے

★ رانڈ: راجستھان میں ہر خوب صورت اور زُود یاب عورت کو رانڈ کہتے ہیں۔ اس کے شوہر کے مرنے کا انتظار نہیں کرتے۔

مفید نہیں۔ اسی لیے جہانگیر نے تمام قلمرو میں تمباکو نوشی قانوناً ممنوع کر دی تھی جب کہ شراب نوشی کی پوری آزادی تھی، یعنی صرف شرعی ممانعت تھی۔"

"کچھ آب و ہوا کے بارے میں بھی ارشاد فرمائیے۔ فی ایکڑ پیداوار کیا ہوتی ہے؟"

"پہلے سوال کا جواب آٹھویں جماعت کے جغرافیہ میں ہے۔ میرے بیٹے کی کتاب میں لکھا ہے۔ تُخمیر★ تین سال سے اسی کلاس میں مانیٹر ہے۔ دوسرے سوال کا جواب چارسدہ کا پٹواری دے گا۔ بڑا بیبا آدمی ہے۔ ہم دونوں ایک ہی سکھ ماسٹر کے ہاتھ سے برسوں پٹے ہیں۔"

"تمباکو کا پودا کتنا بڑا ہوتا ہے؟"

"جتنا آپ سمجھ رہے ہیں، اس سے کافی بڑا! فرنٹیر کا سیر ۱۰۵ تولے کا ہوتا ہے۔"

— ۳ —

ریڈ کلف کے کان کاٹے گئے

ہم کاغذ پنسل لے کر تمباکو پر نوٹس لینے لگے تو وہ رُوٹھ کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے اگر علم حاصل کرنے کا ایسا ہی لپکا ہے تو پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔ چھُٹّی کے دن حجرے پر آئیں۔ شاگرد بنا کر جنگلی بکرے کے کبابوں پر نیاز دِلاؤں گا۔

اگلے اتوار کو ہم صبح سات بجے بہار کالونی پہنچے جہاں ان کا حُجرہ گھٹنے گھٹنے کیچڑ میں چاکیواڑہ اور بہار کالونی کے سنگم پر ہچکولے کھا رہا تھا۔ سُننے میں آیا تھا کہ یہ ساری کالونی سطحِ سمندر سے کئی فٹ نیچے واقع ہے۔ کنواں کھودنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غیرت مند صرف منڈیر پہ کھینچ کے چُلّو بھر پانی نکال کر محاورے کے بقیہ حصّے پر عمل کر سکتے ہیں۔ حجرے کے سامنے اسی کھدبداتی دلدل میں دس بارہ لڑکے اور مینڈک مثالِ صورتِ خورشید "اِدھر ڈوبے اُدھر نِکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نِکلے۔" لڑکوں کے

★ تُخمیر: خان صاحب کو جس پر غصّہ یا پیار آتا اُسے تخمیر کہتے تھے۔ یہ دراصل مخفف تھا تخمِ خنزیر کا جو شدتِ اختصار اور اگلا دانت نہ ہونے کے سبب تخمیر بن گیا تھا۔ "ظالم" اور "کافر" بھی پیار دُلار میں کہتے تھے۔ مثلاً کوئی مولوی بہت نیک، پابندِ صوم و صلوٰۃ اور کٹّر ہو تو کہتے کہ بہت کافر مُلا ہے!

بے تحاشا بڑھے ہوئے پیٹ نیلے کانچ کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک لڑکا پاجامہ پہنے ہوئے تھا، لیکن قمیض ندارد۔ باقی ماندہ لڑکوں کی نیم برہنگی کی ترتیب اس کے برعکس تھی۔ اسے حجرہ اس لحاظ سے بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک کچّی پکّی مسجد کے زیرِ سایہ تھا، جس کی دیوار پر گیرو سے لکھا تھا "یہ خانۂ خدا ہے۔ خوفِ خدا سے ڈرو۔ یہاں پیشاب کرنا گناہ (صغیرہ) ہے۔" کسی ظالم نے پہلے فقرے اور چیدہ چیدہ الفاظ پر اس طرح کوئلہ پھیرا تھا کہ دُور سے اب صرف "خوفِ خدا سے پیشاب کرنا گناہ (صغیرہ) ہے۔" پڑھا جاتا تھا۔

ہم نے حجرے کی کُنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ طلوع ہوئے۔ ملیشا کی شلوار پر سفید بنیان جس پر جا بجا تازہ خون کے جزیرے بنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں شکاری چاقو جس سے جیتا جیتا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ اپنے "کُتّے" کا ایک کان کاٹ کر زخم کو حُقّے کے پانی سے ڈِس انفکٹ کر چکے تھے اور دوسرے کی قطع و برید کی تیاری تھی۔ کتّے کی ناک ایسی چمک رہی تھی جیسے ابھی ابھی وارنش کا پُچارا پھیرا ہو۔ پوچھا، خان صاحب! یہ کیا؟ بولے، حلوائی کے اس حرامی پلّے کو شکاری کتّا بنا رہا ہوں۔ مردان میں جوان گبرو گھوڑے کو آختہ کر دو، چُوں نہیں کرتا۔ یہ نامرد کان کٹوانے میں اتنا چیغہ★ (واویلا) کرتا ہے۔ آپکا کراچی بھی عجب شہر ہے۔ نہ خوئے مرداں نہ روئے زناں۔ ان کا خیال تھا کہ کان کٹوانے کے بعد کتّا زیادہ وفادار ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی دغا نہیں کرتا۔ اس کا نام انھوں نے رَیڈ کلِف رکھا تھا۔ کچھ دیر مسالہ پیسنے کی سِل پر چاقو تیز کرنے کے بعد ہماری ہتھیلی پر ایک پیسہ رکھ کر کہنے لگے "اس تخمیر کا خُون پتلا ہے۔ ذرا لپک کر پھٹکری تو لے آؤ۔" ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ایک پیسہ ایک پیسہ اور ایک روپیہ ایک روپیہ ہی کے برابر ہوتا تھا!

ایک پیسے میں پھٹکری کا اتنا بڑا ڈلا آیا کہ 'بقول ان کے' ہمارے کانوں کے لیے بھی کافی وشافی تھا۔ سستا سماں تھا۔ مرزا کہتے ہیں کہ آج فقط ایک ٹب پر جتنی لاگت آتی ہے اس میں اُن دِنوں پیر الٰہی بخش کالونی میں پورا مکان بن جاتا تھا۔ اس کے باوجود بندگانِ خدا جھگیوں میں رہتے تھے۔

★ چیغہ کرنا: (پشتو) ڈاکہ، قتل، اغوا یا کوئی اور سنگین واردات ہو جائے تو سارے قبیلے کا مِل کر تعاقب، شور و غوغا اور تفتیش و مشورہ کرنا۔ اردو میں اس کا مترادف نہیں ہے۔ لہٰذا اسے اُردو ہی سمجھنا چاہیے۔

تنخواہیں کم ضرور تھیں، مگر قیمتیں بھی تو کم تھیں پھر تنخواہیں بڑھیں قیمتیں بھی چڑھ گئیں۔ تنخواہیں اور بڑھیں۔ قیمتیں اس سے زیادہ بڑھ گئیں۔ ملازمت پیشہ طبقہ کی حیرانی بھی دم بدم بڑھتی گئی۔ خان خاناں کا ایک دوہا ہے:

بار بار درجن گھر جھگڑت ٹھاڑھ
جوئی جوئی انگیا سیوت ہوئی سوئی کاڑھ

ناری بار بار درزن کے گھر جا کر جھگڑتی ہے کہ میں تجھے روز انگیا ڈھیلی کرنے کو دیتی ہوں، مگر تو جب سیتی ہے اور تنگ کر دیتی ہے۔ جوانی ایسی بھر کر آئی ہے کہ اسے یہ بھی ہوش نہیں کہ درزن بے چاری تو روز اسے ڈھیلا کر دیتی ہے مگر وہ ایک اور وجہ سے (جس کا بھلا سا نام ہے) تنگ ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ تو صاحبو! یہی نقشہ سفید پوشوں کی تنخواہ کا ہے۔

ہم نے کہا "خان صاحب! انسدادِ بے رحمی جانوراں والوں نے کہیں دیکھ لیا تو چالان کر دیں گے۔ یہ قساوت ہے۔"

"میں ۱۹۴۶ء میں ہنزہ گیا تھا۔ مرغِ زرّیں اور برفانی چیتے کے شکار کو۔ وہاں نیوزی لینڈ کا ایک BIRD-WATCHER مل گیا۔ اس نے بتایا کہ جب میں بچّہ تھا تو گڈریوں اور گلّہ بانوں کو دُنبوں کو اپنے دانتوں سے، جی ہاں دانتوں سے، کاٹ کاٹ کر آختہ کرتے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے تو پھر بھی چھری چھنگری استعمال کی ہے۔"

ایک جھلک حُجرے کی

خان صاحب کے حُجرے کو غور سے دیکھا تو اپنے مکان سے کوئی گِلہ نہ رہا۔ چھت ٹن کی نالی دار چادر کی، جس میں کنستر کی چادر کے تین چار پیوند لگے ہوئے تھے۔ ہر پیوند کے گرد تارکول کا زنجیرہ۔ ایک دیوار میں، چھت سے فرش تک ٹیڑھی میڑھی دراڑیں پڑ گئی تھیں، جن پر پلستر لاغر آدمی کے ہاتھ کی رگوں کی طرح اُبھر آیا تھا۔ دیواروں سے، عبرت اور پلستر ٹپکنے کے علاوہ پچھلے کرایہ دار کے کم رشتوں کے تعلیمی مدارج و مشکلات کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ شہتیر کے وسط میں جو آہنی کڑا تھا اس میں ایک کھُلی ہوئی چھتری اُلٹی لٹکی ہوئی تھی۔ یہی ان کا چھینکا اور الگنی تھی۔ ایک کونے میں ابدالی اس زاویے

سے پسری کھڑی تھی گویا دو بجنے میں بیس منٹ ہیں۔ قریب ہی بارہ سنگھے کا سر آویزاں تھا جس کی ایک آنکھ اور کھال جھڑ چکی تھی۔ ہر سینگ پر کچھ نہ کچھ لٹکا ہوا تھا۔ ایک پر پلاسٹک منڈھا ہوا سولا ہیٹ، دوسرے پر بنیان سُوکھ رہا تھا۔ تیسرے پر بینک کی چابیاں۔ دروازے کی کیل پر ٹنگی ہوئی پتلون پر مکھیاں اپنے نظامِ ہضم کے آثار چھوڑ گئی تھیں۔ لیکن کمرے میں کہیں مکھیاں اُڑتی بھنبھناتی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ سب ہمارے مُنھ پر بیٹھی تھیں۔

دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک چیڑ کا کھوکھا رکھا تھا۔ یہ رَیڈ کلف کی اقامت گاہ تھی۔ اس کی چھت پر ملاقاتی بٹھائے جاتے تھے۔ سرکنڈوں کا ایک بڑا مونڈھا بھی تھا جس کی بان کی سیٹ گل چکی تھی۔ اس میں ایک چھوٹا مونڈھا، جس کی پُشت جھڑ چکی تھی، جڑ دیا گیا تھا۔ دوسرے کونے میں سواتی نمدے پر ایک ماٹ اوندھا دیکھ کر ہم مسکرا دیے تو فرمایا، آپ کے ہاں تو مٹکے صرف پینے، بجانے اور سر پہ رکھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ دالان (جس کا رقبہ دو چارپائیوں کے برابر ہوگا، بشرطیکہ وہ دولہا دلہن کی ہوں۔ یعنی پٹّی سے پٹّی ملی ہوئی ہو) کی طرف کھُلنے والے دروازے میں ایک تاروں کا پنجرہ جھول رہا تھا جو غالباً عجز و فروتنی کی تعلیم دینے کے لیے لٹکایا گیا تھا۔ اس کے نیچے سے جھک کر بڑی احتیاط سے نکلنا پڑتا تھا کہ پنڈے میں سے پانی، باجرے اور بیٹ کی پھواریں پڑتی رہتی تھیں۔ اس میں ایک سہما ہوا خوش رنگ پرند بند تھا۔ پوچھا "اسے کیا کہتے ہیں؟ فرمایا، چکور۔ پوچھا "پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے" والا چکور؟ وہی جو چاند کے گرد چکّر لگاتا ہے؟ بولے، آپ کی طرف لگاتا ہوگا۔ فرنٹیر کا چکور اتنا اُلّو نہیں ہوتا۔ خیبر کے پہاڑوں میں چاندنی کے علاوہ اس کی دل بستگی کے لیے کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ پوچھا، حضور نے دِل بستگی کے واسطے پالا ہے؟ بولے، نہیں۔ ہمارے ہاں چکور نیک شگون کے لیے پالا جاتا ہے۔ دافع بلیّات ہے۔ مالک کی آئی آفت اپنے اوپر لے لیتا ہے۔ پھر ایک دن اچانک مر جاتا ہے۔ جو اس کی علامت ہے کہ مالک کی آئی اس کو آگئی۔ کراچی بھی عجب شہر ہے۔ تین چکور مر چکے ہیں۔ یہ تخمیر بھی پرسوں سے اُونگھ رہا ہے۔ اسے آپ لے جایئے۔ آپ کی حالت تو اس سے بھی زیادہ غیر ہے!

حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ

انھیں مائل بہ کرم دیکھا تو ہمّت بڑھی "خان صاحب! تمباکو کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟"

فرمایا "دو۔ پہلی قسم ورجینیا اور دوسری (ہچکچاتے ہوئے) غیر ورجینیا"۔

پوچھا "صوبہ سرحد میں تمباکو کہاں کہاں پیدا ہوتا ہے؟"

فرمایا "جہاں جہاں کاشت کی جاتی ہے بکثرت پیدا ہوتا ہے"۔

پوچھا "سنا ہے مردان، چارسدّہ، نواں کلی اور تحصیل صوابی میں تمباکو کے آڑھتی پائے جاتے ہیں"۔

فرمایا "جہاں مال ہے وہاں تجارت۔ اور جہاں تجارت ہے وہاں آڑھت ضرور ہو گی"۔

انھوں نے تمباکو کا علم پانی کر دیا۔

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں۔ سرور صاحب نے کچھ دن بعد تمباکو کی تیسری قسم بتا کر ہمارے معلوماتی خلا کو پُر تو نہیں کیا، لیکن اس پر پُل ضرور بنا دیا جس پر سے اینڈرسن کی سواری گزر سکتی تھی۔ فرمایا کہ تمباکو کی توقیر تو سرکارِ عالیہ ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے میں ہم رامپوری پٹھان بڑھاتے تھے۔ منقش چلم میں پُرانے گڑ کا قوام اور دو آتشہ تمباکو کڑوا دو رَسا (دو رَس والا) بغیر توے کے رکھ کر پوری قوت سے کش لگاتے تو ایک ایک بالشت اونچا شعلہ لپک اُٹھتا۔ جس کے سُلفے کا شعلہ زیادہ اونچا جاتا وہی مرد ٹھہرتا۔ سب سے تیز تمباکو رمضانی کہلاتا تھا۔ رمضان میں حقّے کے رسیا اسی سے باجماعت روزہ افطار کرتے۔ پہلا کش لیتے ہی حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بلکہ جہاں لیٹ گئے لیٹ گئے۔ روزہ دار باری باری حسبِ مراتب دم لگا کر روزہ کھولتے اور اسی ترتیب سے حسبِ مراتب بے ہوش ہوتے چلے جاتے۔ رامپوری تمباکو سے کسی کو کینسر ہوتے نہیں دیکھا۔ ہارٹ فیل ہوتا تھا۔ ان کی فاتحہ بھی اسی پر دلائی جاتی تھی۔

خان صاحب کی طبیعت مکدّر ہو چلی تھی۔ ہم نے موضوع بدلنے میں عافیت جانی۔

"جب سے آپ کی دائیں آنکھ کھلی ہے (بائیں ہم نے تو ہمیشہ بند ہی دیکھی۔ مخاطب کا چہرہ بھی شست باندھ کر دیکھتے تھے۔) آپ کو شکار کی دھت ہے۔ کچھ BIG GAME کے بارے

میں بتائیے۔ ہمیں بچپن ہی سے ہاتھی اور وہیل کے شکار کے قصّوں سے دلچسپی ہے۔"

اپنے دلآویز تبسم کے بعد فرمایا "۸ نمبر کی بس میں بیٹھ کر وہیل کا شکار قدرے دشوار ہے۔ آپ علم کے بارے میں بڑے لالچی واقع ہوئے ہیں۔ سب کچھ ایک ہی ہلّے میں جان لینا چاہتے ہیں۔ میرا ماسٹر سردار گردبچن سنگھ مستانہ کہتا تھا کہ پتّر جی! علم بھنگ نہیں افیم ہے۔ اس کا نشہ دھیرے دھیرے رگ و پے میں اُترتا ہے۔ کیا بتاؤں، میرا اُستاد تھا۔ کوردیہہ تھا۔ کل تین مُلّا تھے۔ نزدیک ترین ڈامر کی سڑک ستّر میل دُور تھی۔ بہتوں کے گھروں میں لالٹین تک نہ تھی۔ ماسٹر گردبچن سنگھ کڑکڑاتے جاڑے میں ہری کین لالٹین لے کر نکلتا۔ گھر گھر جا کر لڑکوں کو جمع کرتا۔ اپنے گھر لے جاتا اور وہاں چٹائی پر بٹھا کر ہمیں رات کے گیارہ بجے تک امتحان کی تیاری کرواتا۔ ایک دن اپنے کرپان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "اوئے بقراط دیا پتّرا! سائنس علم دریاؤ ہے۔ بھنگ کا گلاس نہیں کہ سیدھا دماغ کو چڑھا اور چینگا بھلا بندہ بھک سے اُڑ گیا۔ اور ہاں بھنگ چھاننے کے کپڑے کو ریش قاضی کہتے ہیں۔ قاضی قہقہہ والے ق سے۔ جہاں ق اور ک میں ذرا بھی شک ہو وہاں ق لکھا کرو۔"

ت سے تلیر، تیتر اور تلور

"تو آج میں آپ کو سب سے چھوٹے پرندے کے شکار کی ترکیبیں بتاؤں گا۔ پھر بتدریج چرندوں، خطرناک گزندوں، پھاڑ کھانے والے درندوں اور آخر میں کالے سر والے کی باری آئے گی۔ آپ نے تلیر دیکھا ہے؟"

"شیو بناتے وقت روز آئینے میں زیارت کر لیتا ہوں۔"

ادائے خاص کے ساتھ رکوع میں چلے گئے اور گھٹنے پکڑے پکڑے ہماری صُورت دیکھ کر دیر تک ہنستے رہے۔ پھر ارشاد ہوا "چتکبرا ہوتا ہے۔ اِس لیے ابلقہ بھی کہتے ہیں۔ مُٹھی میں دبا لیں تو پتہ بھی نہ چلے کہ خالی ہے یا بھری۔ آپ اسے تنہا کبھی نہیں دیکھیں گے۔ دو تین سو کا جُھنڈ بنا کر بسیرا کرتے ہیں۔ چُٹکی بھی بجادو تو ساتھ بھرّا مار کر اُڑ جائیں گے۔ تلیر صرف فصل کے وقت نظر

آتا ہے۔ فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں کو کھا جاتا ہے۔ اسی لیے حکومت کا تحفظ حاصل ہے۔ چوری چھپے مارنا پڑتا ہے۔ قدرت نے 'کیموفلاژ' کے لیے ایسا رنگ اور شکل بنائی ہے کہ درخت پر بیٹھا پتّوں میں بالکل نظر نہیں آتا۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت اسے چونچ کھولنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ بس اسی سے مار کھاتا ہے۔ آواز پر نشانہ لگایا جاتا ہے۔ اسے مرنا منظور ہے مگر چُپکا نہیں رہ سکتا۔ اس کی زبان کا ماءاللحم سہ آتشہ بنا کر گونگے آدمی کو پلائیں تو سات دِن میں سپٹر پٹر بولنے لگے۔ بے زبان بہو ایک گھونٹ بھی پی لے تو دو دن میں اس کی ساس باؤلی ہو کر مرجائے۔ اور مُردے کی زبان پر دفن سے پہلے ایک قطرہ ٹپکا دیا جائے تو منکر نکیر اس قبرستان کا رُخ ہی نہ کریں۔

"بڑے چھرّے کی تاب نہیں لاتا۔ ڈسٹ (چُورا۔ بہت مہین چھرّے) استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ایک فیر میں سو تلیر گرا لیجیے۔ دو تین تو چھرّوں کے ذرات سے زخمی ہو کر گرتے ہیں۔ پچاس ساٹھ محض آواز کے صدمے سے جاں بحق تسلیم۔ بقیہ دیکھا دیکھی۔ ہاں! ایک بات کا خیال رہے۔ زمین پر گرنے کے خوف سے راستے ہی میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کلمہ پڑھ کر فیر کریں ورنہ مُردار ہو جائے گا۔ ذرا چھری پھیر دو تو بیرسی گردن الگ ہو جاتی ہے۔ چُہے سے بھی زیادہ خوشبودار گوشت، ہڈیاں سوئیوں سے زیادہ باریک اور کُرکُری۔ ہڈّی سمیت کُرکُر کھاتے ہیں۔ شکل و جُثّہ سب کا ایک سا۔ کم از کم انسانی آنکھ نر مادہ میں فرق نہیں کرسکتی۔ تلیر اور اُردو الفاظ کی تذکیر و تانیث معلوم کرنے کے لیے چھٹی حِس درکار ہے۔ ان کی نسل بڑی تیزی سے بڑھتی پھیلتی ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں نر بھی ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اُردو میں تو طلبہ کے بھی نر مادہ ہوتے ہیں۔

اچھا! اب آئندہ اتوار کو تیتر کے شکار پر گفتگو ہوگی۔ میدانی پنچھی ہے۔ لڑاکا۔ ہم جنس کے سوا کسی سے نہیں لڑتا۔ دادو میں ایک از کار رفتہ رئیس نے بیٹے کے عقیقہ پر بیس دیگیں کالے تیتروں کی پکوائی تھیں۔ جشن میں پورا قصبہ مدعو تھا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بچّہ کی پیدائش پر اسے خوشی سے زیادہ تعجب ہے۔ اچھا پرندہ ہے۔ سبحان تیری قدرت! سبحان تیری قدرت!"

عرض کیا "اب تیتر سیانے ہو گئے ہیں۔ سلطان تیری قدرت! سلطان تیری قدرت!"

فرمایا "اس فقرے کی داد کسی اور سے لیجئے۔ میں موجودہ حکومت کے خلاف نہیں ہوں۔ پھر کسی دِن آپ کو سجاول لے چلوں گا۔ جھیل میں پڑی ہوئی مرغابیاں دُور سے ایسی لگتی ہیں گویا ابھی ابھی کسی جلسے میں لاٹھی چارج کے بعد لوگ جُوتے چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں! سُندربن چلیں تو شیر کا شکار بھی کھلوا سکتا ہوں۔ شیر کے شکار میں دو تین سو آدمی چاروں طرف سے ہانکا کریں تو سب سے پہلے سؤر نکلتے ہیں!"

عرض کیا "سیاست میں بھی یہی ہوتا ہے۔"

بولے "پھر وہی! آپ نے بسٹرڈ (تِلور) دیکھا ہے۔ کوہستانی چڑیا ہے۔ ٹھٹھّہ کے پاس مراد آباد کی پہاڑیوں میں نومبر سے اُترنی شروع ہوتی ہے۔"

کہا "تو آج کا سبق ہوا: ت سے تلیر، تیتر اور تِلور۔ اور تمباکو؟"

فرمایا "کبھی بیٹھور مورنی کے کوفتے کھائے ہیں؟ بڑے خستہ ہوتے ہیں۔"

آپ سے تم، تم سے تُو ہونے لگا

اگلے اتوار کو شکار پر جانے کا وعدہ کر کے ہم تمباکو سے متعلق جو باتیں انھوں نے تعلیم فرمائی تھیں اپنے سینے سے لگائے رخصت ہوئے۔ پیر کو بینک میں دوپہر تک تو دونوں ہی لیے دیے رہے۔ سہ پہر کو پشتو کی تین چار دِلکشا گالیوں سے حجابات من و تو اٹھ گئے۔ آپ سے تم، تم سے تُو ہونے لگا۔ تین چار دن میں ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں اس طرح داخل و دخیل ہو گئے کہ خود بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون کس میں گھُسا ہوا ہے۔ ہماری کیا مجال کہ چھوٹے منہ سے بڑی بات کہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی خربوزہ یہ دعویٰ کرے کہ وہ دستہ تک چھُری میں گھُس گیا ہے!

جمعرات تک بے تکلفی اس حد تک بڑھ گئی کہ ہم نے کہا آپ گرد، ہم چیلے۔ کسی دِن غریب خانے پر بھی تو تشریف لائیے۔ فرمایا آپ کا غریب خانہ کہاں ہے؟ عرض کیا پیر الٰہی بخش کالونی میں۔ یہاں سے ۸ میل۔ فرمایا راستے میں کوئی شکار شکور ہے؟ ہم چُپ ہو رہے۔ کیا

کہتے ہے
انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی فاختہ نہیں ہے

ہمیں آزردہ دیکھا تو دلجوئی فرمائی "دعوت سر آنکھوں پر۔ مگر بُرا نہ مانیے گا۔ کراچی میں آپ لوگ پلاؤ میں برابر کا گوشت ڈالتے ہیں۔ ہم دُگنے کے عادی ہیں۔" ہم نے ذرا بُرا نہ مانا اس لیے کہ اپنے بیان کے اس حصے میں جس کا تعلق ہمارے پلاؤ سے تھا، انھوں نے پہلے ہی ۹۰ فیصد گوشت زیادہ ڈال دیا تھا۔ ورنہ کیا فدوی کیا فدوی کا شوربہ۔ پھر ارشاد ہوا آپ چار سدہ آئیں تو رِیتا کھلاؤں گا۔ سالم دُنبے کو اسی کی کھال میں لپیٹ کر اسی کی چربی میں انگاروں پر بھونتے ہیں۔ قصبہ شب قدر کے دُنبے کا گوشت بڑا میٹھا اور حلوان ہوتا ہے۔

گلے میں نتھیا گلی

شامتِ اقوال، ہمارے مُنھ سے نِکل گیا کہ فاختہ امن و آشتی کی علامت ہے۔ اور کبوتر تو بڑا ہی بھولا پنچھی ہے۔ اسے مارنا مہاپاپ ہے۔ کہنے لگے، رام رام! تو بیٹی برہمن کی، کیا جانے ماس کا سواد۔ ماسٹر گوربچن سنگھ، خدا اُسے معاف کرے، کہتا تھا کہ مسلمان کسی جانور کو زندہ نہیں دیکھ سکتے، سوائے سوٗر کے! آپ کو شاید علم نہ ہو، اگلے وقتوں میں کسی رئیس کو ادھیڑ عمر میں لقوہ ہو جاتا —— جو اکثر ہوتا تھا —— تو حکیم اس کا علاج جنگلی کبوتر کے بازوؤں کی گرم پھڑپھڑاہٹ اور ہریالی بنڑی کے آنچل کی ہوا سے کرتے تھے۔

خان صاحب ہر سولھویں منٹ ایک سگرٹ پیتے تھے۔ اس میں پندرہ منٹ اپنے ہاتھ سے سگرٹ "مینوفیکچر" کرنے کے ہوتے تھے اور ایک منٹ پینے کا۔ سگرٹ سلگانے سے پہلے پنکھا بند کر دیتے۔ فرماتے کہ ہوا سے سگرٹ شتابی ختم ہو جاتا ہے اور سارا دُھواں ضایع جاتا ہے مہین کاغذ پر تمباکو کی تہ جماتے۔ ہر پتی، ہر ریزے کا رُخ درست کرتے۔ بیچ میں پیپرمنٹ کی ایک سلائی رکھتے اور تھوک سے چپکا کر بر فیلے کش لیتے اور سگرٹ نہ پینے والوں کی محرومی پر ایک منٹ تک مسکراتے رہتے۔

"آپ اس کھکیڑ میں کیوں پڑتے ہیں؟ بنے بنائے سگرٹ کیوں نہیں پیتے؟" ہم نے پوچھا۔

"ریڈی میڈ سگرٹ؟ آپ نے کبھی تخمی آم چوسا ہے؟"

"جی ہاں! ہزار بار۔"

"اگر کوئی تخمی کا رس نکال کر بلوریں فنجان میں پیش کرے تو سچ بتائیے کیا وہی مزہ ہوگا جو بقلم خود دوہنے میں آتا ہے؟"

"ایک تخمی ہمیں بھی عنایت ہو۔"

فوراً یعنی پندرہ منٹ میں ایک سگرٹ بنایا اور اس میں پیپر منٹ کی سب سے تندرست سلائی رکھی۔ ہم نے جو آنکھ میچ کر دم لگایا تو گلا نتھیا گلی ہوگیا۔ (جن پڑھنے والوں کی سمجھ میں یہ استعارہ نہ آئے اُن سے درخواست ہے کہ اس ترکیب سے سگرٹ بنا کر کش لگائیں۔ اور اگر اس میں زیادہ محنت اور صرفہ نظر آئے تو نتھیا گلی جا کر دیکھ لیں۔)

پوچھا "آپ پائپ کیوں نہیں پیتے؟" فرمایا "پائپ سے صرف ان لوگوں کو آرام آتا ہے جو نہ سگرٹ کی استطاعت رکھتے ہیں، نہ حقّے کی طاقت۔" دس برس پہلے مردان میں انھوں نے حُقّہ شروع کیا تھا لیکن پہلے تو ان کی اہلیہ نے غالب کی بیوی کی طرح ان کے کھانے پینے کے برتن الگ رکھے۔ پھر خود انہیں بھی الگ رکھنے لگیں۔

سینیچر کو پوچھنے لگے "تو پھر کل چل رہے ہیں شکار پر؟ شاگردی کے لیے کل کا دن سعد ہے۔ ۸ تاریخ ہے۔ ۸ میرا لکی نمبر ہے۔"

"چلنے کو تو چلے چلیں گے۔ مگر ایک گزارش ہے۔ وہ یہ کہ دورانِ سفر و شکار، سرکار کوئی گالی نہیں دیں گے۔"

"منظور۔ مگر ایک شرط پر۔ آپ بھی کوئی شعر نہیں بکیں گے۔ دفتر کی اور بات ہے۔ باہر بندہ کوئی لغو و مہمل بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

"لیلیٰ بھی ہم سفر ہو تو مہمل نہ کر قبول!"

"پھروہی! آپ کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے؟ گولکنڈہ کے سلطان کا ایک مہمل شعر سُن کر جہانگیر بادشاہ اس قدر برافروختہ ہوا کہ فی الفور گولکنڈے پر چڑھائی کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ جہانگیر اگر آج زندہ ہوتا تو خدا کی قسم مغل فوج تمام عمر آپ کا محاصرہ کیے پڑی رہتی۔"

— ۴ —

ہماری نسینی اور ناسٹل جیا

بینکوں میں اتوار رورو کے آتا ہے اور سوموار رُلا رُلا کے جاتا ہے۔ اتوار کو ذرا دیر سے آنکھ کھُلی اور ہم بہار کالونی والی بس سے اُترے تو دیکھا کہ خان صاحب ہماری پذیرائی کے لیے بس اسٹینڈ پر آدھ گھنٹے سے کھڑے سگرٹ بنا رہے ہیں۔ معانقہ، مصافحہ اور سلام ہوا۔ (جی ہاں! اُن کے ہاں اظہار و اخراجِ خلوص کی یہی ترتیب تھی) ایسی قبائلی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے کہ ہم بڑی مشکل سے بقیہ رسوم کی ادائیگی کے لیے خود کو ان کے شکنجۂ خلوص سے آزاد کرا سکے۔ اگر ہم اپنے سینے پر اس طرح ہاتھ نہ باندھ لیتے جیسے جنّتی بیبیاں نماز پڑھتے وقت باندھ لیتی ہیں، تو چار پانچ پسلیاں ٹوٹ چکی ہوتیں۔ قبائلی معانقہ میں باہمی خلوص کا اندازہ ان پسلیوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے جو اس فعل کے دوران ٹوٹ جائیں اور مردانگی کا اُن سے جو بچ جائیں۔ ہمارے دُبلے پن اور اُبھری ہوئی پسلیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے بولے کہ آپ کو سینے سے لگا کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا بانس کی نسینی سے بغلگیر ہو رہا ہوں!

ازاں بعد بجلی کے کھمبے سے لگی ہوئی سائیکل اٹھائی۔ ہم نے کہا "یہ تو پطرس کی سائیکل معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں تو۔ میری ہی ہے۔ کیا وہ بھی چاکیواڑہ میں رہتا ہے؟"

اس کے شمشیر برہنہ ڈنڈے پر بٹھا کر ہمیں اپنے گھر لے چلے۔ ہم نے پیچھے آرام دہ کیریر پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے اجازت نہیں دی۔ کہنے لگے "اوّل تو یہ سیٹ جنگلی بکرے کی لاشِ فانی کے لیے 'ریزرو' ہے۔ دوم، ہمارے یہاں مہمانِ عزیز کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ مہمان کسی وقت بھی پیچھے سے چھُرا گھونپ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے تاریخ کا ٹھیک سے

مطالعہ نہیں کیا۔ تاریخ پڑھنے سے تین فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بزرگوں کے مفصّل حالات سے آگاہی کے بعد دورِ حاضر کی حرمزدگیوں پر غصّہ نہیں آتا۔ دوسرے حافظہ تیز ہو جاتا ہے۔ تیسرے لاحول ولا! تیسرا فائدہ ذہن سے اتر گیا۔ کراچی بھی عجب شہر ہے۔ ہاں! تیسرا ابھی یاد آگیا۔ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، بھائیوں کے ساتھ سلوک کے مغلئی آداب سے واقفیت پیدا ہوتی ہے۔ آگے بیٹھنے پر یاد آیا کہ شاہجہاں کے زمانے میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ مہاوت شاہی عماری کے آگے بادشاہ کی طرف پُشت کرکے بیٹھتا ہے جو سراپا سوئے ادب ہے۔ چنانچہ ہمارے اپنے علاقہ غیر سے ایک نجیب الطرفین سیّد صاحب امپورٹ کیے گئے جو مہاوت کی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بادشاہ کی طرف مُنھ کرکے بیٹھتے تھے۔ تعجب ہے بادشاہ کو یہ خیال کبھی نہ آیا کہ گستاخ ہاتھی اس کی طرف مستقلاً پیٹھ کیے رہتا ہے!"

اس پر ہم نے کہا "راجستھان کے راجپوتوں میں اُلٹا دستور ہے۔ اونٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کے انداز نشست کو دیکھ کر ایک میل دُور سے بتا سکتے ہیں کہ وہ سوار کی بہن ہے یا بیوی۔ بہن کو راجپوت سردار ہمیشہ آگے بٹھاتے ہیں تاکہ وہ خدانخواستہ گر پڑے تو فوراً پتہ چل جائے۔ بیوی کو پیچھے بٹھاتے ہیں۔"

"اور محبوبہ کو؟"

"اغوا کے لیے دیس میں ہمیشہ گھوڑے استعمال ہوتے ہیں۔"

"دیس میں!!! آپ کا من ابھی تک میرا بائی کے دیس میں اٹکا ہوا ہے پنڈت یوسفی! ریت کے ٹیلے، بنجر زمین، اونٹ، حدیہ کہ ٹھ، ڈھ، ڑھ دیکھ کر آپ ناسٹل جک ہو جاتے ہیں! آپ کے دیس جے پور میں لے دے کے ایک جھیل تھی۔ سانبھر جھیل۔ اور یہ سڑاندی کھاری جھیل ہے جو سارے ہندوستان کو نمک سپلائی کرتی ہے۔ آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ برہمنوں کا دھرم اپنی رسوئی میں مسلمان کے تھاپے ہوئے اُپلے جلانے سے بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ پاکستان کا دانا پانی کھاتے اتنے دن ہو گئے۔ مگر اب بھی وہی رَٹ میں چنے مٹر کے کھالوں گی تو لے چل جمنا پار "تھان ہے تھان!★

★ گھوڑا جیسے ہی آکر تھان پر کھڑا ہو رہا ہو اور اچانک ڈر کر ہنہنانے، بدکنے لگے تو سائیس یہ یاد دلا کر کہ یہ تو تیرا اپنا تھان ہے اس کی جھجک اور ڈر نکالتا ہے۔

یہ پاکستان ہے۔ آپ بھی کس پوپلی، پلپلی، پوپلی زمین کو یاد کرتے ہیں جس میں کشور کشا شہ سوار اپنے نیزوں سے خیمے بھی نہ گاڑ سکیں۔ کبھی آکر خیبر کی سرزمین دیکھیے۔ ذرا بے ادبی سے پاؤں بھی پڑ جائے تو ٹن ٹن خطرے کا الارم بجاتی ہے۔ گولیوں کے منھ پھیر دیتی ہے۔"

وہ تلملا گئے تھے۔ ہم نے کانٹا بدل کر گمبھیر فلسفیانہ سوال کیا:

"عورت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اکثر خیال آتا ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"عجیب بات ہے، ہم نے بار بار راجپوتوں کی غیرت و شجاعت کی داستانیں سنائیں۔ ذرا جو متاثر ہوئے ہوں۔ ایک دن برسبیل تبصرہ ہم نے کہا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء تک جب ہم جے پور سے چلے ہیں، بناسپتی گھی بیچنا، خریدنا، بنانا، رکھنا اور کھانا راجستھان کی حدود میں تعزیری جرم تھا۔ چھ مہینے کی قید بامشقت ہوتی تھی۔ پھڑک اٹھے۔ بولے یہ بات ہوئی۔ اس کے بعد کبھی راجپوتوں کا ذکر آتا تو بڑی توجہ اور احترام سے سنتے۔

ہم تازہ تازہ ہندوستان سے گردِ مسافرت و مہاجرت جھاڑتے وارد ہوئے تھے۔ ایک نئے جنم اور آدرش کی آرزو میں اپنا زائد المیعاد نال نہ صرف برضا و رغبت بلکہ خود اپنے دستِ شوق سے کاٹا تھا۔ گھاؤ بھر چلا تھا، پر بھرتے زخم کی میٹھی میٹھی سلسلاہٹ کا ہنوز یہ عالم کہ

جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

اسی عالم میں ایک دن ان سے پوچھا:

"آپ کو ہندوستانی کلچر پسند نہیں؟"

"اس کے جو حصے ہمیں پسند آتے ہیں، ان سے بے شک نکاح کر لیتے ہیں۔"

شکار کو روانہ ہونے لگے تو انھوں نے ہمیں سختی سے تنبیہ کی کہ شکار پر روانہ ہونے سے پہلے چاقو کا نام ہرگز ہرگز نہیں لینا چاہیے۔ شکار نہیں ملتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ پھر ایک چھاگل پانی کی (جو بآسانی ایک اونٹ کو سیراب کر سکتی تھی) اپنے گلے میں ڈالی اور ایک تھیلا مونگ پھلیوں کا ہمارے گلے میں حمائل کرنا چاہا تاکہ دونوں ہاتھ، جن سے آگے چل کر بہت سے کام لینے تھے،

خالی رہیں۔ ہم نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا "ہم مونگ پھلی نہیں کھاتے۔" بولے "ہم نے تمام عمر بادام کھائے ہیں۔ مگر اس میوہ میں کیا خرابی ہے؟" عرض کیا "مونگ پھلی اور آوارگی میں خرابی یہ ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع کردے تو سمجھ میں نہیں آتا ختم کیسے کرے۔" ہماری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مونگ پھلی کا توبڑا انھوں نے اپنی گردن میں لٹکالیا۔ ہم چیختے چلاتے ہی رہ گئے اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے کھال ہمارے کندھے پر ڈال دی "اونٹھ اڑاندے ای لدّی دے نیں۔" (اونٹ کو بلبلاتے ہوئے ہی لاد دینا چاہیے۔ یہ انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ اونٹ بلبلانا بند کرے تو ہم لادنا شروع کریں۔)

پوچھا فواکہات میں حضور کو کون سا میوہ مرغوب ہے؟ فرمایا نکاح کا چھوارا!

ساڑھے آٹھ بجے ہم دونوں سائیکل پر منگھوپیر کی پہاڑیوں کی طرف جنگلی بکرے کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد ہمیں کیریر پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ ذرا دیر بعد ہانپتے ہوئے کہنے لگے "اب آپ پیچھے بیٹھے بیٹھے آرام سے پیڈل ماریئے، میں ہینڈل چلاتا ہوں۔ ذرا احتیاط سے پیڈل ماریئے گا۔ کراچی کا ٹریفک باؤلا ہے۔"

حسب الحکم، ہم ان کی کمر پکڑ کے پیڈل سے زور آزمائی کرنے لگے۔ سائیکل چلانے کے اس طریقہ کا ایک نہایت باریک قانونی نکتہ انھوں نے یہ بتایا کہ پولیس ڈبل سواری کے جرم میں دونوں میں سے کسی کا چالان نہیں کرسکتی۔ جو ہینڈل پکڑے ہوئے ہے وہ پیڈل مارنے کا مرتکب نہیں اور جو پیڈل ماررہا ہے اس کا بقیہ سائیکل سے کوئی قانونی تعلق نہیں! اگر آپ کو مجسٹریٹ نے ایک مہینے کی بھی سزا کی تو تجھیز کے پاؤں کے ناخن کھینچ لوں گا اور پیدل علاقہ غیر میں لے جاکر پُراسرار قتل کر دوں گا۔

سائیکل کے وہ تمام فاضل پُرزے اور آرائشی تکلفات جن کا شمار میکانکی عیاشی میں ہوسکتا تھا خود کو سپردِ خاک کرچکے تھے۔ اور دیکھنے میں اب یہ ڈھانچہ سائیکل کا ایکس رے معلوم ہوتا تھا ہینڈل پر نہ جلنے کیسے ایک آئینہ لگا رہ گیا تھا جس کا بظاہر یہ مصرف معلوم ہوتا تھا کہ سوار کو پتہ چلتا رہے کہ پچھلا پہیہ ابھی تک سائیکل میں لگا ہوا ہے یا نہیں۔ پوچھا "اس میں تیل کیوں نہیں دیتے؟" بولے "تیل دینے میں جھنجھٹ یہ ہے کہ پھر گھنٹی لگانی پڑے گی۔" سائیکل کے مڈگارڈ ہی نہیں بریک بھی غائب

تھے۔ لیکن چلانے کے بعد بریک کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ سائیکل کا جو پُرزہ جس جگہ تھا، وہیں سے بریک کا کام کرتا تھا۔ تاہم ہمارے سپرد یہ کام تھا کہ جیسے ہی وہ اشارہ کریں، ہم جُوتے کی ایڑی سے ننگے پہیّے کو آگے بڑھنے سے باز رکھیں۔ چار پانچ میل بریک لگانے کے بعد دائیں ایڑی جھڑ کر کہیں گر گئی۔ خان صاحب نے بائیں ایڑی استعمال کرنے کا اشارہ کیا تو ہمیں حکم عدولی کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ اُستادی شاگردی اپنی جگہ، لیکن اس سے تو آپ کو بھی اتفاق ہوگا کہ ایک پاؤں سے لنگڑانا دونوں پاؤں سے لنگڑانے سے بہتر ہے۔

وہ جو پنجابی مثل ہے کہ گدھے کا ایک میل اور کمہار کا سوا میل، سو وہ ہم پر میل بہ میل صادق آئی۔ یارائے ضبط نہ رہا تو ہم نے شکایت کی کہ کیریر بہت چُبھ رہا ہے۔ بولے آپ میری سیٹ پر بیٹھ کر دیکھیں تو پتہ چلے چُبھنا کسے کہتے ہیں۔ آپ کو مغالطہ ہُوا ہے۔ آپ کے کُولھوں پر گوشت نہیں ہے۔ یہ دراصل آپ ہی کی ذاتی ہڈّیاں ہیں جو آپ کے چُبھ رہی ہیں۔ آپ کے اگر کولھے ہوتے تو آج یہ نقشہ نہ ہوتا کہ ذرا پائنچہ سائیکل کی چین میں آگیا تو ساری پتلون اُتر کے ٹخنوں پہ آرہی۔ دراصل آپ کے یہاں کمر سے لے کر ٹخنوں تک پتلون کے لیے کوئی روک ہی نہیں۔ خیر سے ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ اس سِن میں تو کولھے نئی فصل کے پہلے گرمے (خربوزے) کی مانند ہوتے ہیں۔ آپ نے لختیٔ ناچ دیکھا ہے؟ خون ہو جاتے ہیں۔"

"ہماری تربیت نہایت پاکیزہ ماحول میں ہوئی ہے۔ جوانی میں ہم نے مور کے ناچ کے علاوہ اور کوئی ناچ نہیں دیکھا۔"

اُتر کر رکوع میں چلے گئے: "پھر بھی! آپ لوگ خوش ہوتے ہیں تو مُجرے، مشاعرے کرواتے ہیں۔ آتشبازی چھوڑتے ہیں۔ لیکن ہم ہر جذبے کی ترجمانی بندوق سے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں فلم کا کوئی گانا یا مکالمہ پسند آئے تو ناظرین بتمکین اس کی داد پستول سے دیتے ہیں۔ ڈِشُوں ڈِشُوں! ہال میں جتنے زیادہ پستول چلیں، اتنا ہی مالک خوش ہوتا ہے کہ فلم ہِٹ ہوگئی۔"

"گولی چھت سے ٹکرا کر اُلٹی تماشائیوں کو نہیں لگتی؟"

"چھت ایسی بناتے ہیں کہ بارش اور گولی کو گزرنے میں تکلیف نہ ہو۔"

خان غلام قادر خان

فرلانگ بھر مکالمے کے بعد ہم نے چھبن سے بے قرار ہو کر خود کو ہتھیلیوں کے جیک پر اٹھا لیا تو کہنے لگے آپ یہ بندروں کی سی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں؟ عرض کیا بندر میں ہمیں اس کے علاوہ اور کوئی عیب نظر نہیں آتا کہ وہ انسان کا جدِ اعلیٰ ہے۔ دیگر احوال یہ کہ کیریر کا ایک انچ گہرا سانچہ ہمارے جسم پر نقش ہو چکا ہے اور اب اس میں ایسے کئی کیریر ڈھالے جا سکتے ہیں۔

دونوں ہاتھ چھوڑ کر تالی بجائی۔ پھر اس چرمی میخ کو جس پر وہ بیٹھے تھے اپنی رانوں سے دباتے ہوئے اپنے دادا خان غلام قادر خان کا قصہ سنانے لگے کہ انھوں نے ایک دفعہ اپنی رانیں بھینچ کر ایک منھ زور گھوڑے کی پسلیاں توڑ دی تھیں۔

ہم نے کہا "آپ کے دادا جانی مرحوم . . ."

قطع کلام کرتے ہوئے بولے "دادا جانی؟ جان کیا مطلب؟ آپ ریختی کب سے بولنے لگے۔ وہ خان، ابنِ خان، ابنِ خان تھا۔"

"آپ کے دادا خان اور ابا خان مرحوم تو بہت غیور اور خونخوار ہوں گے؟ تلوار، جی نہیں، بندوق کے دھنی ہوں گے؟"

مونگ پھلی کی ٹھنگنی جھلّی اتارتے ہوئے بولے "اس شک میں آپ کو شبہ کیوں ہوتا ہے؟ ایک دفعہ کا ذکر ہے، میرا دادا موضع نواں کلی، تحصیل صوابی، ضلع مردان میں (نوٹ کر لیجیے۔ یہ خطہ تمباکو کا دل ہے۔ پھر نہ کہیے گا میں تمباکو کے متعلق کچھ بتا کے نہیں دیتا) ہاں تو میرا دادا خان غلام قادر خان موضع نواں کلی میں سڑک پر گولی کھیل رہا تھا۔ اردو والی کچی گولی نہیں۔ اصلی کانچ کی گولی۔ سات سال کا تھا۔ اتنے میں انگریز ڈپٹی کمشنر سفید گھوڑے پر سوار ادھر آ نکلا۔ تخمِ نیشکر نے بڑے توہین آمیز لہجے میں اپنے اردلی کو حکم دیا کہ اس ڈیم چھوکرے کو ہمارے رستے سے ہٹا دو۔ میرا دادا غصّے سے قندھاری انار ہو گیا۔ یہ بندوق تو خیر گھر پر تھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، گلے میں لٹکی ہوئی غلیل میں وہی شیشے کی گولی بھر کر ایسی تاک کے ماری کہ ٹھیک نشانے پر یعنی تخمیر کی دائیں آنکھ میں جا کر بیٹھ گئی اور ایسی

فِٹ ہوئی کہ نکلے سے نہیں نکلی۔ تمام عمر وہی لگائے پھرا۔

ہم نے پوچھا "اس زمانے میں نواں کلی میں ورجینیا تمباکو پیدا ہوتا تھا؟"

جواب ملا "وہ شیر دل اور غیرت مند پٹھان تھا۔ ایک دفعہ کسی کام سے درّہ گیا۔ وہاں ایک حجرے کے سامنے چارپائی پر شمروز خان چادر تانے قیلولہ کر رہا تھا۔ مہمند قبیلہ کا سردار اور قدیم شناسا تھا۔ میرے دادا نے سلام کیا مگر اس نے لیٹے لیٹے ہی پخیر راغلے! کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ قبائلی آداب کے مطابق تعظیم کو نہ اٹھا۔ میرا دادا اس ہتک سے بہت کبیدہ خاطر ہوا۔ اس کے دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ بارش کے دن تھے۔ دادا خان غلام قادر خان کچّی سڑک پر کھڑا خوانین سے ہنس بول رہا تھا کہ سامنے سے شمروز خان کیچڑ میں پچاپچ کرتا، آتا ہوا دکھائی دیا۔ دادا وہیں چادر اوڑھ کر کیچڑ میں لیٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا غلام قادر خان خیر تو ہے؟ دادا نے جواب دیا۔ اس کا خانہ خراب ہو۔ شمروز خان نے مجھ سے لیٹے لیٹے ہاتھ ملایا تھا۔ مَیں بھی لیٹے لیٹے ہی ملاؤں گا۔"

"تمباکو کی فصل منڈی میں کب آتی ہے؟"

سوال کا نوٹس نہ لیتے ہوئے بیان جاری رکھا "خان غلام قادر خان سرداروں کا سردار تھا۔ بغیر کُلاہ کے ساڑھے چھ فٹ قد۔ ڈِنڑ کی مچھلیاں اتنی سخت کہ حجّام ان پر اُسترا تیز کر لیتا تھا۔ ۹۸ سال کی عمر پائی۔ ایک محفل میں بنارس کی بتو طوائف ناچتے ناچتے ان کے سامنے آئی۔ نہ جانے کون سی ادا بھا گئی۔ اپنی ہتھیلی پر کھڑی کو اُدھر اُٹھا لیا۔ تخت پر سوتا تھا۔ مگر جب تک اس پر اس کا مخصوص گدّا بچھا نہ ہو، نیند نہیں آتی تھی۔ اس میں کافر دشمنوں کی مونچھیں بھری تھیں۔ ناشتے میں بارہ انڈے سالم نگل جاتا تھا۔"

"سالم؟!!" ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی ہاں! مَیں نے تو کسی مُرغی کو نصف انڈہ دیتے نہیں دیکھا۔ آخری وقت تک دانتوں سے دُنبے کی نلی توڑ کر گودا نکال لیتا۔ بُھنا ہُوا آدھا برّا چٹ کر کے پاراچنار کے ایک درجن سیب کھا جاتا تھا۔ کبھی دیکھے ہیں؟ چترالن کے گال جیسے ہوتے ہیں۔ پاراچنار سے آگے جو فلک بوس پہاڑ ایران، افغانستان اور پاکستان کی سرحد کا سنتری ہے اسے کوہ سفید کہتے ہیں۔ سارا پہاڑ کالا سیاہ

اور ننگا ہے۔ صرف چوٹی پر برف کی 'بیکنی' (BIKINI) بارہ ماس اٹکی رہتی ہے۔ دادا نے یہاں دو برفانی چیتے مارے تھے۔ ننھیال کی طرف سے اس کی رگوں میں تاتاری خون تھا۔ وہ جب جوش مارتا تو اس کا پرنانا گھوڑی کا دودھ ضرور چکھ لیتا تھا۔ چالیس سفید گھوڑیاں علیٰحدہ اصطبل میں بندھی رہتی تھیں، جہاں مَردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ گھوڑے کے سوا کوئی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے رخساروں پر سنہری رُواں چمکا اور آواز دو شاخہ ہونے لگی تو باپ کے حکم کے مطابق ۱۰۱ چڑیاں، پَیر باندھ کر علی الصبح اس کے سامنے ڈال دی جاتی تھیں۔ اور وہ اپنے جوتوں تلے ان کے سر یکے بعد دیگرے کچلتا چلا جاتا تھا۔ کرڑ کرڑ کرڑ۔ ایک سال تک یہی معمول رہا تاکہ دل مضبوط ہو جائے۔ میرا دادا بھی گھوڑوں کا شیدائی تھا۔ دو میل دُور سے، ٹاپ سے پہچان لیتا تھا کہ گھوڑے پر کوئی چوڑی چھاتی والا شیر دلیر سوار ہے یا بُزدِلا۔ کبھی رکاب پر پاؤں رکھ کے گھوڑے پر نہیں چڑھا۔ جب وہ دشمن کے تعاقب میں رات کو تورخم کے پہاڑی راستوں میں گھوڑا ڈالتا تو دُور دُور تک سُموں سے چھوٹتی ہوئی چنگاریوں کی جگمگ جگمگ ..... DOTTED LINE بن جاتی تھی۔ شب و روز شہسواری کے سبب اس کی ٹانگیں بریکٹ ( ) کی طرح مُڑ گئی تھیں۔ اس نے پورے ۴۹ سال یعنی اپنی نصف زندگی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر گزاری۔"

"اور بقیہ نصف؟"

"اس نے گیارہ عورتیں کیں۔ کھرا، نر آدمی تھا۔ بغیر ڈھال اور زرہ بکتر کے تلوار چلاتا تھا۔"

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کے دادا مرحوم و مغفور کے پاس یہ بندوق تھی۔"

"ہاں! تھی۔ مگر بندوق سے صرف کافروں کو جہنم رسید کرتا تھا۔ قبائلی رشتہ داروں اور مسلمانوں کو تلوار سے شہید کرتا تھا۔"

کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے؟

ہماری تمباکو کی کھڑی فصل کو پالا مار گیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے چھیڑا "مرشدی! آپ نے بھی کبھی عشق کیا؟"

بندوق چھتیاتے ہوئے بولے "خدارا! خاموش رہیے۔ مجھے جنگلی بکرے کی مست بُو آرہی ہے۔ بوک بجرا لگتا ہے۔"

ہم نے مولی کی بھجیا اور پراٹھے کی باقی ماندہ ڈکار نگلتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے راکھ کو پھر کریدا "خان صاحب! آپ نے کبھی عشق بھی کیا؟"

"آپ کی مُراد لونڈے سے ہے، یا زنخے سے؟" وہ خود استہزائیہ پر اُتر آئے۔

"آپ کو کبھی کوئی عورت اچھی لگی؟"

"مَیں نے تو کوئی جوان عورت بدصورت نہیں دیکھی۔ مگر آپ بھی تو اپنے پتّے دکھایئے۔ کبھی کسی کو تختۂ عشق بنایا؟ شادی والدین کی پسند سے کی یا ــــــ؟"

"کِس کے والدین؟"

"میرا مطلب ہے شادی والدین نے طے کی یا اپنی پسند سے کی؟"

"مَیں نے اپنی بیوی کی پسند کی شادی کی۔"

رکوع میں چلے گئے۔ "اپنی شادی تو اِس طرح ہوئی جیسے لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ اچانک۔ بغیر مرضی کے۔"

کچھ دیر بعد استفسار فرمایا "شادی کے بعد کوئی شکار شکُور ہوا یا مچان پہ ٹنگے ٹنگے ہانکا شانکا ہی دیکھتے رہے۔ کوئی AFFAIR؟"

"مفلسی وجہ پارسائی ہے۔"

"تو مفلس ہی سے سہی۔"

"بحمداللہ! ہم بہت قانع اور مُقمَح ہیں۔"

"یہ مُقمَح کیا بلا ہوتی ہے جی؟"

"مقمَح اس اونٹ کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ سیر ہو کر حوض پر سر اونچا کر کے کھڑا ہو جائے۔"

"قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ یہ لفظ تم نے کِس سے سیکھا؟"

"جمعہ کے خطبہ میں مولوی خیرالدین نے اس کے فضائل بیان کیے تھے"۔

"تو یوں کہو۔ مولوی چاکیماڑہ ہی میں رہتا ہے۔ اس کی تو دو بیویاں ہیں۔ تیسری مولویائن چند روز ہوئے موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور کیا کیا فضائل بیان کئے تھے اس مُقّمِح نے؟"

"شرابِ طہور، حور و غلمان اور دیگر لذائذ کا ذکر فرمایا تھا اور کہا تھا کہ جو مومن اپنی نظریں نیچی رکھے گا اور پاک دامن رہے گا، اس کو بہشت میں اپنی ہی بیوی حُور کی شکل میں ملے گی"۔

"خو! پھر مرنے سے فائدہ ہی کیا ہوا؟"

رَیڈ کلف سے ہماری بے تکلّفی

اس سفرِ نمونہ سقر میں سب سے کم تکلیف سائیکل کو اٹھانی پڑی۔ بلکہ ہمیں تو سائیکل بھی اٹھانی پڑی۔ آگے آگے رَیڈ کلِف چل رہا تھا اور اس کے نقشِ قدم پر ہم۔ منجملہ دیگر فوائد و فضائل کے، رَیڈ کلِف کا ایک کھلا فائدہ تو یہ نظر آیا کہ لونڈوں نے سائیکل پر پتھر نہیں مارے کتّے کو مارے۔ راستے میں خان صاحب کھُوں کھُوں کھانسنے لگے۔ پُوچھا "کھانسی ہو گئی؟" بولے "ونہہ! کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ سگرٹ کا تمباکو ختم ہو گیا۔ اس سے NICOTINE DEFICIENCY (نکوٹین کی کمی) پیدا ہو گئی ہے"۔ ہم نے کہا "نہیں! آپ کئی دن سے کھانس رہے ہیں علاج کیوں نہیں کراتے؟" بولے "ڈاکٹر شیفیع کو گلا دکھایا تھا۔ فیس لے کر کہنے لگا، سگرٹ چھوڑ دو۔ میں نے کہا، اگر سگرٹ ہی چھوڑنی ہوتی تو تیرے پاس کیوں آتا؟" ذرا دیر دم لینے کے لیے ایک پپیتے کے درخت کے نام نہاد سایہ میں بیٹھے تو ہم نے رَیڈ کلِف کی دُم پر ہاتھ پھیرا کہ یہی حصّہ ہمیں اس کے جبڑے سے دُور ترین نظر آیا۔ علاوہ ازیں اسے خارش بھی ہو رہی تھی۔ ایک مہینے پہلے خان صاحب کو ہو چکی تھی۔ روانگی سے قبل انھوں نے اسے کاربالک صابن سے خُوب رگڑ رگڑ کر نہلایا، لیکن صاحبو، گیلا غسل شدہ کتّا سُوکھے کتّے سے کہیں زیادہ پلید ہوتا ہے۔

ہمیں رَیڈ کلف کی دُم سہلاتے اور ثانی الذکر کو آخر الذکر ہلاتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

کہنے لگے غور کیجیے تو بھونکنا کتّے کا حق اور دُم ہلانا اس کا فرض ہے۔ اس کافر کے سامنے افغان گرے ہاؤنڈ بھی پانی بھرتا ہے۔ آس پاس کی گلیوں کی کُتیاں اس پر جان چھڑکتی ہیں۔

"تو ہی ناداں چند گلیوں پر قناعت کر گیا" ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا یہ بھی غالب کا ہے؟ اس کتّے کی وفاداری کا ابھی سے یہ عالم ہے کہ جس راستے سے میں گزر جاؤں ——— خواہ کتنا ہی پیچدار ہو ——— اس کے دو گھنٹے بعد آپ اسے آنکھوں پر پٹّی باندھ کے چھوڑ دیں تو یہ میری خوشبو لیتا، اس لیک سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوگا۔"

"لیک نہ کہیے۔ شاہراہِ نسوار کہیے۔"

پان اور کلچر کا رچاؤ

نسوار کا نام آتے ہی بگڑ گئے۔ "سرکار مجرا عرض ہے! پان، تمباکو، گلوری، قوام کے بارے میں حضور کی کیا رائے ہے؟"

"پان کی کیا بات ہے! پان میں جب تک کتّھا، چُونا، چھالیا اور کلچر ایک خاص تناسب اور نفاست سے آمیخت نہ کیے جائیں، پان پان نہیں بنتا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ آدمی کو کھانا اپنی بیوی کے ہاتھ کا پچتا ہے اور پان پرائی کے ہاتھ کا رچتا ہے۔ ساجد رضا لکھنوی تو کہتے ہیں کہ گنگا جمنی خاصدان سے ورق لگی گلوری اٹھا کر، صحیح لب و لہجہ اور انداز سے 'آداب عرض!' کہنے کے لیے تین نسلوں کا رچاؤ درکار ہے۔"

"گستاخی معاف! میرا خیال ہے کہ اگر تین نسلیں اس ترکیب سے پان کھالیں تو چوتھی نسل 'آداب عرض!' کرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوگی۔ اور ہاں! یہ بھی تو آپ ہی نے بتایا تھا کہ ماشاءاللہ خاں ماشا کی کہانی 'رانی کیتکی'۔ ۔ ۔"

"انشاءاللہ خاں انشاء کہیے۔"

"چلو بابا یونہی سہی۔ ایک حال کا صیغہ ہے دوسرا مستقبل مشکوک کا۔ 'رانی کیتکی' کی ہیروئن نے اپنے مُنھ کی پیک سے اپنے پریمی کو پریم پتر لکھا تھا۔ اور یہ بھی آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ

جس زمانے میں مٹیا برج میں قیدِ فرنگ میں تھے تو انھوں نے لکھنؤ سے معشوق محل کے ہاتھ کے کٹے ہوئے ناخن اور اپنی ایک چہیتی لونڈی کے پان کا اگال بطور نشانی منگوایا تھا۔ ہم نسوار سے کم از کم یہ کام تو نہیں لیتے۔ محبوبہ کو خط ہم لعابِ دہن سے نہیں، خون سے لکھتے ہیں۔ اپنا خون نہیں۔ دشمن کا۔"

"قبلہ! خط پتّر تو پوسٹ آفس کے ذریعہ ہم جیسے مجبور و اپاہج بھیجتے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ خود مکتوب الیہ کو مع چارپائی اٹھا لاتے ہیں۔"

"اگر ایک لفظ بھی زبان سے اور نکالا تو یہیں تمھارا ریتا بنا دوں گا۔"

ابدالی کی نال کا اگلا حصہ پتلون کی بیلٹ سے ہینڈل کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس کا دھڑ کبھی ہم بائیں ہاتھ سے تھام لیتے، کبھی کندھے پر رکھ لیتے۔ کُندہ پچھلے پہیے سے تین فٹ پیچھے نکلا ہوا تھا۔ ٹائی زیادہ پھڑپھڑانے لگی تو ہم نے اس پر باندھ دی —— جس طرح لوہے اور سریوں کے ٹرک کے پیچھے لال جھنڈی لہرا دی جاتی ہے۔ ہم نے پوچھا ہماری غیر موجودگی میں آپ ابدالی کس طرح ڈھوتے تھے؟ بولے آپ بھی کیسے EMBARRASSING سوال کرتے ہیں! عرض کیا ہم تو محض اپنے علم کو جِلا دینے کی خاطر پوچھ رہے تھے۔ ہماری ہوسِ علم پہ دھیرے سے مسکرا دیے۔ فرمایا بہار کالونی کا ایک ملنگ اتوار کے اتوار منگھو پیر "دے اُس کا بھلا۔ جو نہ دے اُس کا بھلا" کرنے جاتا ہے۔ اسے پیچھے بٹھا لیتا ہوں۔ اندھا ہے۔ آنکھوں والے سب فقیر اس پر رشک کرتے ہیں۔ فقیر کے لیے آنکھیں نہ ہونا بڑی نعمت ہے!

— ۵ —

اگر فردوس . . .

آخری بریک لگا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو یقین نہ آیا کہ یہ جگہ ان کی شکار گاہ ہو سکتی ہے۔ منگھو پیر کے اُتھلے تالابوں کے کنارے جنگلی بکروں کے پگ مارک کہیں نظر نہ آئے۔ البتہ چند ضعیف مگرمچھ اور ان سے زیادہ ضعیف العقیدہ جُذامی غوطے لگا رہے تھے۔ اور ہر دو کے غسلِ علالت کے پانی کو معمولی جلدی بیماریوں کے مریض اپنے جسم پر ڈال رہے تھے۔ یہاں سائیکل ایک تنور والے کے سپرد

کر کے اور چار تنوری روٹیوں کی پیشگی بکنگ کرا کے شکار کی تلاش میں پا پیادہ نکلے۔ خان صاحب نے منگھو پیر کی پہاڑیوں پر نگاہ کی تو دیر تک افسوس کیا کیے کہ سینکڑوں سال سے بے کار بے مصرف پڑی ہیں۔ ورنہ قبائلی جنگ کے لیے اس سے بہتر جگہ، قسم خدا کی، رُوئے زمین پر تو کیا فردوس میں بھی نہیں ملے گی۔

ہمین است و ہمین است و ہمین است

ابدالی چلتی ہے

انھوں نے ابدالی کے کُندے کو ایک تین فٹ گہرے گڑھے میں ٹکا دیا اور خود اس کے دہانے پر کھڑے ہو گئے۔ تب کہیں نال ان کے کانوں تک آئی۔ اب بندوق بھرنے کا عمل شروع ہوا۔ بندوق بھرتے جاتے اور اس کی ہلاکت خیز خوبیاں بیان کرتے جاتے۔ ”ہالینڈ اینڈ ہالینڈ، ویبلی اسکاٹ اور پرڈی کی بندوقیں تو اس کے سامنے ٹین کی پھکنیاں ہیں پھکنیاں!“ ٹاملٹ پیپر، گتّے کی ٹکلیاں، اونٹ کی مینگنی، ببول کے زرد زرد پھول، بارود، چھرّوں اور گالیوں کی لاتعداد تہیں جمائی گئیں۔ ہر تہ کے بعد آہنی گز سے ٹھونکنے، کوٹنے کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ اور ہم ہر تہ کو کوٹتے رہے، کوٹتے رہے تاوقتیکہ جملہ مسالہ جات اور ہم، یکجان نہ ہو گئے۔

آخر میں ٹوپی چڑھائی گئی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس کارروائی میں ایک گھنٹہ لگا تو مبالغہ ہوگا، اس لیے کہ ۵۵ منٹ لگے تھے، جن میں دس منٹ نابالغ اونٹ کی مینگنی (چھوٹی نہ بڑی، بلکہ منجھولی، جو نال میں اس طرح چلی جائے گویا اسی کے لیے ڈھالی گئی تھی) تلاش کرنے کے ہم نے شامل نہیں کیے۔ تین چار دفعہ زنجک چاٹنے اور اتنی ہی زبانوں میں گالی کھانے کے بعد ابدالی چلی ہے تو ایک عالم تھا۔

پرندان نمی پرند

ہم نے ایسا دھما کا زندگی میں نہیں سُنا تھا۔ ہم تو ہم، چرندے، پرندے اور گزندے تک اپنے حواسِ خمسہ، یا جتنے بھی ان کے حواس ہوتے ہیں، کھو بیٹھے۔ بھیڑوں کو ہم نے زندگی میں پہلی بار مختلف سمتوں میں بھاگتے دیکھا۔ منگھو پیر کے مگرمچھ گھبرا کر تالابوں سے باہر نکل آئے اور تماشائی

تالابوں میں کود پڑے۔ جس جگہ ہم پانی کی چھاگل چھاتی پہ رکھے چکرا کر گرے تھے، وہاں سے ہم نے چند لمحوں تک ایک پہاڑی کو بھی قلابازی کھاتے دیکھا۔ ہمارا حال، بالمراحل، مثنوی گلزارِ نسیم کے آدم خور دیو جیسا ہُوا:

تیورا کے وہیں وہ بار بردوش
بیٹھا تو گرا، گرا تو بے ہوش

خُدا نے خیر کی، ورنہ بیچ میں اگر گڑھا حائل نہ ہوتا تو خان صاحب بندوق کے دھکّے سے اُس پار نہ جانے کتنی دُور پتھّروں میں جا کر گرتے۔ بھونچال ہی تو آ گیا۔ فضا میں دُور دُور کاغذ کے پُرزے، سگرٹ کی پنّی، گتّے کے ڈاٹ، دھول، دُھواں اور نہ جانے کیا کیا اُڑنے لگا۔ ان تمام اشیا ر کی مدد سے انھوں نے چھرّوں کو شکار کے مدار میں پہنچایا۔ ہر طرف دُھواں ہی دُھواں تھا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی —— یعنی چھ انچ تک —— کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہم نے اپنے چہرے پر جمے ہوئے آتش گیر فُضلے کو رُومال سے پونچھا۔ ابھی تک فضا میں لاتعداد چیزیں، مع ہمارے ہوش کے، اُڑ رہی تھیں۔ چھرّے تو چھرّے، نابالغ اونٹ کی مینگنی تک مع ٹماٹو پیپر شکار کا تعاقب کر رہی تھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آیا کہ مرہٹے پانی پت میں میدان چھوڑ کر کیوں بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ خان صاحب نے ہمیں توقّف کرنے کا اشارہ کیا تاکہ جب ہر اُڑنے والی چیز زمین پر گر چکے تو پتہ چلے کہ ان میں سے کون سی غیر پرند تھی۔ پھر پانچ منٹ بعد دونوں نے ہر گری ہوئی چیز کو اٹھا اٹھا کر دیکھا کہ یہ سابق پرند تو نہیں۔ بعد تلاش بسیار، کیکر کی اوٹ میں ایک تیتر کا بچّہ نظر آیا جسے ہم نے رومال ڈال کر آسانی سے پکڑ لیا۔ یہ اُڑ نہیں سکتا تھا۔ اس کے جسم پر چھرّے کا کوئی نشان نہ تھا!

کھسیانے ہو گئے۔ فرمایا کہ پینتالیس سال پہلے مَیں اپنے سوتیلے بھائی کے سر پر اخروٹ رکھ کر اڑا دیتا تھا۔ لیکن اب پرندے ایک لحظہ نچلے نہیں بیٹھتے۔ نشانہ خطا ہوتے ہی وہ پرند کے شجرہ نسب کی زنانہ شاخوں پر ہلّہ بول دیتے۔ سب جانوروں اور پرندوں کو پشتو میں گالی دیتے، لیکن کبوتر سے اُردو میں خطاب فرماتے۔ کہتے تھے کبوتر سیّد ہوتا ہے۔

ہماری چپاتی کا اُلٹا سیدھا

تین فاختائیں گرانے کے بعد انھوں نے ہمیں سوکھی ٹہنیاں، تنکے، چھپٹیاں اور جھاڑ جھنکار جمع کرنے کا حکم دیا اور خود چولھے کا ڈول ڈالا۔ ابدالی میں پرندے کے پَر نوچنے اور آلائش نکالنے کا آٹومیٹک انتظام تھا۔ وہ اس طرح کہ دس فٹ کے فاصلے سے (یہی بندوق کی لمبائی ہوگی) چھرّوں کی باڑھ سے اس کے سارے پروبال مع بازو اڑ جاتے تھے۔ بعض اوقات تو مرحوم کا قیمہ اور باقیات دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہو جاتا کہ اس کا تعلق کس نسل سے ہے۔ خان صاحب نے نُچی نُچائی فاختائیں بندوق کے گز (جو دو گز لمبا تھا۔ فرماتے تھے کہ لڑکپن میں ایک دفعہ گز پر جھاڑی باندھ کر لاہور میں بسنت پر پتنگ لوٹے تھے) میں پرو کر آگ پر بھونیں۔ بھونتے بھونتے کہنے لگے کہ دیگچی سے تہذیب یافتہ انسان وہ کام لیتا ہے جو قدیم زمانے میں معدے سے لیا جاتا تھا۔ یعنی غذا کو گلانا۔ آپ کی کراچی میں تو قیمے میں بھی پپیتے کی گلاوٹ لگاتے ہیں۔ حد یہ کہ سادہ پانی ہضم کرنے کے لیے اس میں فروٹ سالٹ ملاتے ہیں! ہمارے ہاں تو روٹی بھی پتھر پر پکتی ہے۔ اور آٹے کا کیا کہنا! جس چکی کا پسا ہم کھاتے ہیں وہ ندی کے کنارے فاختہ کی طرح کوکو، کوکو کرتی جاتی ہے اور آدم کو جنت سے نکلوانے والی شے پیستی جاتی ہے۔ گستاخی معاف! کراچی کی روٹی تو دونوں طرف سے اُلٹی معلوم ہوتی ہے! کراچی بھی عجب شہر ہے! آپ ہماری نان کھا کر باڑہ کا دو گھونٹ پانی پی لیں تو قسم وحدہٗ لاشریک کی، یا تو حکومت کے خلاف فی الفور بغاوت کر دیں یا قاضی کے سامنے پھر سے ہار پھول پہن کر بیٹھ جائیں۔

خان صاحب نے دو فاختائیں ہمیں عنایت کیں اور ایک چھوٹی سی ٹوٹرو فاختہ پر توکّل فرمایا۔ ہم نے تکلفاً ایک بڑی فاختہ واپس کرنا چاہی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ ٹھیک سے ذبح نہیں ہوئی تھی۔ روٹی کے بارے میں یہ طے ہوا کہ اس کا رو کھا تھکستان تنور پر پہنچ کر کر دیں گے۔ ہماری مسلّم فاختہ میں چھرّے ہی چھرّے بھرے ہوئے تھے، جنھیں ہم پھول پھول کر اس طرح تھوک رہے تھے جیسے جننگ فیکٹری چھانٹ چھانٹ کر بنولے پھینکتی جاتی ہے کہ روئی کی روئی، بنولہ کا بنولہ الگ ہو جاتا ہے۔

کھانے کے بعد چھاگل سے پانی نکال کر تام چینی کے مگ میں اُبالا۔ تھیلے میں سے چائے کی پتّی اور چینی نکالی اور ایک بکری کو پکڑ کے چوتھا جز نکالا۔

ہمارا کچے گھڑے سے دریا پار کرنا

شکار ختم ہوا تو ہم پھر حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ تمباکو کے بارے میں بھی کچھ ہو جائے۔ کہنے لگے اس برگِ حرام کے بارے میں ایک اہم بات یہ اور یاد رکھیے کہ یہ واحد پودہ ہے جس پر کوئی پرندہ چونچ نہیں مارتا۔ چنانچہ آج تک کوئی پرندہ حلق کے کینسر اور مالی مشکلات میں مبتلا نہیں پایا گیا۔ آپ نوٹس لینے کے شوقین ہیں، بے شک نوٹ کر لیجیے۔

ہماری ہمت بڑھی۔ پوچھا "اور اس کی کاشت کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟"

فرمایا "تمباکو کے پودہ جات کے لیے مٹّی اور پانی نہایت ضروری ہیں۔"

پوچھا "اور آب و ہوا؟"

فرمایا "ہاں! وہ بھی ہونی چاہیے۔"

یہ تھی امرت کی وہ بوند جو سارے ساگر کو متھ کر ہم نے نکالی۔ واپسی میں ادھر اُدھر کے موضوعات کی کمین گاہ سے نکل کر ہم نے آخری وار کیا۔

"ضلع مردان میں تمباکو پہلے پہل کس سنہ میں اُگایا گیا؟"

فرمایا "یہ کون سا سنہ ہے؟"

"یاد نہیں۔"

"نور جہاں کا باپ کون سے سنہ میں دخترِ نیک اختر کو رختِ سفر میں باندھ بوندھ کر ہندوستان میں وارد ہوا؟"

"یاد نہیں۔"

"سکندر لودھی کی والدہ نے بابر کو کون سے سنہ میں کوہِ نور ہیرے کی نذر گزرانی تھی؟"

"یاد نہیں۔"

"آپ کتنے سال پہلے پیدا ہوتے تو نادر شاہی قتلِ عام میں مارے جاتے؟"

"خبر نہیں۔"

"تو پھر تمباکو کی تخم ریزی کا سنہ جانے بغیر آپ اپنی مُولی کی بھُجیا ہضم نہیں کر سکتے؟ علم کے زور سے آپ سکول ماسٹری کر سکتے ہیں، بینک میں افسری نہیں کر سکتے۔ کچے گھڑے سے یہ دریا پار نہیں ہونے کا۔ فلسفہ پڑھ کے آدمی صرف ایک کام کر سکتا ہے: دوسروں کو فلسفہ پڑھا سکتا ہے۔ فلسفہ پڑھنے کے بعد سُود کھانے سے ٹھنڈا گرم ہو جاتا ہے۔"

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے!

شائستہ لوگ کیسے گالی دیتے ہیں

پاکستانی بزنس مین، بیوروکریٹ اور بینکر کی ڈکشنری میں "انٹلیکچویل" سے زیادہ سڑی گالی کوئی نہیں۔ اور ہم یہ بات ساری عمر یہی گالی کھا کے بے مزا ہوئے بغیر کہہ رہے ہیں۔ شروع شروع میں یہ عجیب سا لگا کہ ڈپٹی جنرل مینجر سے لے کر چپراسی تک، سب ہی ہماری ایم۔اے کی ڈگری کا مذاق ضرور اڑاتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے بارہا اطمینان دلایا کہ ہم نے فلسفہ میں ایم۔اے محض دفع الوقتی کے لیے کیا تھا۔ تعلیم ہرگز مقصود نہ تھی۔ علم کے قدِ بالا پر قبائے معاش تنگ ہی نہیں، چٹکیوں سے جگہ جگہ سے مسکنے لگی تھی۔ حد یہ کہ بینک کے اکاؤنٹنٹ بھی جو ایک مِڈل سکول کے فارغ التحصیل تھے اور خود کو بجا طور پر انڈر گریجویٹ کہتے تھے (بجا اس لیے کہ کنڈر گارٹن سے لے کر تھرڈ ایئر تک اگر ہم انڈر گریجویٹ نہ کہیں تو کیا پوسٹ گریجویٹ کہیں گے؟) وہ بھی جہاں ہم سے جمع و تفریق کی کوئی خطائے جلی یا خفی ہو جاتی، اسی ڈگری پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ ایل۔ایل۔بی کو تو پھر بھی لوگ ایک مکمل اور بیّن معذوری سمجھ کر معاف کر دیتے تھے، لیکن فلسفہ کا ایم۔اے؟؟ ہمارے ہاں مذاق کانے کا اڑایا جاتا ہے۔ اندھے کو اندھا اور نائی کو نائی نہیں کہتے۔ حافظ جی اور خلیفہ کہتے ہیں۔ حدِ ادب یہ کہ جس نے اُسترے سے حضرت احسان دانش کے گھر اچر کا لگایا، اس نائی کو انھوں نے التزاماً نائی لکھا ہے۔ فیض صاحب کہ مشکل پسند آدمی ٹھہرے، اپنی شاعری کے صِلہ میں وصل کے علاوہ کچھ اور راحتیں بھی مانگتے ہیں۔ دار اور پھانسی سے کم کی بات نہیں کرتے۔ لیکن ہم تو اپنے آپ کو سطحِ زمین سے اتنی بلندی پر دیکھنے کے آرزو مند نہ تھے۔ پھر یہ بزرگ کیوں ہمیں روز صبح نو بجے سے شام کے سات بجے تک

اس ڈگری کی سُولی پر چڑھائے رکھتے تھے۔ ہم خود بھی نیچے اُترنا زیادہ مُہلک سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ نیچے تو وہ خود ہوتے تھے۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ زارِ رُوس نے اپنی ملکہ کیتھرین کو یہ سزا دی تھی کہ اس کے آشنا کا سر قلم کر کے اسپرٹ کے بلوری مرتبان میں اس کی خواب گاہ میں عین نظروں کے سامنے سجا دیا تھا۔ سو ہماری یہ داشتہ آیڈ ڈگری بھی کچھ اسی قبیل کی چیز نکلی۔

ہم نے کہا "آپ بجا کہتے ہیں۔ جو کچھ پڑھا لکھا، وہ ہمارے کچھ کام نہ آیا۔ ایم۔ اے فلسفہ تو بعد کی بات ہے، ہم تو زندگی کا کوئی مسئلہ میٹرک کے الجبرا کی مدد سے بھی حل نہ کر سکے۔ تین دن ہوئے بچّی سخت بیمار تھی۔ اس کے لیے انجکشنوں کی ضرورت پڑی۔ ہم نے یونیورسٹی میں اوّل آنے کا گولڈ میڈل جو کئی سال سے بیکار پڑا تھا، پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے ہاتھ میٹھادر (صرّافہ) میں بکوا دیا۔ ڈھائی تولہ کا طلائی تمغہ، ۲۷ روپے میں بکا! آگرہ یونیورسٹی نے چاندی پر سونے کا پتّر چڑھوا دیا تھا! قاضی عبدالقدّوس نے ۷ روپے نقد اور ۲۷ روپے کی سالم رسید ہمیں تھما دی۔ کہنے لگے ۲۰ روپے ذرا خرچ ہو گئے۔ بڑی سخت ضرورت تھی۔"

خان صاحب چونک کر سائیکل سے اُتر پڑے۔ "اچھا! ہم پر بھی ذرا پیغمبری وقت آن پڑا ہے۔ یہ انگوٹھی بیچنی ہے۔ صرّاف کا پتہ کیا ہے؟ اعتباری آدمی ہے؟"

دوسرے دن لنچ کے وقفہ کے بعد ہمارے پاس آئے اور علیحدہ لے جا کر ایک لفافہ ہمیں تھما دیا۔ اس میں ہمارا گولڈ میڈل تھا۔ ان کی انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔

دوست آں باشد کہ . . . .

شکار تو ایک بہانہ تھا، ورنہ اصل مقصد اپنی طبیعت اور ابدالی کا زنگ دُور کرنا تھا۔ اس رفیقہ کو کندھے پر رکھتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا "خیر میں تو پھر بھی پتّا مار لوں۔ مگر اس پٹھانی کو تو ہفتہ واری ورزش چاہیے۔" منگھو پیر کی جن "پہاڑیوں" کو وہ اُکھڑ کر قبائلی علاقے میں لے جانا چاہتے تھے، ہمیں تو وہ ایسی لگیں جیسے ریگستان کو گرمی دانے نکل آئے ہوں۔ بارش کے ایک ہی چھینٹے میں بھُوسی سی اتر جائے گی۔ اس تاریخی شکار کے بعد مساوات سی ہو گئی۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔

استاد و شاگرد کا فرق مٹ گیا۔ مطلب یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے اُستاد ہو گئے اور نجی معاملات میں ایک دوسرے کو نہ صرف غلط مشورے دینے لگے، بلکہ ان پر سختی سے عمل بھی کرنے لگے۔ شام کو توڑ کے وقت ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹاتے۔ باہمی صلاح و مشورے کے بغیر کبھی کوئی غلطی نہیں کرتے تھے۔ بینک کے "لیجر" اور صفحات کے ہر کالم میں بالعموم تیس پینتیس اندراجات ہوتے ہیں انھیں روانی کے ساتھ ٹوٹل کرنے (جوڑنے) میں اُن دِنوں ہمیں خاصی دشواری ہوتی تھی۔ کبھی پائی کھا جاتے۔ کبھی آنے بڑھا دیتے۔ اور روپیوں کا صحیح حاصل لگانا تو کبھی یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ خان صاحب کھینچ تان کے ہمارے آنوں کی ناف تو بٹھا دیتے مگر دونوں طرف کی پسلیاں توڑ دیتے تھے۔ یعنی پائیوں اور روپیوں کا میزان نہیں ملتا تھا۔) پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایک شام اپنی زیارت کروانے بینک آئے تو ہم نے حاصل بھول جانے کی عادت کا ذکر کیا۔ ارشاد ہُوا "آپ بھی وہی کیجیے جو واجد علی شاہ کرتا تھا۔"

"یہاں بینک میں؟"

"اور کیا! واجد علی شاہ مٹیا برج میں نظر بند ہونے کے بعد نماز پڑھنے لگے تھے۔ مگر رکعتیں بھول جاتے تھے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ایک چوبدار ہر رکعت کے بعد ایک بادام جانماز کے حاشیے پر رکھ دیتا تھا۔ تاجدارِ اودھ ہر سجدے کے بعد کنکھیوں سے بادام گِن کر یہ فیصلہ کرتے کہ انھیں پھر خُدا کے حضور رکوع و سجود کرنا ہے یا آرام سے التحیات پڑھنی ہے۔"

ہماری عرائض نویسی

ایک دن کہنے لگے ہر چند کہ آپ کی انگریزی اتنی اچھی تو نہیں جتنی میری پشتو، تاہم ایک درخواست انگریزی میں اس مضمون کی لکھ دیجیے کہ مجھے فوراً ترقی دے کر مردان کا مینجر بنا دیا جائے۔ زور پیدا کرنے کے لیے آخر میں یہ بڑھا دیجیے کہ "مکرّر آنکہ، اس علاقے میں جو رقمیں ڈوب گئی ہیں، انھیں سوائے میرے کوئی تخمیر وصول نہیں کر سکتا۔ پشتو میں ایک کہاوت ہے کہ جس علاقے کا ہرن ہوتا ہے وہیں کے کتّوں کے قابو چڑھتا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ کر دیجیے۔" ہم نے کہا مگر مردان میں تو بینک کی کوئی شاخ نہیں ہے۔

بولے مجھے ترقی دینی ہے تو پدرسوختہ کو شاخ بھی کھولنی پڑے گی۔ اور ہاں یہ بھی صاف صاف لکھ دیجیے کہ اگر میری ترقی نہ ہوئی تو میں پڑوسی کی لڑکی کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دوں گا۔ ہم نے کہا یہ دھمکی تو پڑوسی کو دہلا سکتی ہے، انگریز جنرل منیجر اس سے خوف نہیں کھائے گا۔ جھلا کر بولے تو پھر یہ وارننگ دے دیجیے کہ میں SPANISH CIVIL WAR میں چلا جاؤں گا۔ ہم نے کہا مگر یہ خانہ جنگی تو بند ہو چکی۔ بولے اُفّوہ! میں نے دو دن سے اخبار نہیں دیکھا۔ عرض کیا اسے ختم ہوئے تو تیرہ سال ہو گئے۔ فرمایا اچھا تو پھر کوئی اور مناسب دھمکی تحریر کر دیجیے۔

ہم نے ایک نہایت فدویانہ عرضداشت ایک انگلی سے ہجّے کر کر کے اس طرح ٹائپ کی جیسے ملکہ پکھراج اور طاہرہ سیّد گانا ٹائپ کرتی ہیں۔ اس میں حضور فیض گنجور کی توجہ کمترین کی ذہانت اور اہلیت سے زیادہ اس کی ضعیف العمری، کثیر العیالی اور غبن سے پیدائشی نفرت کی طرف منعطف کرائی۔ بکراہت دستخط کرنے کے بعد انھوں نے اس کے چاروں طرف اپنے ہاتھ سے سیاہ ماتمی حاشیہ کھینچا۔ اب ایک ایک سے کہتے پھر رہے ہیں کہ میں نے جنرل منیجر سے جواب طلب کر لیا ہے کہ میری ترقی تین سال سے کیوں رُکی ہوئی ہے۔ کل ہی تخمیر نے مجھے بلایا۔ میرے 'شو کاز نوٹس' کو حرفاً حرفاً پڑھا۔ اپنا 'پارکر' ہتھیلی پر رکھ کر مجھے پیش کیا اور کہنے لگا خود اپنا پروموشن آرڈر لکھو اور جہاں چاہو خود کو پوسٹ کر لو۔

حیرت ہمیں اس پر ہوئی کہ چھ ہفتے کے اندر اندر مردان میں بینک کی شاخ کھل گئی اور وہ سچ مچ اس کے منیجر مقرر ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں کامیاب درخواست لکھنے پر مبارکباد دی اور وہ انگلی چومی جس سے ہم نے ٹائپ کیا تھا۔ اس دن سے وہ ہماری انگریزی دانی اور ہم اُن کی انگریز شناسی کے قائل ہو گئے۔ یہ ان کی محبت تھی کہ اُٹھتے بیٹھتے ہماری عرائض نویسی کی داد دیتے ورنہ انھی کے بقول، پھنسی ہوئی گھوڑی نکلوانے کے بعد کون کسی کو پہچانتا ہے۔

ہم نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا سے کہا "دیکھا! یہ سب قوتِ ارادی کے کرشمے ہیں۔ قوتِ ارادی سے پہاڑ بھی جگہ سے ہل جاتے ہیں"۔

فرمایا "اگر تمھاری مراد پہاڑ کی اپنی قوتِ ارادی سے ہے تو مجھے بھی اتفاق ہے!"

طبع آزاد صوم وصلوٰۃ کی پابند نہ تھی۔ ماہ صیام میں ہمارے ساتھ اسٹیشنری روم میں چائے پیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ رمضان میں ذرا یہ قباحت ہے کہ سحری اور افطاری کرنے سے لنچ اور ڈنر کی اشتہا میں فرق آجاتا ہے۔ ہم نے پوچھا حضور نے کبھی کھانا قضا بھی کیا؟

فرمایا "ہاں! بارہ سال پہلے تین روزے رکھے تھے۔ ہر ایک سے تکرار۔ جس سے دیکھو گالی گفتار۔ اِس کو جھڑکا۔ اُس کو ڈانٹا۔ اور تو اور، اپنے باس کے طمانچہ مار دیا کہ روزہ رکھتا ہے۔ نماز کیوں نہیں پڑھتا؟ اس کے بعد دونوں روزوں سے تائب ہوئے۔ چوتھے روزے سے باسی عید تک ایک ایک کے گھر جا کر فرداً فرداً معافی مانگتا رہا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ ہر ایرے غیرے کی ٹھوڑی میں ہاتھ دے دے کر معافیاں مانگتا پھروں۔

نوشہرہ کی لڑائی

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس کے اٹھارہ انیس سال بعد ۱۹۷۰ میں نوشہرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ جنوری کی ایک نہایت یخ صبح تھی۔ تورخم کے پہاڑوں پر دو دن سے برف گر رہی تھی۔ ہم بینک کی زیر تعمیر عمارت کے سامنے دھوپ میں نقشہ پھیلائے ٹھیکیدار سے اُلجھ رہے تھے۔ پہلا نزاعی مسئلہ تو یہ تھا کہ دوسری منزل پر جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، سیڑھی سے چھت کی اونچائی ٹھیکیدار کے قد کے برابر تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پانچ فٹ ایک اِنچ سے زیادہ لمبا کوئی شخص رات کو تیزی سے چڑھتا چلا جائے تو آخری سیڑھی پر اس کے سرِ پُرغرور کا زائد از ضرورت حصہ خود بخود علیحدہ ہو جائے۔ ٹھیکیدار کا موقف تھا کہ اوّل تو نقشہ پاس کرتے وقت ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ دوم، یہ تو ایک طرح کا SAFETY DEVICE (حفاظتی تدبیر) ہے۔ بینک سے نقب زنوں اور ڈاکوؤں کے سر بریدہ لاشے آئے دن اس طرح نکلیں گے جیسے گردن تراش چوہے دانوں میں سے لالچی چوہوں کی لاشیں۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ڈرائنگ روم بالائی منزل پر تھا اور ظالم نے ڈھلان ایسا رکھا تھا کہ اس منزل کے تمام کمروں اور ساری چھت کا پانی پچھلی بارش میں ڈرائنگ رُوم میں کھڑا ہو گیا۔ خیر، اس کا حل تو اُس نے یہ نکالا کہ ڈرائنگ رُوم میں ایک کشادہ موری نکال دی جائے گی۔ اس سے پانی کا آخری قطرہ تک کھنچ

کر نیچے کھڑی ہوئی کار پر گرے گا، جس سے وہ دُھل دُھلا کر جھما جھم کرنے لگے گی۔ نقشہ میں یہ کار برابر دکھائی گئی تھی۔ بے دھیانی میں ہم نے یہ نوٹس نہیں کیا تھا کہ یہ اتنی چمک کیوں رہی ہے۔

تیسرا دردِ سر یہ تھا کہ عمارت کے سامنے ایک شیشم کا درخت تھا جس نے صدر دروازے اور سائن بورڈ کو اس طرح اپنی اوٹ میں لیا تھا کہ بینک کے نام کا صرف THE پڑھا جا سکتا تھا۔ ٹھیکیدار کا خیال تھا کہ عاقل کو اتنا ہی اشارہ کافی ہے، اس لیے کہ کسی اور بینک کے نام سے پہلے "دی" نہیں لگتا۔ پھر یہ بھی کہ پالا پوسا درخت کاٹنا گناہ ہوتا ہے۔ یہ درخت رنگین نقشہ میں اخروٹ کا دکھایا گیا تھا، جس کی گھنی چھاؤں میں کچھ نادہند سستاتے ہوئے نظر آرہے تھے اور چند نئے قرضدار اس کی چھال کے دنداسہ سے دانت اُجال کر، بینک پر مسکراتے، تیز تیز قدموں سے جاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ ایک اخروٹ پر تو شاہین اپنی چونچ رگڑ رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نقشہ پر اس درخت سے پوری بلڈنگ میں جان پڑ گئی تھی۔ مگر جائے دردِ پر قدرت اس درخت کو نقشہ کے مطابق اُگانے میں ناکام رہی تھی۔

چاہِ یوسفی

چوتھا قضیہ یہ کہ نچلی منزل میں مہمان کے کمرے کے سامنے بلکہ عین دہلیز پر ایک ۲۵ فٹ گہرا کنواں تھا جسے وہ بھرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا، اس لیے کہ اس کا پانی بہت میٹھا تھا۔ نقشہ میں اس کنویں کی جگہ ایک گول نشان ○ بنا ہوا تھا جسے ہم نے ستون سمجھ کر نقشہ پاس کر دیا تھا۔ اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد ہم نے ایک امریکن خاتون آرکیٹکٹ سے کراچی کے ایک آفس کا نقشہ بنوایا تو اس میں ہمیں بیس ایسے نشان ○ نظر آئے۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ ہم نے پوچھا بی بی! اتنے بہت سے کنوؤں کا کیا کریں گے؟ ٹھنڈے میٹھے پانی کے ہیں؟ وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ شادی کی انگوٹھی کو تیزی سے اُنگلی پر گھماتے ہوئے بولیں مجھے پاکستان میں دفتر ڈیزائن کرتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ مگر ایسا مذاق کسی CLIENT نے آج تک نہیں کیا۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟ پھر یہ کہ پانچویں فلور پر کنویں کیسے کھودے جا سکتے ہیں؟ سُنا ہے آپ اُردو میں JOKES لکھتے ہیں۔ کیا اُردو میں

ستون کو کنواں کہنا FUNNY بات ہوتی ہے؟

ذکر نوشہرہ کے ٹھیکیدار اور چاہِ شیریں کا ہو رہا تھا، بات کسی اور میٹھے دھارے میں بہ نکلی۔ کافی دیر جھک جھک کے بعد سمجھوتا ہماری اس تجویز پر ہوا کہ متنازعہ کنوئیں کو SOAK-PIT میں تبدیل کر دیا جائے۔ ٹھیکیدار اس اخلاقی فتح پر بہت مسرور و نازاں تھا کہ گڑھا اپنی جگہ قائم رہے گا۔ نام میں کیا رکھا ہے۔

فنِ تعمیر کی نزاکتوں پر ابھی بحث و تکرار کا دروازہ (جواب تک بارہ دری بن چکا تھا) بند نہیں ہوا تھا کہ عمارت کے سامنے ایک تانگہ، جس کا دایاں پہیہ بھینگا تھا، آکر رُکا۔ اس سے خانصاحب برآمد ہوئے۔ ہمیں سرِ راہ زور زور سے جھگڑتے دیکھا تو سلام دعا کے تکلّفات کو بالائے بندوق رکھ کر پہلے ٹھیکیدار سے اس کا اور اس کے باپ کا نام پوچھا اور پھر اس کا نام، مع ولدیت، لے لے کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں تھی کہ قضیہ کیا ہے اور کون حق پر ہے۔ وہ دوست کے ساتھ تھے۔ گالیاں اور ریتا بنانے کی دھمکیاں بڑھنے لگیں اور ان کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا تو ہم نے ثالث بن کر بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا۔ اسے قرار واقعی سزا دینے کے بعد انھوں نے "بائی دی وے" جرم کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی اور چٹکی بجاتے مسائل نمبر ۳ اور ۴ کا ایک جُڑواں حل یہ پیش کیا کہ بینک کے سامنے جو شیشم کا گھنا درخت عمارتی حسن کو داغدار کر رہا ہے اسے اکھیڑ کر متنازعہ کنوئیں میں لگا دیا جائے!

بھُول کی معراج

غصّے کی لالی چہرے سے رخصت ہُوئی تو خان صاحب کو دیکھ کر کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد ایک عرصہ سے عزلت گزیں تھے۔ غالباً بینک ہی کے کسی آدمی نے انھیں ہماری آمد کی اطلاع کر دی تھی اور وہ تانگہ پکڑ کے ایسی شدید سردی میں آٹھ میل نوشہرہ ملنے آئے تھے۔ سر پر کتھئی رنگ کا اُونی کنٹوپ جسے پورا کھول لیں تو منہ کا لیٹر بکس سا بن جاتا ہے۔ ملیشیا کی شلوار قمیض۔ تہ کی ہوئی سفید چادر کا سینہ پر کراس بنائے ہوئے۔ کف کے بٹن اور مصنوعی دانت

غائب۔ مُنھ کی پڑیاسی بندھ گئی تھی۔ ہاتھ اور انگلیاں جیسے بوڑھے درخت کی جڑیں۔ ایک آنکھ پر سبز رنگ کا "چھجے" نما کپڑا جو روشنی سے بچنے کے لیے آنکھ بنوانے کے بعد بعض لوگ لگاتے ہیں۔ شانے خمیدہ۔ چہرہ گردِ ملال سے اَٹا ہوا۔ انگیٹھی کے سامنے بھی ہم نے اپنے دونوں ہاتھ بغل میں دے رکھے تھے اور محسوس ہو رہا تھا گویا جوتوں میں انگلیوں کی جگہ برف کی ڈلیاں رکھی ہیں پشاوری چپّل میں ان کے پاؤں موزوں سے بے نیاز تھے۔ وہ ہمارے لیے دُھوپ چھوڑ کر، ایک طرف سائے میں بیٹھ گئے۔

وقت نے کیسی عمارت ڈھائی تھی۔ دوبارہ آنکھ بھر کر دیکھنے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔ بہت سوچا، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔ آخر یہ مشکل اُنھوں نے آسان کر دی۔ کہنے لگے "ہائے! یوسفی صاحب! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟ وہ ہمارا دلدار کہاں گیا؟"

ہم نے کہا "آپ نے بڑی زحمت کی۔ میں کار بھیج کر بلوا لیتا۔"

جواب میں انھوں نے اُنگلی سے ابدالی کی طرف اشارہ کیا جو کار میں صرف اس صورت میں کھڑی کی جا سکتی تھی کہ چھت میں ایک سوراخ کر دیا جائے جس میں سے نال چمنی کی طرح نکلی رہے اور سلگتی گالیوں کا دُھواں خارج ہوتا رہے۔

پوچھا آج کل کیا شغل ہے؟ بولے اسی برگِ حرام کی کاشت کی تھی۔ پوری کھاد، پورا پانی اور پراویڈنٹ فنڈ ڈالا۔ مگر عجب باؤلی منڈی ہے۔ جب فصل زوردار ہوئی تو قیمتیں گر گئیں۔ اور جب میری ساری فصل کو پالا مار گیا تو چڑھ گئیں۔ بس اسی جوار بھاٹے میں سب کچھ بہہ گیا۔ اب طبیعت میں مندی کا رجحان پایا جاتا ہے۔

ہم نے آنکھ کے آپریشن پر اظہارِ افسوس و ہمدردی کیا تو دوسری آنکھ سے مسکراتے ہوئے بولے "جی ہاں! میری آنکھیں اب اتنی کمزور ہو گئی ہیں جتنی آپ کی بیس سال پہلے تھیں!"

کچھ دیر بعد انھوں نے ایک ٹرے سے خوان پوش ہٹایا۔ کہنے لگے "آپ کے لیے پیتا لایا ہوں۔ بیٹی نے ساری رات جاگ کر پکایا ہے۔"

"اور بھابی....؟"

انھوں نے مضبوطی سے ابدالی کو تھاما اور سر جھکا لیا۔

ہمیں اپنے سے زیادہ دِل گرفتہ دیکھ کر کہنے لگے "مادے چہ زہ بہ درتا جارم تہ دِ بیدیا نہ ستر کے سرے راورے ماینہ۔ (مَیں تو تمھارے پاس رونے کو آیا تھا۔ مگر تمھاری آنکھیں تو پہلے ہی سُرخ ہیں) یہ آپ کو کیا ہو گیا؟ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ آپ نے ایک مصرع تک نہیں پڑھا۔ کوئی شعر سُنائیے۔ جی بہت اُداس ہے۔"

"وہ باتیں، وہ راتیں سب خواب و خیال ہوئیں۔ وہ جوان مر گیا۔ اب تو آپ سنائیے۔"

"خاوندہ ما گل دَ گلاب کڑی

چہ دَ جانان پہ غیږ کښې پانڑے پانڑے شمہ"

(اے خدا! مجھے گلاب کا پھول بنا دے کہ مَیں محبوب کی آغوش میں پتّی پتّی ہو کر بکھر جاؤں۔)

رخصت ہونے لگے تو ملیشیا کی قمیض پر موتیوں کی مالا بکھر گئی۔ ابدالی پر سر ٹیک کر کہنے لگے "بچے سب گھر بار کے ہوئے۔ وقت نا وقت ہوا چاہتا ہے۔ منزل اب دُور نہیں۔ بابا نے مجھ سے یہ بندوق پہلے پہل چلوائی تھی تو میری عمر سات سال تھی۔ ۶۵ سال کی سنگی ساتھی ہے۔ اس نے بہت دُکھ بٹائے ہیں۔ کبھی کبھی موہوم سے خواہش ہوتی تھی کہ اسے میرے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔ لیکن کل رات خیال آیا آپ سے پہلی دفعہ وطن میں ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ کو 'اینٹیک' جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ ایک دوست، ایک پٹھان کی طرف سے یہ تحفہ قبول کر لیجیے۔ مانا کہ بے مصرف ہے۔"

"لیکن ایک شرط پر۔ آپ میری طرف سے وہ سونے کا ٹھیکرا —— تمغہ —— قبول کر لیں گے جو زندگی میں کسی کام نہ آیا۔"

زندگی نے انھیں کیا دیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اپنے علاوہ کچھ بھی تو نہیں۔ مگر ہاں، جینے کا ایک نرالا بانکپن۔ ہر حال میں خوش رہنے اور خوش رکھنے کا حوصلہ۔ دِلداری و دلسوزی کا ایک سلیقہ۔ انھوں نے اپنی کج کلہی سے زیست کو معتبر اور محترم بنا دیا۔ یادوں اور باتوں کے ان اوراق کو ابھی پلٹ کر دیکھا تو خود چونک پڑا۔

اک مہک سی دمِ تحریر کہاں سے آئی

زندگی کو انھوں نے کیا دیا؟ اب جو غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی تنگی، اتنی محرومی اور ایسی تنہائی کے باوجود وہ کتنے مطمئن و مسرور تھے۔ کتنی خوشیاں، کیسی کیسی خوشبوئیں بکھیرتے چلے گئے کہ آج دامن میں نہیں سماتیں۔ پھول جو کچھ زمین سے لیتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اسے لوٹا دیتے ہیں۔

پروٹوکول★

...بہت کام رفو کا نکلا

چپراسی نے آکر کہا "صاب سلام بولتا ہے۔ حرامی کی عینک کھو گئی ہے۔ آپ کو انگلش گالیوں کا ترجمہ کرنے کو بلا رہا ہے۔"

اینڈرسن کے حضور پیش ہونے سے پہلے ہم نے ایک غیر متعلق فائل ہاتھ میں لے لی جسے CASUAL انداز سے پیچھے لگا لینے سے گرم پتلون کی سیٹ کے سوراخوں، ہوادانوں اور رفو در رفو کی ستر پوشی ہو جاتی تھی✪۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا کہ برخوردار تم اس فائل کو ہر وقت سینہ بلکہ کولھوں سے کیوں لگائے پھرتے ہو۔

تم ہنس دیئے، تم چپ رہے، منظور تھا پردہ مرا

میز کے سامنے ہم اس کی ناک کی سیدھ میں کھڑے ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ جہاں اس کی ذات و اعضا سے اور بہت سے شرعی و غیر شرعی عیب منسوب تھے، وہاں یہ بھی مشہور تھا کہ ایک کان سے اونچا سنتا ہے۔ کوئی دایاں بتاتا، کوئی بایاں۔ غالباً وہ خود بھی صحیح تشخیص نہیں کر پایا تھا۔ ہاتھ کا سوالیہ نشان کبھی دائیں اور کبھی بائیں کان کے گرد بنا کر بات مکرر سنتا۔ چپراسی کہ مقرّب بارگاہ اور منصف مزاج واقع ہوا تھا، کہتا تھا کہ دونوں کان آدھے آدھے بہرے ہیں۔ چنانچہ توازنِ سماعت برقرار رکھنے کا ہم نے یہ

★ PROTOCOL : تشریفات

✪ ابھی جوؤں کی زرسری یعنی JEANS ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

غیر جانبدارانہ زاویہ دریافت کرلیا تھا۔

چہرہ عورت کا اور دھڑ؟

فرمایا "پہلی بات تو یہ کہ صبح سے میری عینک لاپتہ ہے۔ اس باسٹرڈ سے پوچھتا ہوں تو مُنہ ہی مُنھ میں ورنا کیولر گالیاں بکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کچھ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔ مجھے زرد رنگ پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اس رنگ کی صحیح جگہ وہ نہیں جہاں تم نے لگا رکھا ہے۔ تمھارے چہرے کا ایکسپریشن ہر وقت ایسا رہتا ہے جیسا بجٹ کے بعد بزنس مین کا۔ دُبلے ہوتے جا رہے ہو۔ تمھارے پتلون کی کمر ڈھیلی ہو گئی ہے اور تم نے بینک کے اسٹیشنری ڈپارٹمنٹ کی پن لگا رکھی ہے۔ پائنچے بھی کافی ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ تمھیں کھُلی کھُلی فضا اور تازہ سمندری ہوا کی ضرورت ہے۔ اشد۔ پرسوں سہ پہر ایک جرمن مال بردار جہاز سے مسز شوارز پہنچ رہی ہے۔ پہنچ رہی ہے کیا معنی، پہنچ چکی۔ جہاز کل سے برتھ کے انتظار میں کھڑا ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں ڈِس ایمبارک ہونے کی اجازت پرسوں ملے گی۔ اس کا شوہر کھلنا میں تعینات ہے۔ تم اور یعسوب ویسٹ وہارف پر اس کا شایانِ شان استقبال کرو۔ سوا دو مہینے لگے ہیں اس سفر میں۔ آرام اور لذیذ کھانے کے لیے، کارگو بوٹ سے زیادہ رئیسانہ سفر کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف ایک کیبن ہوتا ہے۔ جہاز کا سارا عملہ اکلوتے مسافر کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔ ڈرنکس نہ صرف مفت بلکہ اتنے وافر کہ محسوس ہوتا ہے گویا وِسکی کے ڈرم میں بیٹھے ہزاروں میل بہے چلے جا رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے خدا کرے منزلِ مقصود کبھی نہ آئے۔ بحری جہاز کی ایک خوُبی یہ ہے کہ اس کا ایئر کریش نہیں ہوتا۔ کم از کم میرے علم میں تو نہیں۔ پرسوں وقت سے پہلے گودی پہنچ جانا۔ تمھیں اس عورت کو پہچاننے میں زیادہ دِقّت نہیں ہوگی۔ کس واسطے کہ اوّل تو تم بہت ذہین آدمی ہو۔ دوم، اس جہاز میں سوائے اس کے سب مرد ہیں۔ دو سال پہلے ملی تھی تو اپنی عمر ۳۵ سال بتاتی تھی۔ اب کا پتہ نہیں ۳۵ تک پہنچتے پہنچتے عورت، مِصری SPHINX (ابوالہول) ہو جاتی ہے۔ چہرہ عورت کا اور دھڑ وغیرہ شیر ببر کا! ہا ہا ہا ہا! تمھاری عمر کیا ہے؟ اچھا تو پروٹوکول میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ تم میری نمائندگی کرو گے اور یعسوب پاکستان کی۔ پروٹوکول سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک دِن تمھیں

برٹش ہائی کمشنر سے بھی ملواؤں گا۔ تمھاری ٹریننگ میرا ذمّہ ہے۔ قاعدے سے تو مہمان کو لینے مجھے خود جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں ان گوبھی کھانے والے نازیوں کا دماغ خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تمھیں شاید معلوم نہ ہو، ہم جرمنی کو KRAUTLAND یعنی گوبھی خوروں کا ملک کہتے ہیں۔ اس کے سامنے گوبھی کا نام نہ لینا۔ ورنہ مُنھ نوچ لے گی۔ اور تمھارے منھ پر، پچکوانے کے لیے، عینک کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں

فائل کا عقبی نقاب ڈالے ہم اس کوچے سے یوں بے آبرو ہو کر نکلے۔ باہر آ کر ہم نے اپنے باس مسٹر یعسوب الحسن غوری کو یہ مژدہ سُنایا تو ان کی کلغی ڈھلک کر ایڑی سے آ گی۔ مصیبت یہ تھی کہ ہم نے کوئی بحری جہاز نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ انھوں نے ۳۵ سالہ جرمن عورت۔ لہٰذا تشریفاتی مُہم پر روانگی سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کے معلوماتی خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ہم نے پوچھا، پانی کا جہاز تو منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد بھی غالباً پانی میں ہی کھڑا رہتا ہے یا 'لینڈ' کرتا ہے۔ ریل کی طرح سیٹی دیتا ہے یا ہوائی جہاز کی طرح بغیر ہارن کے چھُٹا پھرتا ہے؟ بحیرۂ عرب کی سطحِ آب، سطحِ کراچی سے، اور سطحِ جہاز ان دونوں سے کتنی اونچی یا نیچی ہوگی؟ نسینی لگانی پڑے گی؟ مال بردار جہاز سے پسنجر کِس طرح چھُڑایا جاتا ہے؟ طوفان اور بجلی کے ڈر سے تنہا عورت ذات لوہے لکڑ سے لدے ہوئے کارگو اسٹیمر میں کس سے چمٹتی ہوگی؟ جہاز میں کھمبا ہوتا ہے؟ انھوں نے بھی ۳۵ سالہ جرمن عورت سے متعلق کچھ ایسے ہی مُبتدیانہ سوال اٹھائے۔ ہم تو خیر تھے ہی ریگستان کے رہنے والے، لیکن وہ بھی کچھ کم پیاسے نہیں نِکلے۔ ان کا بچپن ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزرا تھا اور وہ آج بھی عورت کا تصوّر، سر پر گھڑے کے بغیر کر ہی نہیں سکتے تھے۔ جیسے جیسے سوال ہوئے، ایک دوسرے کی لاعلمی پر ترس آنے لگا۔ اس وقت ان کی داڑھ میں شدید درد تھا جس کی وجہ سے جبڑا کان تک سُوجا ہوا تھا۔ چہرے کا یہ نصف حصّہ بالکل نارمل اور بھلا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے نصف حصّے میں بے شمار جُھرّیاں اور ایک گڑھا تھا جسے صرف ورم سے پُر کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے بمبئی سے کراچی، ہجرت مال بردار جہاز میں کی تھی، جس کا بُرا

بھلا اسکیچ بنا کر ہمارے جذبۂ تجسس کی تھوڑی بہت تسکین کر دی ورنہ ہمیں تو بچپن میں پانی کی تخلیق و مصرف کے بارے میں کچھ اور ہی اطلاع فراہم کی گئی تھی جس میں جہاز اور جرمن خاتون، دُوربین سے بھی نظر نہیں آتے تھے:

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تُو نے

مچھلی کے تیَرنے کو آبِ رواں بنایا

لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ جب تک ان کی داڑھ، جبڑے سے، بلکہ جبڑا داڑھ سے علیحدہ نہ کر دیا جائے، جرمن عورت کا سراپا ان کے متورّم دماغ میں نہیں گھُس سکتا۔ انھوں نے صرف مال بردار جہاز اور ہٹلر کا فوٹو دیکھا تھا اور انھی پر جرمن عورت کے ہیولے کو قیاس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وا حسرتا کہ عورت کے باب میں ہمارا سرمایہ حکمت "کتابِ آلودہ" تھا اور کتابِ حکمت مردم خوردہ۔ آنے کو تو وہ رُت بھی آئی جس کا نام کوئی دیوانی کہے بغیر نہیں لیتا، پر

مٹّی ترسی، بوند نہ برسی، بادل گھِر گھِر آئے بہت

سچ تو یہ ہے کہ ہمیں زندگی کے بنیادی کوائف و حقائق اور اپنی ادھوری جوانی کے خلاؤں کا علم و انکشاف بھی فلموں ہی کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ راز و نیاز اور بے تکلّفی تو بڑی بات ہے، ہم نے تو کسی خاتون کے سامنے کبھی موزے بھی نہیں اتارے۔ آج بھی ہمارے جذبات مُنھ کھول کر اپنا نام نہیں بتا سکتے۔ جن سنگدل حسیناؤں پر ہماری جوانی کی ہائے پڑی ان کے مُنھ سے نکل آئے۔ بعض بعض کے توجڑواں بچّے بھی ہوئے۔

بالآخر یہ طے پایا کہ پرسوں یعنی اتوار کو ہم دس بجے ان کے ہوٹل پہنچ جائیں۔ وہاں باہمی صلاح مشورے سے ایک دوسرے کی تشنگیِ علم رفع کی جاتے گی۔

ہم ٹھیک دس بجے سندھ اسلامیہ ہوٹل پہنچ گئے۔ کمرے کے تین کونوں میں تین چارپائیاں پڑی تھیں اور چوتھے میں ایک ماچا۔ ہمارا سر اس کے پائے کے شانے تک آتا تھا۔ یہ بینک کے چار افسروں کا کُھپّار تھا، جنھیں مختلف برانچوں سے بسبب ضعیف العمری، نااہلی، شورہ پُشتی، آدم خوری رشوت تبادلہ کر کے یہاں ایک دوسرے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جیل میں اناڑی چور اُچکّے اور معمولی جیب کترے

عادی مجرموں اور خونیوں کے سامنے تھر تھر کانپتے ہیں۔ سو یہی کیفیت ہماری تھی۔ یہاں کمرے کے ہر کونے میں ایک فرعونِ بے ساماں پڑا تھا:

اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا تھا شیر تھا

(پروفیسر قاضی عبدالقدوس کا خیال ہے کہ شاعر نے دونوں جگہ جانوروں ہی کے نام باندھے تھے لیکن کاتب نے سہواً شیر کے پہلو میں گدا بٹھا دیا۔) دو چار پائیاں اور ماچا تو آباد تھے۔ البتہ یعقوب الحسن غوری کی جھلنگی چارپائی بے چراغ پڑی تھی۔ ٹوٹے ہوئے بانوں کی داڑھیاں کہیں خشخشی، کہیں چگّی، کہیں بھرواں یک مشت دو انگشت، اور بیچ میں شرعی حدود سے تجاوز کر کے زمین پر جھاڑو دے رہی تھیں۔ اسی کی بٹّی میں ٹانگ کا آنکڑا اٹکا کر ہم بھی جھولنے لگے۔ ہمارے گھٹنے آنکھوں کو چھو رہے تھے۔ محاورہ کچھ ہی کہتا رہے لیکن اس وقت کوئی ہمارے گھٹنے پر مارتا تو آنکھ ضرور پھوٹتی۔ غوری صاحب کو پوچھا تو معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے اُنھوں نے اپنی داڑھ فٹ پاتھ پر پریکٹس کرنے والے ایک دنداں شکن سے ۲/۱ ۳ آنے میں پلاس سے نکلوائی تھی۔ وہ سیپٹک ہو گئی۔ اب اس کا علاج کروانے ایک ہومیوپیتھ کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔

چہار درویش

کم و بیش چھ مہینے سے یہ جی جوڑا کُنبہ اس فرودگاہ میں قیام و طعام پذیر تھا۔ خوش خوری کے علاوہ ہمیں ان میں کوئی چیز مشترک نظر نہ آئی۔ صبح ناشتے میں پاؤ بھر حلوہ اور ایک ایک درجن پوریاں فی کس۔ ہاں کسی کا پیٹ خراب ہو تو تین پراٹھے۔ کھانا بولٹن مارکیٹ کے "اللہ کی رحمت کا محمدّی ہوٹل" (جی ہاں! آج بھی اس کا یہی نام ہے۔ اب تو فون بھی لگ گیا ہے۔) میں کھاتے۔ اس لیے کہ وہاں پانچ آنے میں ایک بُھنا ہوا تیتر مل جاتا تھا۔ دس آنے میں پیٹ بھر جاتا۔ پندرہ آنے میں نیّت بھی بھر جاتی تھی۔ جس شے کو ہم نے ماچا کہا ہے وہ دراصل ایک مچان تھا۔ اسی قبیل کا جیسے کھیتوں میں بیچوں بیچ نظر آتے ہیں جن کے نیچے سے گیابھن بھینس بآسانی نکل جاتی ہے۔ اس مچان کے نیچے پہیّوں والی ایک اسپتالی چارپائی پارک تھی جو رات برات اچانک آنے والے مہمان کے لیے

لڑھکا کر کمرے کے وسط میں عین پنکھے کے نیچے بچھا دی جاتی تھی۔ پنکھے کے نیچے چاروں میں سے کوئی نہیں سوتا تھا، اس لیے کہ چھت کے جس آہنی کڑے میں وہ بیس سال سے ہمارے ایمان کی طرح متزلزل تھا، وہ ۳/۴ گِھس چکا تھا۔ چاروں اپنی اپنی چارپائی پر سوتے اور مہمان اس پر جاگتا تھا۔

دروازے کے دائیں طرف والی چارپائی پر مولود احمد ترمذی غسل کے بعد تولیہ باندھے بیٹھے تھے۔ ہم نے ان کے کندھوں پر کہنیاں رکھ کر استقبال کو اٹھنے سے باز رکھا۔ کسی زمانے میں اُن کے بھتیجے کی چینی کے برتنوں کی اچھی خاصی دکان تھی۔ ناہنجار کو ریس کھیلنے کا چسکا لگ گیا۔ اسے پکڑنے ہر اتوار کو ریس کورس جاتے تھے۔ وہ تو خیر طوائفوں کے پھیر میں آ کر ریس سے تائب ہو گیا لیکن چچا جان قبلہ وہیں کے یعنی گھوڑوں کے ہو رہے۔ ہر گھوڑے کا شجرہ نسب اور اس کے بزرگوں کی خرکرمیاں انھیں تاریخ وار حفظ تھیں۔ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا، اُنھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ چارپائی کے سرہانے والی دیوار پر ایک فوٹو تھا جس میں وہ جتانے والے گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈالے، اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھے کھڑے تھے۔ ہونٹوں والی بات سمجھ میں نہیں آئی، اس لیے کہ چُومنا فرض ہی تھا تو متعلقہ سُم چُومتے۔

دائیں جانب چارپائی پر احمد اللہ ششدر دراز تھے۔ فرماتے تھے کہ احمد اللہ کچھ ادھُورا ادھُورا، سپاٹ سا لگتا تھا۔ پینتیس سال پہلے بمبئی میں ملازمت کی تو انگریز اکاؤنٹنٹ مسٹر اُللہ کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ لہٰذا میں نے نام کے ساتھ ششدر جوڑ لیا۔ ویسے اسی زمانے میں دس بارہ غزلیں کہہ کر اتنے ہی مشاعروں میں خود کو ہُوٹ کروا چکے تھے۔ اکثر فرماتے کہ بمبئی میں اچھے سننے والے عنقا ہیں۔ لکھنؤ میں تو اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے ایسے سخن شناس باقی تھے کہ سہ روزہ مشاعرے میں داد دیتے دیتے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ دو تین غزلیں ہمیں بھی سُنائیں۔ ۲۵ فیصد اشعار وزن سے گرے ہوئے تھے۔ بقیہ تہذیب سے۔ عمر ۷۵ کے لگ بھگ ہو گی۔ تمام عمر کنوارے مگر چھلے نہیں رہے۔ اب طاقت گناہ جواب دے رہی تھی۔ شبے مانند شبے دیگر نمی ماند۔ دو سال قبل آخری معاشقے میں ناکامی ہوئی اور عشرتِ صحبتِ خُوباں کا امکان نہ رہا تو پیر و مرشد حضرت سیّد گلمبر شاہ

★ کا دامن تھام لیا:

گر نہیں وصل تو حضرت ہی سہی

گلُبر شاہ کسی خاندانی یا پیدائشی مجبوری کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی مرضی و اختیار سے سیّد بنے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے حضرت ہو گئے اور پھر رحمۃ اللہ علیہ۔

ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان پیدا ہوتا ہے۔ احمد اللہ شَشدر نے اپنے شیطان کو مسلمان کر کے اس کی لبیں کتر دیں اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنوا دیا۔ اب آ کے نہ جانے والے بڑھاپے نے چہرے پر گہری خندقیں کھود لی تھیں۔ ویسے صحت اور کاٹھی مضبوط تھی، جس کے ثبوت میں اکثر فرماتے کہ میرا فجر کا وضو مغرب تک نہیں ٹوٹتا۔ اگر وہ سن پیدائش جو انھوں نے ملازمت کے فارم میں درج کیا تھا، واقعی صحیح تھا تو انھوں نے ½۲ سال کی عمر میں میٹرک کر لیا ہو گا۔ جس دن اُن کی پتلون میں سے پاجاما جھانکتا نظر آتا، وہ جمعہ کا دن ہوتا تھا۔ طب میں بھی تھوڑا بہت دخل و درک رکھتے تھے۔ ہر مرض کا علاج انجیر سے کرتے۔ پرانے اور پوشیدہ امراض کا علاج سڑے ہوئے انجیر سے کرتے تھے۔

مچان پر قنبر علی شاہ براجمان تھے۔ گرم جلیبی کھا رہے تھے۔ پٹّی سے آدھا دھڑ نیچے لٹکا کر چپچپاتے ہوئے ہاتھ کو مصافحہ سے صاف کیا۔ شاہ جی کے صحیح وزن کا کبھی تعین نہ ہو سکا۔ سننے میں آیا تھا کہ ایک دفعہ کسی کے "باتھ روم اسکیلز" پر چڑھ گئے تو سوئی باؤلی ہو گئی۔ چلنا پھرنا تو بہت بعد کی بات ہے؛ اٹھنا بیٹھنا دو بھر تھا۔ ہر وقت ہانپتے رہتے۔ گپ کے شوقین، حالانکہ ایک سانس میں تین الفاظ کے بعد چوتھے پر پنکچر ہو جاتا تھا۔ آٹھ دس تھوتھے سانس لے کر تازہ دم ہوتے تو یہ بھول جاتے کہ کس موضوع پر جملے کا دَم ٹوٹا تھا۔ چنانچہ تازہ موضوع پر تازہ جملے پھر سے بناتے۔ اور اسی طرح دن بھر چکنے کھمبے پر چڑھتے پھسلتے رہتے۔ پورا جسم ایک کرۂ لحمی تھا جس پر سیاہ بیلٹ سے خطِ استوا کھینچ لیتے تھے تا کہ شمال و جنوب پہچاننے میں آسانی رہے۔ شکل و ساخت مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے گنبدِ آسمان کی مانند:

بنایا ہے کیا دستِ قدرت نے گول،
چُرس ہے، نہ جھرّی، نہ سلوٹ، نہ جھول

★ جہاں تک پیری مریدی کا تعلق ہے، ہم مریدی کے بالکل قائل نہیں۔ پیری کے ہیں۔ بڑھاپا کسے نہیں آتا

کچھوا پروفیسر سے بازی لے گیا

شاہ جی کی ساری زندگی ایک سلوموشن فلم تھی، سوائے ان چُپت لمحات کے جب طبیعت غذا یا غیبت پر راغب ہو۔ ایک دفعہ کرُسی پر قیلولہ فرما رہے تھے کہ خواب میں ایک گُداز سی جلیبی دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔ ہمیں مسکراتے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ "لو جی! وسط ایشیا اور ترکی میں دُنیا کے معمر ترین آدمی پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہے کیوں؟ لمبی عمر کا راز دراصل لمبی نیند، موٹی کھال اور SLOW LIVING ★ میں مضمر ہے۔" پروفیسر قاضی عبدالقدوس اسے لے اُڑے۔ لُقمہ دیا "مثلاً کچھوے ہی کو لیجئے۔ سینکڑوں سال جیتا ہے۔ اکبراعظم کے چند ہم عصر کچھوے آج بھی زندہ ہیں۔ بعضوں کے تو دادا نانا بھی بقیدِ حیات ہیں۔ یہ میکنزم قدرت نے صرف کچھوے میں ہی رکھا ہے کہ ذرا کوئی چیز ناگوار خاطر ہوئی اور سٹ سے گردن اندر کر لی۔ بصورت دیگر، جب ذرا گردن نکالی دیکھ لی۔ خشکی سے جی اُوب گیا تو گھنٹوں پانی میں دم سادھے پڑے ہیں۔ گرمی سردی کا تو ذکر ہی کیا، رائفل کی گولی تک بے اثر۔ حد یہ کہ شارک مچھلی تک کچھوے کو سؤر برابر سمجھتی ہے۔ اگر میں آواگون کا قائل ہوتا تو پرماتما سے یہی دعا کرتا کہ ہے بھگون! تیری لیلا نرالی ہے۔ مجھے تو اگلے جنم میں کچھوا بنا دے۔ انسان، اور وہ بھی پروفیسر، دوبارہ ہرگز نہ بنائیو۔"

دھنک رنگ

ہنسی بالکل بچّوں جیسی۔ ہنستے تو ہنستے ہی چلے جاتے۔ ذرا سی بات پر۔ سارا جسم جیلی کی طرح تھل تھلاتا۔ دوسرے کو لمبی بات نہیں کرنے دیتے تھے۔ کوئی ناآشنائے مزاج، بات کو طول دیتا تو اپنا مخصوص نوٹس "کم زیادہ تے ٹیم گھٹ اے" (کام زیادہ اور وقت کم ہے) دے کر بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ وقفے وقفے سے آنکھ کھول کر رنگِ محفل دیکھتے اور مسکرا کے پھر سو جاتے۔ شاہ جی نے تمام عمر دنیا کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا کسی نے کچّی نیند اٹھا دیا ہو۔

خوش طبع، خوش باش، بزم آرائی میں طاق۔ ظاہر و باطن ایک سا۔ سیر چشم ہونے کے علاوہ

★ SLOW LIVING : آہستہ زیستن

شکم سیر بھی تھے۔ کسی کو افسردہ و پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اکثر فرماتے کہ بعض کوتاہ بیں کارخانۂ قدرت میں اس طرح عیب نکالتے ہیں گویا پی ڈبلیو ڈی کا بنایا ہوا ہے! انھوں نے خود تو کبھی ذکر نہیں کیا، لیکن سُنا، اور بعد میں دیکھا بھی، کہ ان کا اکلوتا بیٹا ماؤف العقل ہے۔ شاہ جی سے پہلے پہل تعارف ہوا تو چہرے پر چیچک کے گہرے گہرے داغ دیکھے تھے۔ پھر کبھی نظر نہ آئے بس مسکراہٹ کی ایک دھنک یاد ہے جس کے دونوں سِرے اسی زمین سے پھُوٹے تھے۔

جہلم کے رہنے والے تھے۔ وہی مردم خیز جیالا جہلم جس کے بارے میں حضرت سید ضمیر جعفری فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے لوگ خدا کے تصوّر کے لیے تھانیدار کو دیکھتے ہیں۔ قدوقامت وہی جس کا ضلع جہلم میں کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یعنی چھ فٹ۔ پچیس سال ٹانگانیکا میں گزار آئے تھے۔ ہر چند کہ پاکستان میں نازل ہوئے چار برس ہو گئے تھے، لیکن دل ابھی کھجور میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ یہ تمہید باندھتے کہ "ہمارے ہاں تو دستور یہ ہے کہ ..." تو یہ پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان کا مُنھ ٹانگانیکا شریف کی طرف ہے یا جہلم کی جانب۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے کہ "ہمارے حلوائی کی جلیبی انگوٹھے کے برابر موٹی ہوتی ہے" تو ان کا اشارہ جہلمی پاؤں کے انگوٹھے کی طرف، اور ان کا ممدوح و مشارٌ الیہ ٹانگانیکا کا حلوائی مولچند ہوتا تھا۔ "ہونٹ چھُواتے ہی شیرے کی پچکاریاں چھُوٹنے لگتی ہیں" (یہ کہہ کر اپنی زبان فرضی شیرے میں لتھڑے ہوئے ہونٹوں پر بار بار پھیرتے۔ اس شے پر جان دیتے تھے۔ ہم نے تو انھیں دوشیزہ کو بھی دوشیرہ ہی کہتے سُنا۔) اور جب وہ یہ فرماتے کہ "ہمارے ہاں کوئی بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرے تو پرائمری اسکول میں ماسٹر ہو جاتا ہے اور فیل ہو جائے تو فوج میں کپتان!" تو ان کا اشارہ ضلع جہلم کے ناقص نظامِ تعلیم کی طرف ہوتا تھا۔

پچیس برس وطن سے باہر رہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا نہیں تو چکھا ضرور تھا۔ لیکن لہجے میں پوٹھوہاری حلاوت باقی تھی اور زبان پر اب بھی دیہات کی سوندھی اصطلاحیں چڑھی ہوئی تھیں۔ نمونہ بیان ملاحظہ ہو: "میں ٹانگانیکا سے بائی ایئر فلائی کر کے گاؤں آیا۔ تاریخ شارتخ تو یاد نہیں۔ ہمارے چکوک کی دُودھیا چھلیوں (بھٹّوں) میں رس پڑ گیا تھا، پر دانہ نے سختی نہیں پکڑی تھی۔ چراغ جلے

ہوائی جہاز نے رَن وے پر تین کھیت دوڑ کر ایک دم ٹیک آف کیا۔ ابھی چار بانس ہی اوپر اُٹھا ہو گا کہ ایسی گھُمیر آئی کہ کیا بتاؤں۔ جیسا کہ بچپن میں بیت الخلا میں پہلا سگرٹ پی کر دیگر احوال ہوا تھا۔ تین دفعہ سورۂ یاسین کے بعد دس ہزار فٹ اوپر پہنچے تو واہ وا! بادلوں کے یہ موٹے موٹے گالے ایسی افراتفری سے اُڑ رہے تھے جیسے غصّے میں بھنائے ہوئے اپنے ڈلّا دُھنیے کی دُھنکی ہوئی رُوئی —— جب اس کی عورت شیداں اور الف دین پٹواری باہمی تعاون سے ایک دوسرے کا مُنھ کالا کرتے ہوئے پکڑے گئے اور انجام کار وہ خدا بخش جُلاہے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اجی ادھر اپنے ٹانگا نیکا میں تو اغوا کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی! کرنا خُدا کا کیا ہوا کہ دفعتاً ایک ایئر پاکٹ آیا اور جہاز نے ہائٹ لُوز کی۔ لو جی! $\frac{1}{100}$ سیکنڈ میں پچیس تیس کنوئیں نیچے اُتر گیا۔ محسوس ہوا گویا دل حلق میں آکر پھنس گیا ہے۔ جیسا کہ میٹرک کا رزلٹ دیکھ کر ہوا تھا . . . ."

شاہ جی کے بارے میں مشہور تھا کہ میٹرک میں ناکامی کے بعد خودکشی کی کوشش کی۔ اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

ہر چارپائی کے نیچے ایک ٹین کا ٹرنک، کھڑاؤں اور لوٹا رکھا تھا، سوائے شاہ جی کے مچان کے۔ شاہ جی اپنے تمام پتلون تکیے کی اِستری کے نیچے اور بُشرٹ کھونٹی پر رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ موزے صرف شادی کے دِن پہنے تھے۔ سہرے کے بغیر بالکل بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں جب چرخِ چہارم سے اُترنا ہوتا تو ساتھی باری باری اپنا ٹرنک بطور پائیدان رکھ دیتے اور وہ اس پر پاؤں رکھ کر سہارے سے نیچے اُتر جاتے۔ پہلے یہاں مولوداحمد ترمزی کا بکس مستقلاً پڑا رہتا تھا۔ لیکن ایک دن شاہ جی نے بے دھیانی میں پورا وزن اس پر ڈال دیا تو پچک کر چپاتی ہو گیا۔ اور کپڑوں میں دبی ہوئی وِسکی کی بوتل چُور چُور ہو گئی۔ مولوداحمد ترمزی بہت خفا ہوئے کہ شاہ جی نے میری جمعہ کی اچکن ناپاک کر دی۔ اس حادثے کے بعد ہر ٹرنک کی باری مقرر ہو گئی۔ شاہ جی کو باتھ روم جانا ہوتا تو باری والا اپنا ٹرنک رکھ کر ذاتی نگرانی میں انھیں اتروا تا چڑھواتا۔ تینوں "روم میٹ" شاہ جی کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ لہٰذا بینک پہنچتے ہی وہ پانی اور باتھ روم پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے ابھی

شاہ جی کے ذمے ہمیں غیر ملکوں کے زرِ مبادلہ اور درآمد برآمد کے رموز و غوامض سے آگاہی بخشنی تھی۔ لیکن وہ غیر ملکوں کے جغرافیائی کوائف میں کانوں تک دھنسے ہوئے تھے اور زرِ مبادلہ پر نظر کرنے کا یارا تھا نہ مُہلت۔ اور "غیر ملکوں" بھی ہم روانی میں لکھ گئے، ورنہ وہ ٹانگا نیکا (اب اسے تنزانیہ کہتے ہیں) سے ایک عرض البلد بھی آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ ہم وہاں کے برٹش بینکوں کے طریقِ کار کے بارے میں پوچھتے تو وہ شیروں، گھڑیالوں، اژدہوں اور دیگر آدم خوروں کا طریقۂ واردات بتانے لگتے۔ اور بعض اوقات تو سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس لیے کہ وہ ہمیں دیکھتے ہی کہتے کہ آج تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ رَج کے گل بات ہوتی۔ جب کوئی رس بھری بات کہنی ہوتی تو دبے جُملے پیشتر ہی، بطور خطِ ماتقدّم، سِسکاری بھر کے ایک آنکھ میچ لیتے اور دوسری سے اس کا ردِّ عمل ملاحظہ فرماتے رہتے۔ عملاً وہ نیک اور پرہیزگار آدمی تھے۔ اپنے گرد پارسائی کی ایک فلک بوس فصیل کھینچ رکھی تھی۔ لیکن اس کی چنائی اس کاریگری سے کی تھی کہ فاصلے فاصلے پر جھریاں، روزن اور موکھے چھوڑ دیئے تھے۔ ان روزنوں میں سے، وہ ایک آنکھ بند کر کے، دوسری طرف کا حال کچھ اس طرح دیکھتے اور دکھاتے کہ ہماری تو دونوں بند ہو جاتی تھیں۔ وحشی افریقہ کے شمشیر برہنہ حالات وہ راسِ اُمید کے اِس پار ہمیں کچھ اس طور سناتے کہ بے اختیار جی چاہتا کہ گرہستی زندگی کو دھتا بتا کر بقیہ عمر وسط افریقہ کے جنگل میں ایک سلاد کا پتّا باندھ کر اور اسی کو کھا کر گزار دیں۔ پچھلی نسل کے اس بزرگ کی شوخی بسا غنیمت تھی:

ابھی پچھلی شرارت کے نمونے پائے جاتے ہیں

ہماری ٹریننگ میں ہاتھی کود پڑا

یعسوب الحسن غوری کی داڑھ کا ذکر آیا تو ہم نے خاقانیِ ہند اُستاد ذوقؔ کا شعر پڑھ دیا:

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھِل کھِل

اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہِل ہِل

شعر سُن کر شاہ جی پہلے تو کھِل کھِل ہنسے۔ پھر آنکھ بند کر کے جیلی کی طرح تھل تھل ہلے۔ آنکھ کھُلی تو افریقہ میں تھے اور ہاتھیوں نے گھیر اتھا۔ شروع ہو گئے۔ ان کے ہاں ہاتھی دانت کی لمبائی کتنی ہوتی ہے۔ ہاتھی بوڑھا ہو جائے تو پہلے اس کے کھانے کے دانت گِرتے ہیں یا دِکھانے کے۔ مستی سے ہاتھی کے دانت کا رنگ کیسا ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر مادین کیسی متوالی چال چلتی ہے۔ انھوں نے مولود احمد ترمزی کا سیاہ کمبل اوڑھ کر مچان پر ہی گج گامنی چال چل کر دکھائی جو واقعی ایسی تھی کہ اگر ہم ہاتھی ہوتے تو ہمارے دانتوں کا رنگ تبدیل ہو جاتا۔

ہاتھی سے شیفتگی کا یہ عالم کہ اکثر فرماتے، آپ کیا جانیں، ہاتھی کتنا قیمتی جانور ہوتا ہے۔ ملایا کے ایک شاعر نے ایک عاشقِ صادق کی زبان سے کہلوایا ہے کہ اگر مجھے اپنی محبوبہ کے بدلے میں ہاتھی بھی دیا جائے تو نہ لوں۔

ہم نے مست ہاتھیوں کی روندن سے بچنے کے لیے پوچھا، اچھا یہ بتایئے مشرقی افریقہ میں بینک کے انگریز افسر، کالے اور سانولے گاہکوں اور ماتحتوں سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ جواب میں وہ سرکش، سرشور ہاتھی پکڑنے کی ترکیبیں بتلانے لگے۔ ہم نے سوال دُہرایا۔ اللہ جانے سُنا بھی یا نہیں۔ ارشاد ہوا "آہو جی! ہمارے ہاں خاص خاص ضیافتوں میں سانپ کے سیخ کباب اور فیل مُسلّم پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے گرد انسانی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھولک پر رقص ہوتا ہے۔ برہنہ۔"

"برہنہ؟" ہم نے بڑے اشتیاق سے تصدیق و تفصیل چاہی۔

"ہاں جی! دیکھنے والے سب برہنہ ہوتے ہیں۔"

انھیں مائل بہ تفصیل دیکھ کر ہم نے افریقی بینکوں کے انگریز افسروں کے عادات و اطوار سے متعلق اپنی کُرید بند کر دی، مبادا شاہ جی مشتعل ہو کر درندوں گزندوں کی غیر شرعی زندگی پر سے پردہ اُٹھانا شروع کر دیں۔ بارہ بجے یعسوب غوری ایک اینٹ بغل میں دباتے، کانکھتے کراہتے ہوٹل لوٹے۔

ہومیوپیتھ کو تو پولیس ایک پوشیدہ مرض کے لاعلاج مریض کے ساتھ مارپیٹ کرنے پر دفعہ ۳۰۲ میں گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ سرِدست اس کے والد ہی سے مشورہ کیا اور نقد فیس مشورہ کے عوض بیٹے کی ضمانت کا انتظام اپنے ذمے لیا۔ بزرگوار اپنے بتّیسوں دانتوں کے منفرد درد اور ایک ایک داغِ جُدائی کا جدا تجربہ رکھتے تھے۔ وہ اس وقت اپنی حالیہ صورت کے اصل سبب کو کھرل میں کوٹ رہے تھے۔ مطلب یہ کہ پان کے اجزا کو کُوٹ کر مسوڑھوں کی مشکل آسان کر رہے تھے۔ موصوف نے سُرخ اینٹ یا بھاڑ کی بھوبل سے جبڑا سینکنے کی ہدایت کی تھی۔ مصیبت یہ کہ کراچی میں دونوں نایاب۔ محاورتاً بھی عنقا۔ اہلِ کراچی "بھاڑ میں جائے" کے بجائے دوسرے غیر معتدل آسمانی مقام کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس شہر میں اینٹ سے مُراد ہمیشہ تاش کی اینٹ ہوتی ہے۔ پتّھر کا جواب بھی اسی سے دیا جاتا ہے اور اسی سے ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجائی جاتی ہے۔

بڑی تلاش کے بعد ایک بوڑھے پارسی کی اس سے بھی زیادہ بوڑھی کوٹھی ملی، جس کی نیم پوپلی "کمپاؤنڈ وال" سے انھوں نے نظر بچا کے نسخہ کا جزوِ اعظم کھینچ نکالا۔ اب سوال یہ تھا کہ غریب الوطنی کے عالم یعنی ہوٹل میں اینٹ کو گرم کس طرح کیا جائے۔ مولود احمد ترمزی نے تجویز پیش کی کہ جبڑے اور اینٹ کو سُرخ فیتے سے باندھ کر اینٹ میں بجلی کا کرنٹ "پاس" کر دیا جائے۔ یہ سُنتے ہی شاہ جی اپنے جبڑے پورے کھول کر اتنا ہنسے، اتنا ہنسے کہ دیر تک ان کے حلق میں پُھدکتا ہوا کوّا نظر آتا رہا۔ ہنسی رُکی تو فرمایا کہ ہمارے یہاں تو اینٹ ایسی عالیشان اور زُود اثر ہوتی ہے کہ ہاتھی کی داڑھ کی بھی ٹکور کی جاسکتی ہے۔ ہم نے پوچھا، آپ کے ہاں کیا بڈھا بے دانت ہاتھی بھی گنّے کا شوقین ہوتا ہے؟ گو دانت کو جنبش نہیں . . . . اس پر یعسوب غوری نے ہمیں ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھا کہ اگر ہم موم کے بنے ہوتے تو جہاں ان کی نظر پڑی تھی وہیں سے پگھل جاتے۔ شاہ جی کا جواب مُنھ کے مُنھ میں رہ گیا۔ بس بائیں آنکھ میچ کے مُنھ سے گنڈیری چوسنے کی سی آواز نکالی اور اثبات میں سر کو اس طرح ہلایا کئے گویا خود گنّے کے کھیت کے کھیت روندتے مسلتے مستانہ وار چلے جا رہے ہیں۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ اس لیے

کہ خود ہاتھی ہیں۔ اور دانتوں کا رنگ ہے کہ ہر لحظہ بدلتا جا رہا ہے۔ خود ہانپے، ہمیں بھی دیر تک ہلپاتے رہے۔ ہاتھی کے نجی جذبات کا اس سے بہتر مظاہرہ ہماری تو کیا، کسی ہتھنی کی نظر سے بھی نہ گزرا ہو گا۔

کرائے کے ہار

ان چار درویشوں کے صلاح و مشورے سے "مہمانِنی" (شاہ جی آنے والی کے لیے برابر یہی صیغہ مونث استعمال کر رہے تھے۔) کے استقبال کی تفصیلات طے ہوئیں، جنھیں درحقیقت جہاز اور عورت سے متعلق ۱۵۲ برس کی غلط فہمیوں کا نچوڑ کہنا چاہیے۔ (ہم پانچوں کی عمروں کا میزان کُل ۱۵۲ سال بنتا تھا۔) اخیر میں یعسوب غوری نے کہا کہ تین گوٹے کے ہار ضرور لیتے آنا۔ ہم نے پوچھا، ایک خاتون کے لیے ایک کافی نہ ہو گا؟ فرمایا "مسٹر! یہ سوئمبر نہیں ہے کہ گلے میں ایک جیمالا ڈلوائی اور کنواری کنیا کو مشکی گھوڑے پہ آگے بٹھا کے ایڑھ لگائی اور یہ جا وہ جا!"

ہم نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "جیسے ناٹک میں پرتھوی راج چوہان سر پہ مکٹ سجائے سنجوگتا کو بھگا کر لے جاتا ہے۔ مگر ہم نے جو کھیل دیکھا اس میں تو پرتھوی راج، گھوڑے کے بجائے سنجوگتا کے ایڑھ لگا رہا تھا!"

"لاحول ولا!" انھوں نے حقارت سے کہا۔ غوری ہونے کی نسبت سے وہ خود کو پرتھوی راج کا رقیب و حریف سمجھتے تھے۔

"گھوڑے کی باگ سنجوگتا کے ہاتھ میں تھی جو آگے بیٹھی تھی۔ چنانچہ جب پرتھوی راج کو باگ کھینچنی ہوتی تو سنجوگتا کو کھینچتا تھا۔ باگ کافی تنگ تھی۔ سنجوگتا کو بار بار پوری قوت سے کھینچنے کے باوجود گھوڑا اور مکالمہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گھوڑا کاٹھ کا تھا اور دوسری سواری کی کاٹھی کا کیا کہنا!"

"یہ کھیل کہاں چل رہا ہے؟"

انھیں مُنھ زور مشکی گھوڑے سے بدقت تمام اُتار کر موضوع کی طرف لائے تو دیر تک ہنہنایا

کیے۔

فرمایا "تمھاری کھوپڑی میں اتنی سی بات نہیں گھستی۔ ایک ہار تمھاری طرف سے بھی تو ہونا چاہیے۔ کیا فقط دعاؤں کا ہار اس کے گلے میں ڈالو گے؟"

"اور تیسرا ہار؟"

"ایک بات تجربہ کی آج بتاتا ہوں۔ زندگی میں کام آئے گی۔ کبھی کسی VIP کو ہار پہنانے جاؤ تو احتیاطاً ایک ہار فالتو لے جایا کرو۔ پتہ نہیں عین موقع پر کون ایکسٹرا احرامی اور نکل آئے جسے ہار نہ پہناؤ تو نقصان پہنچا دے گا۔ مَیں نے یہ بال پاؤڈر سے سفید نہیں کیے ہیں۔ چالیس برس بینک میں جھک نہیں ماری۔ تمھیں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں انڈے سے نکلے۔ اور انڈے کی معراج بس یہی ہے کہ مُرغا بن جائے! اور ہاں! گوٹے کا نیا ہار آٹھ روپے میں آتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے ۲۴ روپے کا خُون ہو جائے گا۔ عرض کیا سیٹھ طیب بھائی ولی محمد کے پاس ۱۹۴۹ سے ہزار ہزار کے DEMONETISED (منسوخ شدہ) نوٹ پڑے ہیں۔ ان کے ہار بنا کر کیوں نہ پہنا دیں بولے وہ تو انھیں نئی مسجد کے چندے میں دینا چاہتا ہے۔ تم یہ کرو کہ باس (اینڈرسن) کے بَیرے سے تین ہار کرائے پر لے آؤ۔ ڈیڑھ روپے میں کام بن جائے گا۔ باس کو اب تک جتنے ہار پہنائے گئے ہیں وہ سب اس بے ایمان نے جمع کر رکھے ہیں۔ انھیں کرایہ پر چلاتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب باس لندن سے چُھٹی گزار کر آیا تھا، تب بھی ہم نے اسی بے ایمان سے ٹیکسی ہار کرائے پر لے کر پہنائے تھے۔ لیکن ہاں ایسا نہ ہو کہ مہمانی ہار پہنتے پہنتے ہی ٹسک جائے۔ بہانے سے تُرنت اتروا کر اپنی SAFE CUSTODY (تحویل) میں لے لینا۔"

ہاتھوں ہاتھ

اگلے دن ہار لے کر دونوں ویسٹ وہارف پہنچے۔ جہاز ہمارے خوفزدہ تخمینے سے کچھ زیادہ ہی بڑا نکلا۔ ہمارا خیال تھا کہ جب ہم اس پر ایک قدم جما کر رکھیں گے تو جھوک سے اُلل کر ہچکولے کھانے لگے گا۔ لیکن ہمیں اپنے وزن سے مایوسی ہوئی۔ جہاز پر اِدھر اُدھر گبرو ملّاح خوش خوش پھر

رہے تھے ــــــ روایتی ملّاحوں کی طرح جن کی پُچی پُچی آنکھیں دھوپ میں نہائے ہوئے جزیروں کے لیے ترستی ہیں جہاں گرم دن اور گرم تر عورتیں مسکراتی رہتی ہیں۔ جہاز پر ایک ملّاح سے پوچھا کہ مسز شوارز کہاں ملے گی؟

بولا "رات کے تین بجے تک تو اس کی نائٹی کپتان کی کیبن کی کھونٹی پر ٹنگی دیکھی گئی تھی۔ وہ بھی کہیں نزدیک ہی پڑی ہوگی"۔

ایک اور معتبر صورت ملّاح سے، جس کی داڑھی اور نیکر اوروں سے لمبی تھی، پوچھا تو جواب ملا "کل تک تو SAILORS اسے باسکٹ بال کی طرح اٹھائے اٹھائے پھر رہے تھے۔ اسی کی وجہ سے جہاز دو دن سے برتھ پر نہیں لایا گیا"۔

تیسرے نے کہا "آپ اس FRAGILE CARGO (شکستنی مال) کی ڈلیوری لینے آئے ہیں؟ تری کے خزانے کو خشکی پر اُتارنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ دونوں مجھے ایک ایک کراری لونڈیا سے ملوا سکتے ہیں؟ پلیز! میرے پاس ڈالر ہیں"۔

ہمارے اوسان اور یعسوب غوری کا چالیس سالہ تجربہ خطا ہو گئے۔

"ماسٹر آف سیری مَنیز" تو خیر وہ تھے، لیکن تقسیم کار یہ قرار پائی کہ فیصلہ طلب اُمور میں فیصلہ وہ کریں گے، جذبات و خواہشات وہ رکھیں گے اور انگریزی کا جامہ ہم پہناتے چلے جائیں گے۔ اس لیے کہ انھوں نے کھلے دل سے اعتراف کر لیا تھا کہ ہماری عقل اور ان کی گرامر کمزور ہے۔ بہر حال دونوں نے خاصی رواداری سے کام لیا۔ نہ ہم نے ان کے جبڑے پر فقرہ کسا جس پر آج انھوں نے ہینگ کا لیپ لگا رکھا تھا اور نہ انھوں نے ہماری پتلون پر انگشت اعتراض اٹھائی کہ وہ ہماری عسرت و نیک نیتّی پر دال تھی۔ تھورو کا قول ہے کہ ہر ایسی مہم کو مشکوک و پُرفتور جانو جس کے لیے نئے کپڑے پہننے پڑیں۔

ہمارے فرائض کے لذائذ

جو بندہ یا بندہ، اس کا کیبن بھی مل گیا۔ وہ اس کے دروازے پر اپنا سر ہاتھوں سے تھامے کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھ کر نہ جانے کیا دل میں آئی کہ اندر جا کر برتھ پر لیٹ گئی۔ ہلکے مہندی رنگ کا لمبا اسکرٹ

پہن رکھا تھا۔ اس زمانے میں کاشف الاعضا HOT PANTS, MINIS اور HIPSTER ساریوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ دِل والیاں ایسے موقعوں پر بتّی بجھا دیتی تھیں۔ یعسوب غوری نے اپنی بین الاقوامی خواہشات کی ترجمانی کے لیے ہمیں آگے کر دیا۔ ہم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے نیند بھری آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ لیا۔

نجریا سے جیا بھر دوں گی، چھُونے نہ دُوں گی شریر★

یعسوب غوری لیٹی ہوئی 'مہمانی' کو ہار پہنانے جھکے تو اس نے ان کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور ان کی گُدّی پر سارا وزن ڈال کر اٹھنا چاہا۔ وہ نشہ میں دُھت تھی۔ ایک ہاتھ نہ جانے کیسے اُن کے دُکھتے ہوئے جبڑے سے ٹکرا گیا۔ اس پر انھوں نے ایسی چنگھاڑ ماری کہ وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ اور لیٹے لیٹے اپنی شاخسار سی کلائی آگے بڑھا دی۔ وہ منظر دیدنی تھا جب یعسوب غوری نے ہمیں دھکّا دے کر اپنی راہِ تپاک سے ہٹایا اور فرش پر "نیل ڈاؤن" ہو گئے۔ جس طرح انگریزی فلموں میں عہدِ وسطیٰ کے KNIGHTS ہوا کرتے ہیں۔ اپنی ہینگ آلود ناک سے اس مرمیڈ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر ہمیں بھی یہ پروٹوکول فریضہ ادا کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے اس کا ہاتھ چت کر کے شادی کی دوسری لکیر کو چُوما۔

روزِ محشر ہمیں حسینوں کو بھی مُنھ دکھانا ہے۔ کیسے کہہ دیں کہ حسین چہرہ دیکھ کر جو فرحت ہوتی ہے اس سے ہم نے خود کو محروم رکھا۔ اس کے بائیں شانے پر ایک تازہ نیل تھا۔ پنڈلیوں پر مہین مہین سُنہری رواں جیسا کھٹ مِٹھے آڑو پر ہوتا ہے۔ ناخن اتنے نکیلے گویا انگلیاں پنسل شارپنر میں ڈال کر نوکیں بنائی ہیں۔ ایک ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ عمر پینتیس سے اوپر ہی ہو گی کہ انداز و آواز میں ایک ٹھسک آ گئی تھی۔ منھ سے عجیب طرح کے بھبکے نکل رہے تھے۔ یعسوب غوری نے تسلّی دی کہ اصلی جرمن بیئر ہے۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ یعسوب غوری نے آنکھوں ہی سے ہر قدم پہ کولی بھر بھر لی۔ دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نکا ہے۔ گلے میں گوٹے کا ہار ڈالتے ہوئے ہم نے "ویلکم ٹو پاکستان!" کہا۔ اس نے بھی مغربی جرمنی کی جانب سے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ نیز اُمید ظاہر کی کہ دونوں

★ شریر: (ہندی) بدن۔ جب یہ اپنی چھَل اور چھَب دکھلاتا ہے تو اردو کا شریر بن جاتا ہے۔

ملک بہت جلد ایک دوسرے کے زیادہ قریب آجائیں گے۔ اس پیش گوئی کے پورے ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی، اس لیے کہ جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ہمارے مُنھ سے مُنھ بھڑا کے، دونوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے، پنڈولم کی طرح جھُولنے لگی۔ البتہ ازراہِ تلطّف اپنی گلبدنی کا سارا جھوک ہماری جانب اس طرح ڈالا کہ ہماری چال شطرنج کے گھوڑے جیسی ہوگئی۔ اگر یعسوب غوری کے جبڑے پر ہینگ کا لیپ نہ ہوتا تو یہ لطف و عنایت ان پر ہوتی، گلبدنی کا بار اُٹھا کر ڈھائی گھر کی چال انھیں چلنی پڑتی۔ کچھ دیر بعد کہنے لگی "دو مہینے سے یہ جہاز بھنور میں ہے۔ بندرگاہ پر بھی ٹھیک سے کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اور ان لہروں کو تو دیکھو۔ کیسی شیخیاں مار رہی ہیں۔ اُفّوہ! تمھارے قدم بھی بہکے پڑ رہے ہیں۔ تمھیں تو چکر آرہا ہے۔ (اپنا سُرخ پرس کھولتے ہوئے) تمھارا جی ماندہ ہے۔ لو یہ گولی کھالو۔ متلی بند ہوجائے گی۔ ننّھا ایرک پیٹ میں تھا تو روز صبح کھاتی تھی۔" خیر گولی تو شرم حضوری ہم نے کھالی لیکن تین چار دن تک ہول اُٹھتے رہے۔ صبح متلی ہوتی اور ایسا لگتا گویا پتلون کمر پہ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

اس نے محبّتانہ سرگوشی کے انداز میں تقریباً ہمارا کان چباتے ہوئے پوچھا کہ مجھے لینے وہ کچّا بیف اور مارملیڈ کھانے والا اُبڈّھا جان بل کیوں نہیں آیا؟ ہم نے اینڈرسن کی طرف سے جھوٹی معذرت کی کہ آج اسے کہیں کاک ٹیل پر جانا ہے۔ کراچی میٹروپولیٹن شہر ٹھہرا۔ روز کہیں نہ کہیں پارٹی ہوتی ہے۔ کراچی عظیم شہر ہے۔ فرینکفرٹ سے تیس گُنا بڑا۔ کراچی پاکستان کا دروازہ ہے۔ بولی، جہاز کا کپتان کہہ رہا تھا کہ کراچی پاکستان کا فٹ اسٹول ہے! بڑا سُوّر ہے وہ!

اُفتاں و خیزاں آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ وہ کندھوں کے جھُولے سے چھلانگ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی "ہائے! میں بھی کیسی بھلکڑ ہوں۔ تمھارا تعارف کپتان سے تو کرایا ہی نہیں۔ بہت ڈیشنگ ہے۔ بالکل GREGORY PECK لگتا ہے۔" دونوں باربرداروں نے کندھوں کی جوڑی کا رُخ کپتان کے کیبن کی طرف کر لیا۔ ہر چھ سات جھونٹوں کے بعد وہ ہماری ٹائی پکڑ کے نیچے اُترتی اور ہماری چال درست کر کے واپس سوار ہوجاتی۔

گریگری پیک نے ہمیں بھی سینہ سے لگا کر پیار کیا

گریگری پیک نے اس وقت صرف سفید نیکر اور ہوائی چپّل پہن رکھی تھی۔ پیشانی سے پسینے کے ریلے بہہ رہے تھے۔ اس کے گال اور ناف پر جو کھروچے تھے ان پر عنابی کھرنڈ آ گئے تھے۔ سینہ پر ایک بہت بڑا دِل گُدا ہوا تھا۔ اور اس کے اندر کسی سابقہ محبوبہ کی برہنہ تصویر TATTOO کی ہُوئی تھی۔ تصویر کے پیٹ پر حسینہ کا نام بھی لکھا تھا جو اب پڑھا نہیں جا سکتا تھا اس لیے کہ اس پر امریکی پرچم کے ستارے گُدوا کر نام مِٹا دیا گیا تھا۔ شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا۔ دائیں ہاتھ پر گریگری پیک نے اپنا پورا نام گُدوا رکھا تھا، تاکہ کسی حادثے یا جنگ میں کٹ کر گِر جائے تو جن صاحب کو ملے وہ اخبار میں اشتہار دے کر اصل مالک کو لوٹا دیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت مُسکرایا۔ ایسی گرمجوشی سے مصافحہ کیا کہ ہماری انگلیوں کی ہڈّی سے ہڈّی بجا دی۔ کہنے لگا، آیئے۔ جشن منایئے آپ اس خوب صورت بوجھ کے سینٹڈل میں ڈیوٹی فری شیمپین سے جامِ صحت نوش کرنا پسند کریں گے یا اچھے محمڈن کی طرح ڈسنٹری کے جراثیم سے بھرپور کراچی واٹر؟

یعسوب الحسن غوری نے پاسپورٹ لیتے اور فارم آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا، کسٹم میں ڈکلیر کرنے کے لیے کچھ ہے؟

گریگری پیک نظروں سے مسز شوارز کی جامہ تلاشی لیتے ہوئے بولا "آف کورس! ۳۸-۲۴-۳۷ اور منجھلے عدد میں ایک گیلن DUTY-FREE LIQUOR"

وہ اسے الوداع کہنے سیڑھی تک آیا اور وقتِ رُخصت ہمیں بھی سینہ سے لگا کر دیر تک پچوڑا۔ غوری کو ہیننگ کے لیپ نے ایک مرتبہ پھر بچا لیا۔ زینہ سے اُترنے لگی تو نہ جانے کیا دِل میں آئی کہ دونوں ہار اُتار کر گریگری پیک کے گلے میں ڈال دیے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ہمارا دل اور ہاروں کی رقم جہاز کے لنگر کی طرح ڈوب گئی۔ غوری نے جن قرض آلود نظروں سے ہمیں دیکھا ان کی تصویر کھینچنا ہمارے بس کا کام نہیں۔ وہ سر سے پاؤں تک مجسّم گالی بنے کھڑے تھے۔

تیسرا ہار انھوں نے ہمیں پہنا دیا۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس غالب کے مختلف مصرعوں کو پھینٹ کر اکثر فرماتے ہیں کہ تنگ دستی نہ ہو تو تندرست آدمی کی تمنا کا دوسرا قدم گرہستی حدود کے باہر پڑتا ہے! یوں تو کوئی ارمان ایسا ہوگا جس کے ہم مرتکب نہ ہوتے ہوں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ گھر بگڑے

حد یہ کہ تندرستی کی آرزو بھی کی ہے! لیکن خدا گواہ ہے کہ ناکردہ گناہوں کی اس ناگفتنی فہرست میں اس سے پہلے مال بردار جہاز کا کپتان بننے کی خواہش کبھی شامل نہ ہوئی تھی۔ اب رہ رہ کر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ ہائے! یوں خشکی پر وقت ضائع نہ کیا ہوتا تو کیا کیا مزے کرتے۔ قسمت میں اگر جہاز کا کپتان ہونا نہیں لکھا تو کم از کم چھوا ہی ہوتے۔ رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

"عجب ہریال★ عورت ہے!" ہم نے کہا۔

"مسٹر! تم ابھی BANKERS اور SAILORS کو نہیں جانتے۔ کٹے✪ کو بھی دوہ کر پھینک دیں!"

اِس انتظار میں کِس کِس سے پیار ہم نے کیا

یعسوب الحسن غوری تو داڑھ کے درد کا عذر کر کے ویسٹ دہارف ہی سے رخصت ہو لیے۔ ہم نے اسے بیچ لگزری ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۷ میں چھوڑا تو رات ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فلڈ لائٹس کی روشنی میں پھوار ایسی لگتی تھی جیسے سامنے موتیوں کی لڑیوں کی چلمن پڑی ہوئی ہے۔ سمندری ہوا سے پام کے درختوں کے پتے مجیرے بجا رہے تھے۔ دور لنگر انداز جہازوں کی روشنیاں گدلے آسمان کے نیچے جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ مسز شوارز کہنے لگی تم لاؤنج میں انتظار کرو۔ میں اسباب سنبھال سنگھوا کر دو منٹ میں آتی ہوں۔ ہم بیٹھے انتظارِ ساغر کھینچتے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد ہمیں بیرے سے اپنے کمرے ہی میں بلوا لیا۔ بن سنور کر نکلی تو عالم ہی کچھ اور تھا۔

★ ہریال (پنجابی) اس آوارہ گائے یا بھینس کو کہتے ہیں جسے ہر کوئی دوہ لے۔

✪ کٹا (پنجابی) بھینس کا بچہ۔

ہم بھی دل مضبوط کئے بیٹھے رہے۔ اس میں ہماری محبوب ایکٹرس اواگارڈنر کی بڑی شباہتیں تھیں۔ اس وقت اس کے آرپار مخفف لباس کے اختصار اور اس کے مشمولات و ملحقات کے بسط و کشاد کو دیکھ کر بڑا ترس آیا کہ افوہ! جرمنی میں کپڑے کی اتنی قلت ہے! معلوم ہوتا ہے وہاں کے بل توا بھی ہمارے جیسا موٹا سوت بھی نہیں بنا سکتے۔ مقامِ ادب ہے، محاورے کی اوٹ لے کر بس اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ اوچھے کے گھر تیتر، باہر رہے نہ بھیتر۔ مصنوعی ابرو کی کمان کھینچتے ہوئے بولی کہ تمہارا بہت قیمتی وقت ضائع ہوا۔ کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تھکن سے چور ہوں یہاں فرنچ برانڈی ملتی ہے؟ جہاز کا کپتان آنے ہی والا ہے۔ مسٹر شوارز کو بھی کھلنا ٹرنک کال کرنی ہے۔ اسے بہت MISS کرتی ہوں۔ کل سہ پہر جہاز چلا جائے گا۔ شام کو تم یہیں میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ پرسوں صبح کی فلائٹ سے ڈھاکہ جانا ہے۔ مگر یاد رہے، میں ساڑھے دس بجے سے پہلے ڈنر کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ ڈرنکس کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔"

"شکریہ!" "مگر اس وقت تو ہم بینک میں ہوں گے۔"

کھل اٹھی۔ "ونڈر فل! کیا وہاں ڈرنکس کا انتظام ہوتا ہے؟ ہاہا! کراچی از اے ونڈر فل سٹی! گیٹ وے ٹو پاکستان! اچھا تو"

"گڈ نائٹ!"

"SEE YOU!"

فینی ڈارلنگ

رقم ڈوبنے کا منظر

سارے بینک میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ہم نے احمد نواز چیمہ سے پوچھا "یہ کیا شور شرابا ہے؟" بولے "یہاں تو روز ایک نہ ایک سیاپا ہوتا رہتا ہے۔ قبر کھودنے والا ہر میّت پر آنسو بہانے بیٹھ جائے تو روتے روتے اندھا ہو جائے۔ مٹّی پاؤ، بادشاہو!" مسٹر کینٹین والا سے دریافت کیا "صاحب یہ کیا ہلّا گلّا ہے؟" فرمایا "اِدھر تو چوبیس کلاک ہا ہا کار مچیلا ہے۔ اَجن جُوناٹنٹا ختم نہیں ہوا کہ نوا پھڈّا ہو گیا۔ بینک کا بھٹّہ بیٹھ گیا۔ جب تلک سالا لوگ ہمارا پگار نہیں بڑھائیں گا، اکھّا دِن، ڈیلی، اسی موافق لفڑا رہیں گا۔ ابھی تو تم سالا انسپکٹر آف برانچز ہوا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوئیں گا کیا!"

ہوا یہ کہ ایک برانچ مینجر نے زنجبار الیکٹرک کمپنی کو ایک ریڈیو گرام اور استری کے نذرانہ کے عوض ساڑھے چار لاکھ روپے ہیڈ آفس کی اجازت و منظوری کے بغیر چُپ چاپ قرض دے دیے۔ اور اس قرض کو ماہانہ گوشواروں میں بھی رپورٹ نہیں کیا۔ آٹھ نو مہینے بعد یہ لاش بدبو دینے لگی۔ تفتیش سے انکشاف ہوا کہ زنجبار الیکٹرک کمپنی نے جعلی انوائس اور شپنگ کمپنی کے بل آف لیڈنگ (جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ساڑھے چار لاکھ روپے کی مالیت کا سامان اپنے ڈھاکہ آفس کو بھیجا ہے) سے جُل دے کر بینک سے ساڑھے چار لاکھ روپے ہتھیا لیے۔ ڈھاکہ میں جب نو مہینے تک ہُنڈی نہیں سکاری گئی تو مال کی ڈھنڈیا پڑی۔ بینک کی چاٹگام برانچ نے اطلاع دی کہ جو

کریٹ، بوریاں اور پیٹیاں بندرگاہ پر پڑی ہیں انھیں SURVEYOR نے کھولا تو اندر پتھر، کوئلے، لوہے کے ٹکڑے اور ڈان اخبار کی ردّی نکلی۔ چند لاشیں بھی برآمد ہوئیں۔ یہ ان چوہوں کی تھیں جو اخبار مذکور الصدر کا ایڈیٹوریل کھاتے ہی ڈھیر ہو گئے۔ مزید تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس کمپنی نے اسی طرح تین اور بینکوں کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ اور اب اس کا مالک نورالحسن شیخ نقلِ مکان و دکان کر کے ڈھاکہ چلا گیا ہے، جہاں اس نے ایک بنگالی لیڈر کو اپنا "سلیپنگ پارٹنر" بنا کر حکومت مشرقی پاکستان سے بجلی کی مصنوعات کی فیکٹری لگانے کے لیے پچاس لاکھ روپے کے درآمدی لائسنس حاصل کر لیے ہیں، جنھیں دھڑا دھڑ بلیک میں بیچ کر راتوں رات کروڑ پتی بن گیا ہے۔ حال ہی میں ایک اور بنگالی سلیپنگ پارٹنر مسز ——— کو پانچ لاکھ روپے کا نذرانہ خوش خرابی دیکر جُوٹ مِل کا لائسنس حاصل کیا جسے پندرہ لاکھ میں فروخت کر کے پاکستان سے جانے والے بڑے افسروں کے لیے روم میں ایک کیڈلک کار، شاندار فلیٹ اور مسافر کو "ہوم سِک" ہونے سے بچانے کے لیے ایک خوب صورت سی سیکرٹری کا بندوبست کیا جس کی انگریزی اس کے چال چلن سے بھی زیادہ ٹوٹی پھوٹی تھی۔ لیکن اس کا شمار فضول خرچی میں نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھا گیا ہے کہ بزنس میں ½ سرمایہ کے ساتھ ½ سیکس کا "انوسٹ منٹ" کر دیا جائے تو پھر ملیں اور فیکٹریاں ہر سال بچّے دیتی چلی جاتی ہیں۔

یہ سب باتیں سامنے کی سہی مگر نورالحسن شیخ بینکوں کی رقمیں واپس نہیں کرتا۔ کہتا ہے "اُتا دُلا سو باؤلا۔ رقمیں محفوظ ہیں۔ (یہ کچھ جھوٹ بھی نہ تھا، اس لیے کہ رقمیں سوئٹزرلینڈ کے بینک میں نمبری اکاؤنٹ میں واقعی محفوظ تھیں۔) جب میرے بنائے ہوئے ریڈیو، پنکھے، ریفریجریٹر اور ایئر کنڈیشنر بازار میں گرم پکوڑوں کی طرح بکنے لگیں گے تو ان سُود خوروں کی پائی پائی چکا دوں گا۔" وہ ان میں سے تھا جن کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی زبان ہوتی ہے۔ جب تک وہ چلتی رہے، ہُن برستا ہی رہے گا۔ اس نے بینکوں کی آنکھوں میں دُھول نہیں جھونکی، بڑی صفائی سے سُرمہ لگایا تھا۔ لیکن ایسی وارداتیں بینکوں میں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بینک کے بڑے افسروں کے چہروں پر فکر و پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ یوں بھی بینک میں ملازم ہونے کے بعد کروڑ پتیوں کی دولت

کا حساب رکھتے رکھتے آٹھ ہندسوں سے کم کی رقم آنکھوں میں جچتی ہی نہیں۔ اور اپنی تنخواہ تو بالکل ریزگاری معلوم ہوتی ہے۔

ہمچو سوزن دائم از پوشش گریزا نیم ما
جامہ بہر خلق می دوزیم و عُریانیم ما

تاہم ہماری کھال ابھی حسب ضرورت موٹی نہیں ہوئی تھی۔ اور ہم ہمہ وقت سیسموگراف کی طرح لرزتے رہتے تھے کہ اس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا ہے۔ تیئس سال اِس پیشے سے متعلق رہنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آدمی اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو کروڑپتی بنتا دیکھ لے تو انسانیت اور اعلیٰ اقدار پر سے اس کا ایمان یکسر اُٹھ نہیں جاتا تو متزلزل ضرور ہو جاتا ہے۔ بینکر کی پتھرائی ہوئی آنکھیں روز یہی منظر دیکھتی ہیں۔ اور اس بچارے کو بقول مرزا، اپنے ایمان کو روز حُقّے کی طرح تازہ کرنا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی بھی احتیاج نہیں رہتی۔ اقتدار اور دولت کے حصول کا یہی انداز رہا ہے۔ سدا سے یونہی ہوتا آیا ہے۔ جس مٹّی سے پھول کِھل سکتے ہیں، جس کوکھ سے دھان پھوٹ سکتے ہیں —— وہ تپتی زمین جو اس انتظار میں ہے کہ کوئی پیاسا اسمٰعیل ایڑیاں رگڑے اور اس کی چھاتی سے زمزم کے دھارے پھوٹ نکلیں —— اسے ہم نے پتھّر ہوتے دیکھا ہے۔ اور پھر اسی پتھّر کو ہیرا بنتے دیکھا ہے۔ جس سے ہر چیز کٹ جاتی ہے، جسے کوئی چیز نہیں کاٹ سکتی۔

اس وقت ہمارے ساتھی گیلانی صاحب مدراس میں چھپی ہوئی کتاب BANK FRAUDS AND FORGERIES اپنی دراز سے نکال کر کھولے بیٹھے تھے۔ کتاب کیا تھی، جعلسازی اور فریب دہی کی مکمل "گائیڈ" تھی۔ اس میں بینک سے متعلق ہر نوع کے فراڈ اور دھوکہ دہی کی واردات اتنی تفصیل اور دِلآویز طریقے سے بیان کی گئی تھی کہ بینک میں جو بچارے یہ تک نہیں جانتے تھے کہ غبن کیا ہوتا ہے، وہ بھی دس پندرہ منٹ میں اس فنِ شریف کی نزاکتوں سے کام چلاؤ واقفیت پیدا کر کے خود کو اقدامِ غبن میں گرفتار کروا سکتے تھے۔ پانچ چھ منٹ کی ورق گردانی کے بعد گیلانی صاحب نے اعلان کیا کہ اگر بینک کے ہر افسر کو اس کا صفحہ ۳۴ پڑھوا

دیا گیا ہوتا تو آج بینک کی تجوری میں ساڑھے چار لاکھ روپے زائد ہوتے۔ پنجاب بینک لمیٹڈ، امرتسر کے ایک کیشیر نے اسی طرح ۲۵ ہزار روپے کا غبن کیا تھا۔ سردار موہن سنگھ سب انسپکٹر نے اس صحیفہ جعلسازی کی مدد سے اس کے گھر سے ۲۵ ہزار روپے برآمد کر لیے! اس کے بعد امرتسر میں کوئی فراڈ نہیں ہوا۔

شام تک حکم ہوا کہ اس کیس کی تحقیقات اور رقم کی وصولیابی کے لیے ہمیں پہلی فلائٹ سے ڈھاکہ جانا ہوگا۔ چنانچہ ہم بالامتثال امر دوسرے دن ڈھاکہ پہنچ گئے۔ تاریخ اب ذہن سے محو ہو گئی۔ اتنا یاد ہے کہ پہلی بار ہوٹل شاہ باغ کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو کرشنا چورا کے درختوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایک ایک پتی پھول، اور ہر پھول انگارہ بن گیا تھا۔ نیچے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ یا کائی کی مخملیں چادر تانے ٹھہرا ہوا پانی۔ زمین کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی پتی یا پتّے کو چھو بھی لیا تو پانی ٹپک پڑے گا۔ ہریالی کے اتنے مختلف شیڈ ہم نے زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ اس شاداب منظر کے جن حصّوں میں جان پڑ گئی تھی وہ چڑیوں کی شکل میں چہچہانے لگے تھے۔ بارش تھمنے کے بعد بجلی کے تاروں پہ تلے اوپر بیٹھی ہوئی چڑیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے مغربی موسیقی کی NOTATION۔ شام کو مٹفورڈ روڈ اور نواب گنج کی سیر کو جانے لگے تو ایک دوست نے خبردار کیا کہ ”راستہ بھول جاؤ تو کسی سے اُردو میں نہ پوچھنا۔ سمجھتے سب ہیں۔ جواب کوئی نہیں دے گا۔ انگریزی میں پوچھنا۔ ڈھاکہ شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ہمارے عہد کے سب سے ممتاز و مکرّم عالمِ دین کو اُردو کی حمایت پر سرِ بازار جوتوں کا ہار پہنایا۔“

گائے، بکری کے برابر اور بکری، بلّی کے برابر دیکھ کر بڑا پیار آیا۔ بلّیاں نظر نہ آئیں۔ البتہ مچھّر بہت تندرست و توانا نکلے۔ تیتّے کے برابر۔ ذرا غور کیا تو ہر شور مچانے والی چیز ——— مینڈک، مینا، ندی، کوّے، بادل اور لیڈر ——— اپنے سائز سے بڑی دکھلائی دی۔ ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ فجر کی اذانوں کے بعد ہر تیسرے گھر سے لڑکیوں کے گانے اور ہارمونیم کی آواز سُنائی دی۔ دفتر پہنچے تو بینک کے جرمن منیجر نے شکایت کی کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا بنگالی منیجر کمرشل بینکوں کی روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی ڈھاکہ سے کراچی روپیہ بھیجنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے

بنگال کا روپیہ بنگال ہی میں رہنا چاہیے۔ یاد رہے پاکستان بنے ابھی دس سال بھی نہیں ہوئے تھے!

ایک صاحبِ ایجاد سے مُلاقات

نورالحسن شیخ (جنھیں ڈھاکہ میں سب نورُل کہتے تھے) کا اطمینان اور بشاشت دیکھ کر خیال گزرا کہ شاید ہم ہی اعصابی کمزوری کا شکار ہیں کہ خواہ مخواہ گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں۔ ممتاز ماہرِ اقتصادیات لارڈ کینس نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ اگر آپ بینک سے ایک ہزار پونڈ قرض لیں تو آپ بینک کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ لیکن اگر دس لاکھ پونڈ قرض لے لیں پھر بینک آپ کے رحم و کرم پر ہوگا۔ یہ بھی کچھ اسی قسم کا کیس تھا۔ نورُل کا دفتر اور شوروم نہایت شاندار اور بینک کے ہیڈ آفس سے بدرجہا بہتر تھا۔ انھوں نے اپنے گودام کا معائنہ کروانے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے آپ اس کے مجاز نہیں۔ میں درزی کو دائی کے فرائض انجام دینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ البتہ اپنی فیکٹری کا معائنہ کرایا جسے وہ اپنی تجربہ گاہ کہتے تھے لیکن جو فی الحقیقت بینک کے روپے کی آخری آرام گاہ تھی۔ ریفریجریٹروں کے بیس پچیس خول پڑے تھے، جنھیں وہ ایجاد بندہ بتاتے تھے۔ ان کی صرف مشین ایجاد کرنی باقی تھی۔ اسی طرح ایئر کنڈیشنر کے سُوئچ ایجاد کر لیے تھے۔ بقول اُن کے سُوئچ ہی میں ساری مشین کی جان ہوتی ہے۔ آپ نے سوائے کارخانۂ قدرت کے کوئی اور کارخانہ بغیر سُوئچ کے چلتے دیکھا ہے؟ بس دس لاکھ مزید قرضہ کی کسر تھی۔ قرضہ جات کو پُرزہ جات میں ڈھالنا اس صاحبِ ایجاد کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن قرضہ بلا سُود ہو۔ یہ نہیں کہ، رقم بڑھتی گئی جُوں جُوں ادا کی۔ میں اس وقت ایشیا کا مقروض ترین آدمی ہوں۔ لہٰذا رہن، مال اور ضمانت کی قید بھی نہ ہو۔ اے صاحب! امریکہ میں تو بینک مسکراہٹ پر بھی قرض دے دیتے ہیں۔

البتہ ایک الیکٹرک شیور مکمل ایجاد کر چکے تھے، جس کی لمبائی چھ فٹ ہوگی۔ ہمارے خیال میں اس سے کھڑے ہوئے اونٹ کی حجامت بآسانی کی جا سکتی تھی۔ کچھ اور روپیہ ہوتا تو وہ اس آلہ کو مختصر کر کے انسانی حجامت پر رضامند کر سکتے تھے۔ یہ اور بات کہ چند روز قبل اس کی کارکردگی کا تجرباتی مظاہرہ ایک بھیڑ کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔ اس شیور کے خود کار زنبور، موچنے، مُوتراش رندے

اور مُنھ تراش برقی بسولے دیکھ کر ہم جیسا سائنس سے نابلد انسان بھی فوراً قائل ہو گیا کہ یہ آلہ آدمی تو آدمی، جٹادھاری بڑ کی داڑھی مونچھ کو بھی مع جڑ اکھاڑ کر پھینک دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ اپنی ایجاد کے فوائد ملک ہی میں محدود رکھنا چاہتے تھے، ورنہ امریکہ میں تو یہ آلہ ELECTRIC CHAIR کی بجائے بخوبی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

نُورُل دیر تک قوم کی بدنصیبی پر افسوس کرتے رہے جو اُن کے ذہن سے پورا فائدہ اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔ صوبائی اداروں نے البتہ ان کی بھرپور مالی امداد کی جس سے ان کی بربادی میں بھرپور اضافہ ہوا۔ انھوں نے ایک اور قابلِ ذکر ایجاد دکھائی۔ یہ ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی جو مجموعہ یک خوبی و صد خرابی تھی۔ اس کا مصرف یہ بتایا گیا کہ اگر آپ اسے اپنے ٹیلی فون کے تار سے جوڑ دیں تو جو شخص بھی آپ کو فون کرے گا، اس کا فون "ڈیڈ" ہو جائے گا۔ پوچھا، اس سے فائدہ؟ فرمایا، سائنس کا کام تو ایجاد کرنا ہے۔ دنیا اپنے آپ فائدے دریافت کرتی پھرے گی۔ نوبل پرائز کے بانی الفریڈ نوبل نے جب ڈائنا مائٹ ایجاد کی تو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اسے اس طرح استعمال کیا جائے گا۔ ایجاد اور اولاد کے لچھن پہلے سے ہی معلوم ہو جایا کرتے تو دنیا میں نہ کوئی بچّہ ہونے دیتا اور نہ ایجاد۔

ایکس رے عینک

فرمایا ایک "ایکس رے عینک" کا پلان بھی ذہن میں بالکل تیار ہے۔ شیور چھوٹا ہو جائے تو اس کی باری آئے۔ پوچھا، یہ کیا شے ہوتی ہے؟ فرمایا، آپ کے مطلب کی چیز ہے۔ آپ نے گوجرانوالہ کی ترکِ افیون گولیوں کا اشتہار دیکھا ہے؟ یہ بھی دراصل ایک اصلاحی آلہ ہے۔ ہم ادر چکرائے۔ ارشاد ہُوا کہ اس عینک کو لگا کر جسے دیکھا جائے، اس کا گوشت پوست، خط و خال، رنگ روپ سب غائب ہو جائے گا۔ صرف جسم کی ۲۰۶ ہڈّیاں نظر آئیں گی۔ پیرس کے نائٹ کلبوں، ساحل سمندر، نیوڈ کالونیز اور رقص گاہوں میں داخل ہونے سے پہلے تماشائیوں کو زبردستی یہ عبرت آموز عینکیں پہنا دی جائیں گی۔ پوچھا، یہ عینک پہن کر بلو فلم دیکھی جائے تو کیا صرف ہڈیاں نظر آئیں گی؟

ہمارے غیر متوقع سوال پر بالترتیب تعجب، تذبذب، تبسّم فرمانے کے بعد ارشاد ہوا کہ جب اس عینک کا استعمال عام ہو جائے گا تو بلو فلموں کی شوٹنگ ایکس رے کیمروں سے ہوا کرے گی۔

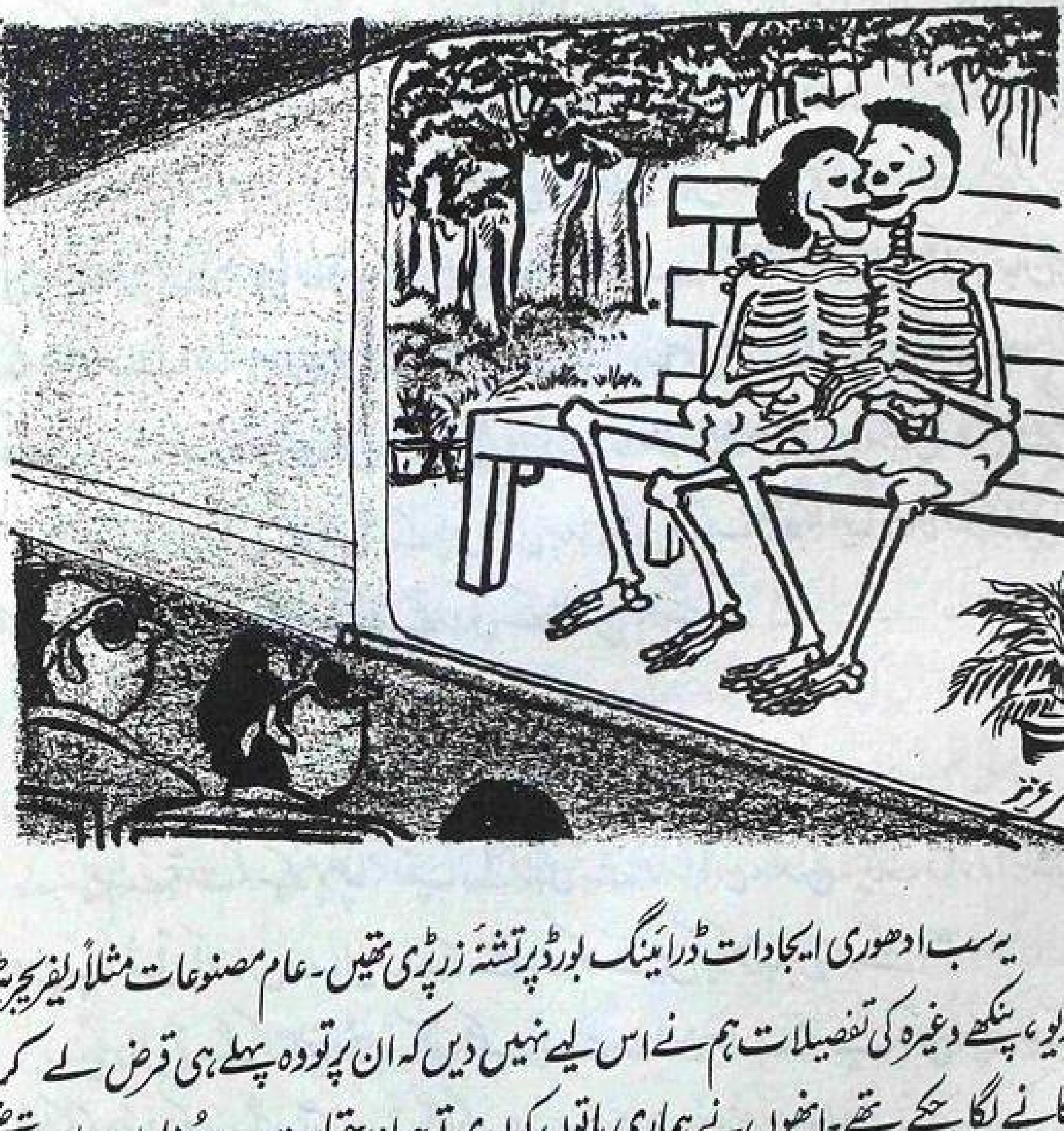

یہ سب ادھوری ایجادات ڈرائینگ بورڈ پر تشنۂ زر پڑی تھیں۔ عام مصنوعات مثلاً ریفریجریٹر، ریڈیو، پنکھے وغیرہ کی تفصیلات ہم نے اس لیے نہیں دیں کہ ان پر تو وہ پہلے ہی قرض لے کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ انھوں نے ہماری باتوں کو پوری توجہ اور حقارت سے سُنا۔ اور ہمارے تقاضے کے جواب میں عندیہ ظاہر کیا کہ اگر ہمارا بینک مزید پچیس لاکھ قرض دے دے تو دوسرے چار کم ظرف بینکوں کے قرضے بیباق کر دیں۔ اس میں یہ سُبیتا رہے گا کہ اکٹھے چار بینکوں سے چوکھی کے بجائے صرف ایک سے سُلٹنا، ایک سے دیوانی، فوجداری کرنی پڑے گی۔

سٹّے کی مروجّہ اصناف

نورُل ایک زمانے میں رُوئی کے سٹّے میں بھی بینکوں کی قسمت آزما چکے تھے۔ اپنا ہی دِوالا

نہیں نکالا، تین چار بڑی مضبوط پارٹیوں کو بھی لے ڈوبے۔ وجہ یہ بتاتے تھے کہ بینک اناپ شناپ قرض دیتے چلے گئے۔ چنانچہ میں نے پھُٹّی خریدنے میں عجلت اور بیچنے میں دیر کر دی۔ یہاں تک کہ جولائی کا مہینہ آن لگا۔ مُلتان کی گرمی بنولے کے جگر تک اُتر گئی۔ گرمی کھائی ہوئی روئی اور لڑکی کا کون لیوال ہوتا ہے؟ انھوں نے اس کے علاوہ سٹّہ کی دیگر مروجہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس زمانے میں تو نیو چالی میں اس پر بھی شرطیں بدھی جاتی تھیں کہ اب جو کار سامنے سے گزرے گی اس کا نمبر جُفت ہو گا یا طاق۔ فلاں عورت اُمّید سے ہے، بتاؤ لڑکا ہو گا یا لڑکی؟ جان پہچان کے حاملہ گھرانے اور زچگیوں میں لمبے لمبے وقفے ان کی قیاس آرائی و قمار بازی کے لیے بالکل ناکافی ثابت ہوئے تو اسپتال کے میٹرنٹی وارڈ میں داخلہ لینے والیوں پر شرطیں لگائی جانے لگیں اسی وارڈ میں کسی پٹھان "گن مین" کے ہاں لڑکی پیدا ہو گئی تو ایک سیٹھ کا ایسا دِوالا نکلا کہ زچگی ختم ہونے سے پہلے اس کے اپنے بچّے روٹی کے محتاج ہو گئے۔

نالش سے مُلّا نصرالدین اور ریلے نین تک

ہم نے ہمّت کر کے پوچھا "آپ نے کراچی سے جو سامان، سُوئچ، پلگ، تار، الیکٹرک موٹر اور پمپ مشرقی پاکستان ارسال فرمائے تھے، وہ کوئلے میں کیونکر تبدیل ہو گئے؟"

"یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے۔ آخر بینک میرے سامنے جواب دہ ہے۔ مَیں اپنے سلیپنگ پارٹنر کو کیا مُنھ دکھاؤں گا۔ آپ نے چٹگانگ پورٹ ٹرسٹ سے بھی پوچھا؟"

"یہ واقعہ ہے کہ آپ نے اس مال کے بِل آف لیڈنگ پر ہماری کراچی برانچ سے ساڑھے چار لاکھ روپے وصُول کیے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔"

"پھر آپ نے ہُنڈی نہیں چھُڑائی اور مال نو مہینے چٹگانگ میں سڑتا رہا۔"

"آپ پھر درست فرماتے ہیں۔ مال نو مہینے تک سڑتا رہا۔ اور آپ کا بینک سوتا رہا۔ آپ نے سائنس پڑھی ہے؟"

"میں فلسفہ کا طالب علم تھا۔"

"جبھی! تو گویا آپ کوئلے کی کان میں سُرمہ لگا کر جاتے ہیں! لیکن جناب پر سقراط سے زیادہ بقراط کی چھاپ ہے۔ تو بندہ نواز! اگر آپ اسے نو مہینے اور پڑا رہنے دیتے تو عجب نہیں کہ کاربن کے عمل سے کوئلے ہیرے بن جاتے۔"

"کریٹ اور پیٹیاں آپ نے بند کی تھیں۔"

"مگر کھولیں کسی اَور نے! بینک نے مال بدل دیا ہے۔ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ میں لُٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔ میں نالش کر رہا ہوں۔ (ایک فٹ لمبا کیلا بڑھاتے ہوئے) لیجیے۔ غصّہ تھوکیے اور اسے نوش فرمائیے۔ ارے صاحب! تین چار انچ ہی سہی۔ مُنشی گنج کا ہے۔" نورُل نے ایکا ایکی اپنا انداز بدل کر کہا۔

کیلے کی لمبائی کو چار انچ فی مُکٹا کم کرتے ہوئے عرض کیا "نالش پر یاد آیا۔ مُلا نصرالدین پر ایک ہمسائے نے نالش کی کہ مُلّا نے مجھ سے ایک نہایت نادر اور بیش بہا صراحی عاریتاً لی، مگر جب لوٹائی تو تڑخی ہوئی تھی۔ مُلّا نصرالدین نے جواب دعویٰ میں لکھا کہ اوّل تو میں نے مُدّعی سے صراحی لی ہی نہیں۔ دوم، میں نے جس وقت صراحی واپس کی تو وہ بالکل ثابت و سالم تھی۔ سوم، جب میں نے صراحی لی تو وہ پہلے سے ہی تڑخی ہوئی تھی۔"

پھڑک گئے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کے کہنے لگے، بینک میں بھی بڑا بڑا اپڑا ہوا ہے! اسی بات پر اننّاس کی ایک قاش ہو جائے۔ کومِلّہ سے منگایا ہے۔ اور یہ کچّے ناریل کی ڈاب مفرّح ہے۔ کاسرِ ریاح ہے۔ مقوّیِ بصر بھی۔ آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ آپ کو چشمِ بنگال دکھائیں؟ نَین رسیلے، بان کٹیلے۔ (وقفۂ تبسّم) اچھا کل سہی۔ ہاہا! ہاتھ لاؤ، یار!

ٹیبل فین اور فین ٹیبل کا فرق

یہاں ہم اپنے بے قصور قارئین کو قرضے کی وصول یابی اور ڈوبی ہوئی رقومات کی بازیابی کی مہم میں خواہ مخواہ اور بلا تنخواہ شریک کرنا نہیں چاہتے کہ تصفیہ اپنی جگہ اور تفنّن اپنی جگہ۔ اوّل الذکر ہمارا

پیشہ ہے اور ثانی الذکر مِشن۔ بہرحال ان کے اس طلسماتی کارخانے میں جہاں ہم اپنی آنکھوں سے سونے کو پیتل بنتے دیکھ چکے تھے، ایک ایجاد ایسی نکلی جس کی جِدّت اور کارآمدیت کے ہم نہ صرف قائل ہی نہیں خریدار بھی ہو گئے۔ یہ ایک پنکھا میز تھی جو اپنے موجد کے دس سالہ بینک شکن تجربات کا نچوڑ تھی۔ تین ہندوستانی کوآپریٹو بینک اس کے "شاک" سے سات سال سے کلکتے میں غش کھائے پڑے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں کہیں کوئی جوڑ، کوئی کیل نہیں ہے۔ براہِ راست PIG IRON (اس کا ترجمہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس "خنزیری فولاد" کرتے ہیں) سے ڈھالی گئی تھی۔ تیزاب اور ہماری داستانوں کی دوشیزاؤں کی طرح تھی۔ یعنی کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھُوا تھا۔ اس کے پایوں کے بیچ میں چار برقی پنکھوں کو تختۂ میز پر اُلٹی پھانسی دی گئی تھی۔ ازبسکہ ہمارا قلم عجزِ رقم اس کی لفظی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے، لہٰذا موقلم کا سہارا لینا پڑ رہا ہے:

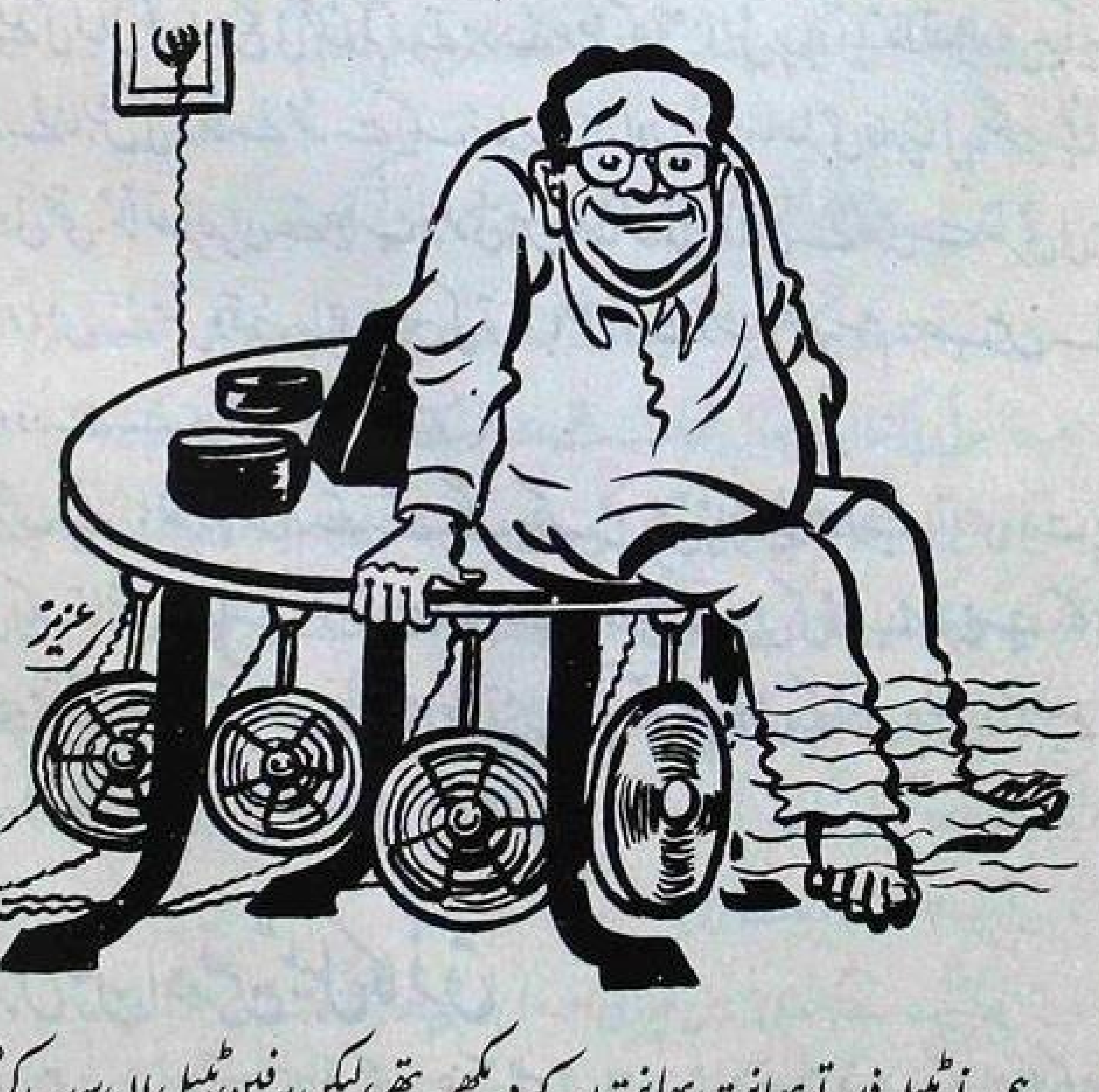

ہم نے ٹیبل فین تو بھانت بھانت کے دیکھے تھے، لیکن یہ فین ٹیبل ان سب کی اُلٹ تھی۔ وہ اسے فین ٹیبل کے نام ہی سے پیٹنٹ کرانا چاہتے تھے۔ اس کا مخفّف فینی وضع کیا۔ زیادہ پیار

آتا تو ڈارلنگ کہتے۔ اس کا بھولا بھولا ڈیزائن دیکھا تو بے اختیار موجد پر پیار آنے لگا۔ پوچھا، صاحب! پنکھے تو میز کے اوپر رکھے جاتے ہیں۔ آپ نے انھیں نیچے اُلٹا کیوں لٹکا دیا؟ بولے آپ نے بڑی دیر بعد ایک معقول سوال کیا ہے۔ عام بازاری پنکھے PHYSICS (طبیعات) کے گِھسے پِٹے اصولوں پر بنائے جاتے ہیں۔ میں نے یہ پنکھا ANATOMY (علم الابدان) کے اصولوں پر بنایا ہے۔ اسی لیے آپ کو سمجھنے میں دیر لگ رہی ہے۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہو تو بتائیے سب سے زیادہ سردی کِسے لگتی ہے؟"

"ہمیں؟"

"لاحول ولا قوۃ! میرا مطلب تھا کس حصّہ جسم کو؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سردی میں سب سے پہلے پاؤں ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ دَم بھی پہلے پیروں ہی کا نکلتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اگر انسانی جسم کو ٹھنڈک پہنچانی مقصود ہے تو پنکھے کا رُخ پاؤں کی طرف ہونا چاہیے نہ کہ سَر کی طرف۔ چھت اور میز کے پنکھے سائنس کی رُو سے سراسر "اَن سائینٹفک" ہیں۔ مَیں نے اس پر بڑی دماغ سوزی کی ہے۔ پنکھے کو سَر سے پیر تک اُتارنے میں ساڑھے تین لاکھ روپے لگے ہیں۔ اچھا، اب یہ بتائیے کہ جب آپ رات کو لان پر بیٹھے ہوں تو آپ کو سب سے زیادہ کس چیز سے تکلیف پہنچتی ہے؟"

"خواتین کے چہرے صاف نظر نہیں آتے۔"

"اے قربان جائیے! مگر یہ تو اندرونی تکلیف ہوئی، خارجی تکلیف بتلائیے۔"

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

ہم نے اپنے ذہنِ نارسا پر بہتیرا زور ڈالا، مگر کوئی اور قابلِ علاج تکلیف یاد نہ آئی۔ ہمیں عاجز دیکھ کر خود تشخیص فرمائی کہ لان پر سب سے بڑی NUISANCE مچھّر ہوتے ہیں جو پیروں پر ڈنک مار مار کے لال چُنری بنا دیتے ہیں۔ ٹیبل فین کی ہوا صرف چہرے اور دَھڑ کو لگتی ہے اور اُونچے پیڈسٹل فین کی ہوا سے استفادہ کوئی دوسرا پیڈسٹل فین ہی کر سکتا ہے۔ نتیجہ آپ نے بچشمِ خود ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ پارٹیوں میں خواتین ایک ہاتھ سے بڑے سلیقے سے پلّو ڈھلکاتی رہتی ہیں اور دوسرے سے پنڈلی کے دَدوڑوں کی سوزش رفع کرتی ہیں۔ تو انھیں اس عالم میں دیکھ کر آپ

کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔"

"مچھّروں پہ رشک آتا ہے۔" ہم نے نور جہاں کی طرح دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔

"بھئی آپ تو شاعری کرنے لگے۔ اسے کل رات کے لیے اٹھا رکھیے۔ تو عرض یہ کر رہا تھا کہ جب فینی پوری رفتار سے چلے گی تو مجال ہے کہ ایک مچھّر بھی پیروں کے پاس پھٹک جائے۔"

"پھر رُخِ روشن کے گرد منڈلانے لگیں گے۔"

جواب میں انھوں نے ہمیں مچھّروں کی نفسیات سے آگاہ کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ کہ پیروں کا مار کھایا مچھّر، چہرے کو پھُونک پھُونک کر کاٹتا ہے۔ نیز یہ کہ جو مچھّر بھی ہم جیسے ندیدوں کی نعارِ نظر کی لپیٹ میں آگیا وہ وہیں بھسم ہو جائے گا۔

بازار ہم گئے تھے اِک چوٹ مول لائے

بعد ازاں انھوں نے میز پر دو من کے باٹ رکھوائے اور خود بھی اس پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ پھر سُوئچ آن کیا گیا۔ فیکٹری کے معائنے اور ناملائم بحث کے دوران ہم پسینے میں شرابور ہو چکے تھے۔ اور "کارڈرلائے" کی پتلون میں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ یوں بھی ڈھاکہ میں کپڑے چھ مہینے بارش سے تر رہتے ہیں اور چھ مہینے پسینے میں۔ لیکن فینی نے دو ہی منٹ میں نہ صرف ہمارا سارا پسینہ خشک کر دیا، بلکہ ہمیں تو اندیشہ ہونے لگا کہ اگر یہ دو چار منٹ اور چلتی رہی تو ساری اندرونی رطوبت بھی کھینچ کر ہمیں کھڑنک کر دے گی۔ ہماری بھیگی ہوئی قمیض پاپڑ ہو گئی تھی اور ذرا چلے تو وہی پتلون سُوِش سُوِش کرنے لگی۔

ہم نے بالکل "کیژول" انداز میں اس کی قیمت پوچھی۔ گھاگ تھے۔ بھانپ گئے۔

"نذر ہے، سرکار! دو بنائی تھیں۔ ایک تو گورنر مشرقی پاکستان ہیلی کاپٹر میں ڈال کر لے گئے۔ دوسرا دانہ آپ کی نذر۔ تحفہ چیز ہے۔ فینی ڈارلنگ!" انھوں نے اس عزیزہ کو چمکارتے ہوئے کہا۔

"قیمت کیا ہے؟" ہم نے پھر پوچھا۔

"ماچس ہوگی؟"

"جی نہیں۔"

انھوں نے اپنی سکریٹری سے ماچس منگوا کر ہمیں پکڑا دی اور ڈپٹ کر بولے "جلائیے"۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے ایک تیلی جلائی تو کہنے لگے "اب اس فیکٹری کو آگ لگائیے"۔ ہم نے ہکّا بکّا ہو کر پوچھا "کیوں؟" بولے "پہلے آگ لگائیے، پھر جرح۔ جلدی کیجئے۔ آپ کی انگلی جل رہی ہے"۔ دریافت کیا "مگر کیوں؟" فرمایا "اس لیے کہ برادر! یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔ آپ مجھے اپنے سلیپنگ پارٹنر سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ یقین نہ آئے تو خدا کی قسم فیکٹری کو آگ لگا دیں"۔

"یہ آپ کی محبّت ہے۔ مگر قیمت کیا ہے؟" ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس میں اکیلی ماچس سے آگ لگائی جا سکے۔ چاروں طرف لوہا ہی لوہا تھا ——— "خنزیری فولاد"

"عرض تو کیا۔ ساڑھے تین لاکھ روپے لاگت آئی ہے۔ آپ کو رعایت سے نو سو میں دے دوں گا۔ گھر کی بات ہے، برادر!"

"ہم نے پانچ سو نقد اور چار سو کا چیک پیش کیا جنھیں جھپٹ کر جیب میں رکھنے کے بعد وہ دس منٹ تک قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔

انھوں نے ہمارے وزٹنگ کارڈ پر چھیالیس سال کی گارنٹی تحریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس عرصے میں پنکھوں کی کارکردگی میں بال برابر بھی فرق آ جائے تو میری قبر پر جمعرات کی جمعرات جوتے مارنا۔

۴۶ سال سے زیادہ کی گارنٹی پر ہم نے بھی اصرار نہیں کیا، اس لیے کہ پھر بات ۲۰۰۰ء سے آگے نکل جاتی۔ اور اکیسویں صدی تک محض اس مقصد کے لیے زندہ رہنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ بس بیٹھے قبر پر جوتے مارتے رہیں اور وہ بھی ڈھاکہ میں۔ پنکھوں کی پائیداری کا سبب یہ بتاتے تھے کہ یہ انھوں نے ایک نیم غرقاب جہاز سے "سالویج" کیے تھے جو چٹاگانگ کے قریب ایک جزیرے سے ٹکرا کر ناکارہ ہو گیا تھا۔ یہ اس کے EXHAUST FANS تھے۔ غرقاب جہاز تو ہم نے نہیں دیکھا، لیکن ریلوے کمپارٹمنٹ ضرور دیکھے ہیں جہاں بالکل ایسے ہی پنکھے محض زیبائش اور مسافروں کو آپس میں لڑوانے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔

جیسور سلک، جامدانی کی ساری، ڈھاکہ ململ کے دوپٹے، بید کی پکنک باسکٹ، شاہی قوام، ریانی موتی، اجگر کی کھال کا پرس، آرائشی کشتی اور سمپان، رس گلّے اور چم چم، مرزا کمپلے کوملِ کونپلوں کی چائے جن میں سلہٹی دوشیزاؤں کے ہاتھوں کی خوشبو بسی ہو ——— ہمارا پرس ایسی فرمائشوں کی چیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن فینی کی قیمت چکانے کے بعد ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہ رہے کہ منشی گنج کا آدھا کیلا یا جمعہ کی نماز کے بعد کشائش رزق کی دعا مانگنے کے لیے ڈھاکہ ململ کی ایک دوپلی ٹوپی بھی خرید سکیں۔

خیر سے ہم گھر کو آئے

گھر واپس آئے تو سوغات میں فقط اپنے آپ کو لائے۔ لیکن جب ہم نے ذرا تفصیل کے ساتھ بتایا کہ کرنافلی پیپر ملز میں ہمارے ہم شکلوں کو کس طرح چھانٹ چھانٹ کر بیدردی سے قتل کیا گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے ہزاروں آدمی ہیضے میں کیسے چٹ پٹ ہوئے تو سب نے ہماری خالی ہاتھ واپسی کو ہی غنیمت جانا۔ بیوی اور بچے شکر بجالائے کہ ہم نے اپنی چالاکی سے اُن کو بالترتیب بیوہ اور یتیم ہونے سے بچا لیا۔ فینی کی خریداری کی اطلاع ہم نے عمداً کسی کو نہیں دی تاکہ "سرپرائز" کا عنصر باقی رہے۔

بالم گاڑی

ایک مہینے بعد کلیرنگ ایجنٹ نے اطلاع دی کہ فینی بخیریت پہنچ گئی ہے۔ ہم اس کی پذیرائی کو خود گودی پہنچے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے گھر کیوں کر پہنچایا جائے۔ ٹرک کے لیے یہ بہت چھوٹی تھی۔ ایسا ہی تھا جیسے کوئی کرین سے ماچس کی ڈبیا اٹھوائے۔ پھر کرایہ تیس روپے۔ اونٹ گاڑی کے منہ میں یہ زیرہ معلوم ہوتی۔ گدھا گاڑی والا کہتا تھا کہ زمین پر انگلی سے نقشہ کھینچ کر پتہ سمجھا دو، سات روپے ڈیڑھ آنے میں گھر پہنچا دوں گا۔ (ڈیڑھ آنہ بیڑی کے بنڈل کا بھی ہمارے ہی متھے چڑھا۔ اس کی عورت بڑی چنڈال تھی) ہم فینی کو گدھا گاڑی میں تن تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے

تھے، حالانکہ وہ بچارا تو ہمیں ڈرائیور کی اعزازی سیٹ پر بٹھا کر بندر روڈ اور جمشید روڈ ہوتا ہُوا، دس میل، پیرالٰہی بخش کالونی تک ہمارا جلوس نکالنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن گدھے پر بغیر مُنھ کالا کیے بیٹھنا ہمیں ادھُورا ادھُورا سا لگا۔ آخر یہ حل نکالا کہ ہم نے خاں سیف الملوک خاں کی سائیکل لی اور ریخ سے لگے لگے چلنے لگے۔ ذرا دیر میں پسینے کے ریلے بہنے لگے تو اس خیال سے بڑی طراوت محسوس ہوئی کہ اگر ٹرک سے لے جاتے تو ناحق ۳۰ روپے کا خُون ہو جاتا۔ ۲۳ روپے کی بچت دِل لگی نہیں۔ (اس سے پندرہ پیکیٹ سگرٹ خریدے جا سکتے تھے۔) محض حسابی بچت کے زور سے ہماری جیب پھٹی پڑ رہی تھی۔ سچ مچ کی بچت تو خدا جانے انسان کو کتنا مغرور بنا دیتی ہو گی۔ پرانی نمائش کے پاس بالم گاڑی (گدھے کا نام بالم اور ریخ کا نام بلموا تھا) والے نے تالی بجا کر کہا، بابوجی! تمھارے ٹائر میں بہت خوبصورت پُھکنا نکل رہا ہے۔ قبل اس کے کہ اس نظارہ سے ہم بھی لطف اندوز ہوتے، ٹیوب کا غبارہ اتنے زور سے پھٹا کہ ہم ایک فٹ ہَوا میں اچھل کر بالم کی پیٹھ پر گر پڑے اور وہ ہمیں لے کر تین فُٹ اُچھلا۔ سائیکل بغیر سوار کے پندرہ بیس قدم آوارانہ چل کر ایک امریکن ٹورسٹ خاتون (جو گدھا گاڑی کا فوٹو لے رہی تھی) کی سڈول ٹانگوں کے درمیان ہینڈل کی رُکاوٹ کے سبب رُک گئی۔ خاتون کے ہاتھ میں کیمرہ اور ناک★ میں گالی تھی۔

ہم نے امریکن گالی اور گیہوں کا مزا چکھا

ہم بھی اس امریکن بی بی کو کچھ جواب دیتے، لیکن ہمارا نمک حلال معدہ اس وقت امریکن گیہوں کی روٹی ہضم کرنے میں سرگرم عمل تھا۔ سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا۔ یادش بخیر! امریکہ سے پہلی خیراتی گندم کی کھیپ آئی تو وزیرِاعظم محمد علی بوگرہ نے کراچی کے اونٹوں کے گلے میں "تھینک یُو، امریکہ!" کی تختیاں لٹکوا کر شہر میں گشت کروایا تھا۔ امریکہ کو یہ خُمارِ گندم اور

★ "ناک میں" ہم نے اس لیے کہا کہ امریکن تینوں گاف —— یعنی گفتگو، گانا اور گالی —— ناک سے ادا و عطا کرتے ہیں۔

اونٹ کی زبانی قومی جذبۂ تشکّر کی ترجمانی بہت بھائی۔ چنانچہ اس نے بجاطور پر وزیراعظم کے بجائے بشیر ساربان کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی۔ مرزا عبدالودود بیگ کا قول ہے کہ امریکی گندم بالکل خالص اور اصلی ہوتا ہے۔ اصلی سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس کے بیج خاص اسی خوشے سے حاصل کئے گئے تھے، جس کا ایک دانہ کھاتے ہی حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔

اس سے خدانخواستہ گناہِ آدم کی بے توقیری مقصود نہیں۔ یہ آدم ہی کا گناہ تھا کہ ایک سُنسان بیابان خرابے ـــــ کرۂ ارض ـــــ کو گلزار بنا گیا۔ ورنہ نہ جانے کتنے سیارے، کتنے مہ مہر ہول کے اندھی خلاؤں میں قرن ہا قرن سے، ازازل تا بہ ابد، اپنے آدم کی تلاش میں یونہی گردش کرتے رہیں گے۔

نانِ حلف

ویسٹ وہارف سے پیرالٰہی بخش کالونی تک کی مسافت طے کرنے میں ساڑھے تین گھنٹے لگے۔ گھر آیا تو بالم گاڑی (وہ اسے گدھا گاڑی نہیں کہتا تھا) والے نے نیا شوشہ اٹھایا۔ کہنے لگا چار من وزنی کارخانہ ڈھویا ہے۔ چار روپے چڑھانے اُتارنے کے علیحدہ دینے ہوں گے۔ ہم نے کہا "بندۂ خدا! یہ تو گیارہ روپے بن گئے۔ اتنے میں تو ہم اسے نئی وکٹوریہ گاڑی میں ٹھاٹ سے لا سکتے تھے۔" بولا "برو بر لا سکتے تھے، پَن وہ گھسیارا بھی چڑھائی اُترائی کے دام اُوپر سے لیتا۔ گھوڑے کے گھانس کے پیسے الگ۔ پندرہ روپے ٹھاٹ سے دھروا لیتا۔ کیا نام اس کا، سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا گھسیارا۔ بابوجی، سات روپے تو اکیلے بالم ہی کی مجوری ہوئی۔ مَیں تو اس کی آدھی دہاڑی مانگ رہا ہوں۔ کراچی میں گدھا آدمی سے زیادہ کماوے ہے۔" ہم نے کہا "مسلمان ہو۔ خدا سے ڈرو۔ سامان چڑھانے اُتارنے کی اُجرت تو کرائے ہی میں شامل ہوتی ہے۔"

ہمارا یہ کہنا تھا کہ اُس نے گدھے کے توبڑے میں سے روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا نکالا اور ہمارے ہاتھ پر رکھ کر بولا "تمھارا مجاز شریف چاہے تو بھلے ہی گدھے کا حق مار لو۔ پر میرے معصوم

بال بچّوں کے گلے پہ کائے کو چھُری پھیر رہے ہو۔ بابوجی! تم بھی مسلمان، میں بھی مسلمان۔ لا الٰہ الّا اللہ! جو بے فضول اڑی کرے اللہ اس پہ، اس کی آل اولاد پہ، رزق کا دروازہ بند کر دے۔ اسے پُل صراط پہ اندھے سوّر کی سواری نصیب ہو۔ تم خود ہی اس رزق کے ہاتھ لگا کے بتاؤ۔ مجوری اور کرائے میں فرق ہے کہ نہیں؟" ہم نے روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر اقرار کیا کہ ہے تو۔ یہ سُن کر وہ فاتحانہ انداز سے مُسکرایا۔ اب ہم نے ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما کر پوچھا "اب تو ایمان سے بتاؤ کہ اُتارنے چڑھانے کی واجبی مزدوری کتنی ہوتی ہے؟" روٹی کو ہونٹوں اور پیشانی سے لگاتے ہوئے بولا "سائیں! ڈیڑھ روپیہ۔" یہ کہہ کر ٹکڑا ہماری ہتھیلی پر منتقل کیا اور ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "تمھیں یہ بھی منجور نہیں تو بابا رزق کے ہاتھ لگا کر جو کچھ دے دو گے، لے لوں گا۔ دونوں وقت مل رہے ہیں۔"

دونوں کے ایمان پر بن آئی تھی۔ ہم نے بعجلت یہ غذائی بومرنگ اس کے ہاتھ پر رکھ کر، اپنے دونوں ہاتھ پتلون میں چھپاتے ہوئے کہا "لو یہ ڈیڑھ روپیہ۔ مگر رزق تمھارے ہاتھ میں ہے۔ حلفیہ کہو، میں نے لادنے اُتارنے میں برابر کی محنت کی تھی یا نہیں؟" اُس نے سوکھے ٹکڑے کو سَر پر رکھ کر اقرار کیا اور ڈیڑھ روپے میں سے ہماری نصف مزدوری، بارہ آنے، ہمارا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہمیں ادا کر دی۔ اور اس سے قبل کہ حلفِ جاریہ سے ہم ایک دوسرے کے ایمان کو آزمائش میں ڈالیں، اس نے لپک کر اپنے گدھا کا جبڑا کھولا اور کہنی تک اندر ہاتھ ڈال کر نانِ حلف اس کے حلق سے اُتار دی۔

پہنچی وہیں پہ نان جہاں کا خمیر تھا

تھوڑی دُور جانے کے بعد وہ مزدورِ خوش دل کچھ سوچ کر واپس آیا اور بقیہ بارہ آنے بھی لوٹاتے ہوئے کہنے لگا "بابوجی! دونوں وقت مل رہے ہیں۔ روزِ قیامت کے دِن خدا کو عاقبت میں مُنھ دکھانا ہے۔ حشر کے میدان میں بالم تمھارا دامن پکڑے گا۔ پر یہ تمھارا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم جانو، وہ جانے۔ اپنی اپنی گور اپنا اپنا جواب۔ مَیں تو یہ جانوں، تم تو مجھ سے بھی زیادہ

پسینے میں لتھڑ لتھاں ہو رہے ہو! تمھارے بچے میرے بچوں سے بھی چھوٹے ہیں!"

ہم بھینس سے کیوں چمک گئے

فینی کو جب اُتار کر دھویا جا رہا تھا تو چند پڑوسی ٹوہ لینے کے لیے مع اپنی ہم شکل و ہم رنگ و ہم زبان ذُرّیات کے فینی کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ بالشت بالشت بھر کے لونڈوں نے جن مشوروں اور سوالوں کے سینگوں پر ہمیں دھر لیا، ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:——

"انکل! اسے دری پہ لٹال کے اُتار دیئے۔"

"ابے یہ تیری نانی کی میّت تھوڑی ہے۔"

"پاک ایئرویز کا جو جہاز گرا تھا، نا! یہ دِسی کے انجن کی اگاڑی ہے۔ کیوں نا انکل؟"

"سالے بٹری ہوا ہے! بینک کے گودام سے آئی ہے۔ انڈے پھینٹنے کی فیکٹری ہے۔ اندھے کو بھی نظر آدے ہے۔ آنکھیں ہیں یا بھینس کے۔ . . ."

"چوتیّ کے! اس سے کیا شُتر مُرغ کے انڈے پھینٹے گا؟"

"تجھے کچھ پتہ بھی ہے۔ آنٹی بھینس کے گھی کے لوندے کے لوندے ڈال کے انڈے کا ایسا حلوہ بنا دیں ہیں کہ بس اسٹینڈ تک بھبکے جادیں ہیں۔ ایک ہی چمچ کھا کے مرکھنے سے مرکھنے آدمی کے مُنھ پہ رُعاب آجادے ہے۔ کیا نام، ٹھٹھہ سے کھویا آدے ہے۔ پھر برنس روڈ کی ملائی کے ساتھ تر نوالہ کھلادیں ہیں۔ . . ."

"دیکھو لمڈے کی دل لگی! بھینس کا نام آتے ہی سالا رواں ہو گیا!"

فینی کو برآمدے میں رکھوا کر ہم نہانے دھونے چلے گئے۔ چھوٹے سے (۶×۶) غسل خانے میں ہمارے ہی قد و قامت کی ایک پانی کی ٹنکی رکھی تھی جو ہر نہانے والے کے ساتھ شانہ بشانہ غسل کرتی تھی۔ اُسے غسل کروا کے نکلے تو دیکھا کہ محلّے کے لڑکوں کی مدد سے فینی کمرے کے وسط میں پہنچ چکی ہے اور چمگادڑ کی طرح چھت کی طرف پاؤں کیے پڑی ہے۔ ہم نے بیگم سے پوچھا "اسے اُلٹا کیوں کر دیا؟" بولیں "اور لو! مَیں نے تو پنکھے سیدھے لگائے ہیں۔ مگر یہ ہے کیا؟"

ہم نے کہا "تمھاری برتھ ڈے کا پیشگی تحفہ۔ فینی۔ تمھاری فینی!" فینی کے ایک اُلٹے پاتے کے تلوے کو سہلاتی، چمکارتی ہوئی بولیں "برتھ ڈے میں تو ابھی گیارہ مہینے ہیں۔ خیر۔ مگر یہ کرتی کیا ہے؟" ہم نے کہا "بجلی سے چلتی ہے۔"

بولیں "یہ تو اندھے کو بھی نظر آتا ہے۔"

ہم خاموش ہو گئے۔ اس دہشت سے کہ اندھے کے توسط سے مکالمہ میں پھر بھینس اپنی جملہ مصنوعات سمیت نہ کود پڑے۔

خانۂ انوری میں لان کہاں

تھوڑا سا بہلا دا دے کر ہم نے بیگم کو رسان رسان فینی کی کارکردگی سے متعارف کراتے ہوئے بتایا کہ گرمیوں میں شام کے وقت لان پر اس سے زیادہ کار آمد شئے کا نسوانی دماغ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تس پر انھوں نے بڑے "میٹر آف فیکٹ" لہجے میں ہمیں اطلاع دی کہ جس کوارٹر میں ہم پانچ سال سے رہ رہے ہیں اس میں لان نہیں ہے۔ نزدیک ترین لان گاندھی گارڈن میں واقع ہے جو یہاں سے چار میل ہے!

وہ جو کہتے ہیں کہ عورتوں میں INTUITION ہوتا ہے وہ غالباً اسی شئے کا نام ہے جس کا وہ اس وقت مظاہرہ کر رہی تھیں۔ خُدا گواہ ہے کہ فینی سے پہلی نظر میں محبت کے بعد سے اس لمحۂ انکشاف تک ہمیں یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ہمارے دو کمروں والے کوارٹر میں لان نہیں ہے۔ جس جگہ ہمارا پائیں باغ اور نہایت کشادہ ہرا بھرا لان لگ سکتا تھا وہاں یار لوگوں نے ہم سے پہلے اپنے کوارٹر کھڑے کر لیے تھے۔ بعضوں نے تو پگڑی پر بھی اٹھا دیئے تھے۔ خود ہم نے سونے کے بٹن بیچ کر ۳۵۰ روپے پگڑی پر راتوں رات قبضہ لیا تھا۔ پگڑی میں مکان کے علاوہ ایک عدد لوٹا جس کی ٹونٹی جڑ سے جھڑ گئی تھی، دو جھاڑو مگر ایک عمدہ ڈبل بیڈ جس پہ پچھلے کرایہ دار کا انتقال ہُوا تھا، شامل تھے۔

ان مکانوں★ کی دیوار سے دیوار ہی نہیں، بلکہ رات کو مکینوں کے سَر سے سَر اور کان سے کان ملے ہوئے تھے، اس لیے کہ ان کے درمیان صرف کاغذی اینٹ کی "گوش دارد" والی دیوار تھی۔ چنانچہ جب رات ڈھلے کُھسر پُھسر اُدھر ہوتی تو کسی بزرگ کے کھنکارنے کی آواز اِدھر سے آتی:

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیدار بیٹھے ہیں

کیل اُدھر ٹھونکی جاتی تو پلستر اِدھر کا جھڑتا۔ بسا اوقات یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا کہ آدھی رات کو جو بچّہ پیٹ کے درد سے چیخ چیخ کر ہمیں ہلکان کر رہا ہے وہ اپنا لختِ جگر ہے یا سرِ دخانۂ ہمسایہ ——— تاوقتیکہ اندھیرے میں اپنے ہر بچّے کے مُنھ پر ہاتھ رکھ کر یہ تحقیق نہ کر لی جائے کہ چیخ کا صوتی مرکز دیوار کے اِس طرف ہے یا اُس طرف۔ عرصہ کی بات ہے، مگر اچھی طرح یاد ہے کہ پڑوسی عبدالغفور کے الارم سے ہمارا مُرغا جاگتا تھا اور وہ محلّے کی مسجد کے مُلّا کو جگاتا۔ پھر حشر بپا ہوتا۔

ہماری زندگی میں کسی شے کی کمی

ہمیں اس کا بڑا قلق تھا کہ جس جگہ جیل کی بنی ہوئی دری بچھی ہے وہاں گھاس ہوتی اور گھاس میں مچھّر ہوتے تو عیش آجاتے۔ یہ "شاک" اپنے سِسٹم میں جذب کرنے کے لیے کہ جس گھر میں ہم پانچ سال سے رہ رہے ہیں، اس میں لان نہیں ہے، ہمیں تین چار دن لگ گئے۔ میرے دماغ پر تو اتنا ہی الزام تھا کہ اس نے کبھی دریچہ کھول کر اُس طرف نہیں دیکھا کہ باغ میں بہاریں کیسی دُھومیں مچا گئیں۔ مگر ہم نے تو کھڑکی کے اِس طرف والے نقشہ کا بھی نوٹس نہیں لیا جہاں فرش پر چار پیارے پیارے بچّے دیوار تا دیوار لوٹتے لُڑھکتے اور ان کے سر ایک دوسرے سے بلیرڈ کی خوشنما گیندوں کی طرح ٹکراتے رہتے تھے۔

اس واقعہ کے کئی برس بعد کا ذکر ہے۔ ہم نے بڑے رومینٹک موڈ میں ایک محفل میں کہا

★ اگر ہم نے یہ مضمون برادرم سید ضمیر جعفری کی شاہکار نظم "ضمیر کا گھر" (لکڑی کی نصف HUT) سے سرقہ کیا ہے تو کیا ہوا۔ ان کے مالک مکان نے بھی تو میونسپل کارپوریشن سے منظور شدہ نقشہ ہمارے ہی مکان کا چُرایا تھا۔

"اب ہمیں ہر نعمت، ہر آسائش میسّر ہے۔ مگر آج بھی زندگی میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"
مرزا، جو ہمارے جہل اور نالائقیوں کا مکمل عرفان رکھتے ہیں، سُن کر بولے "جس شے کی کمی تمہیں ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے اسے قدما کی اِصطلاح میں عقل کہتے ہیں۔"

ہماری مچھّر دانی

دو تین دن تو جی اُداس اُداس رہا۔ پھر یکبارگی خیال آیا کہ طبیعت کی جولانی اگر زر و جواہر، ابر و بہار، اور سبزہ و گُل پر ہی موقوف ہوتی تو کتنے ہیں کہ خود کو شادمان و شادکام کہہ سکتے۔ جس اَنجانی مہک کے سہارے یہ ساری زندگی گزاری اسے ہوا کا جھونکا کہیں سے اُڑا کر نہیں لایا۔ ساری دِوانی خوشبوئیں نافۂ آرزو ہی سے پھُوٹیں:

جو بہار آئی مرے گلشنِ جاں سے آئی

اس تعلّیٔ متصوفانہ کو موجودہ صورتِ حال پر، جو مایُوس کن ہونے کے علاوہ مضحک بھی تھی، منطبق کیا تو طبیعت پر جو زنگ لگ گیا تھا اس کے چھلکے ایک ایک کر کے اُترنے لگے۔ ظاہر سی بات تھی کہ جو آلۂ لان پر اپنا کرشمہ دِکھا سکتا تھا، وہ ہمارے کمرے میں بھی سائنسی کمالات دکھانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بس اتنی سی بات پہ دِل پکڑ کے بیٹھ گئے! مچھروں کی مردم شماری کر کے تخمینہ لگایا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ گاندھی گارڈن کے تمام لانز پر جتنے مچھّر ہوں گے اُن سے دُگنے تو ہمارے ۱۲×۱۲ کمرے میں پلے ہوئے تھے۔ لان کی ضرورت تو ہمیں محض اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ اس پر مچھّر ہوتے ہیں۔ گاندھی گارڈن کی کوئی اجارہ داری تو نہیں۔ گوشِ حقیقت نیوش سے سُنا تو کراچی کے مچھّروں کا بچّہ بچّہ زبانِ حال سے طعنہ زن تھا کہ "اسیرِ خواہشِ قیدِ مقام تُو ہے کہ مَیں؟" سچ پوچھیے تو کراچی میں مچھّر دانی بھی اس معنی میں استعمال ہوتی ہے جس میں سُرمہ دانی، تلے دانی، چائے دانی، دُودھ دانی، ہمدانی، صمدانی، اُردو دانی وغیرہ جن میں اشیائے متعلقہ کو بحفاظت تمام بند کیا جاتا ہے کہ نِکلنے نہ پائیں۔

چائے کے چونچلے

تنخواہ سے قرض کی پہلی قسط وضع ہوتے ہی ہم نے فینی کی رُونمائی کا اہتمام کیا۔ ۱۲×۱۲ کمرے میں جتنی خواتین و حضرات باہم بغلگیر ہوئے بغیر سما سکتے تھے، اس سے کچھ زیادہ ہی چائے پر مدعو کئے۔ کراچی میں چائے کی ضیافت کی ایک خُوبی یہ ہے کہ چائے ہی پیش کی جاتی ہے۔ چائے کے بہانے دودھ نہیں پیتے۔ لاہور کی طرح نہیں کہ سالم مُرغی اور کباب پہ کباب چلے آرہے ہیں اور ایک صاحب نہیں، کئی ہیں، کہ دودھ سے لبالب کپ میں تین قطرے چائے ٹپکوا کر کہہ رہے ہیں کہ "مَیں تے ہمیشاں سٹرانگ چاہ پینیاواں" (مَیں تو ہمیشہ اسٹرانگ چائے پیتا ہوں) ہم اس میں صرف اتنی سی اصلاح کریں گے کہ چائے دودھ دان میں ہونی چاہیے اور دودھ چائے دانی میں۔ جاپانی اپنی رسم چائے TEA CEREMONY اور اس کے صدیوں پُرانے چونچلوں کی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ لیکن انھیں چاہیے کہ چائے، باتیں اور صحت ایک ساتھ بنانے کا ہُنر زندہ دلانِ لاہور سے آکر سیکھیں۔ کراچی میں چونکہ پپیتے اور خربوزے کا شمار سبزیوں میں نہیں ہوتا، اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ ہم نے چائے پر پھلوں کا تکلّف بھی کیا تھا تو اسے مبالغہ آرائی نہ سمجھا جائے۔ آم، اسپاگیٹی، شریفے اور خستہ پٹے ٹیز کھانے کا مہذب طریقہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا، اس لیے شریفوں اور پٹے ٹیز کا ذکر ہم نے دانستہ نہیں کیا۔ اور ہاں ایک تربوز بھی تھا۔ بہت میٹھا تو نہیں لیکن خالص۔ خالص سے ہماری مُراد یہ کہ اس زمانے میں کراچی کے تربوز گلابی رنگ اور سیکرین کے انجکشنوں کے عادی نہیں ہوئے تھے۔ اور تربوز کی قاشوں نے گاہکوں کو رِجھانے کے لیے لپ اسٹک لگانی نہیں سیکھی تھی۔ تربوز کا چھلکا اگر گہرا سبز ہو تو ہم اسے مطمئن ہو جاتے اور اندر کا حال قسمت پر چھوڑ دیتے۔ تربوز اس زمانے میں اس طرح خریدا جاتا تھا جیسے آج کل شادی کی جاتی ہے —— محض صورت دیکھ کر۔ مگر صاحب! اگلے وقتوں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ کچی صراحی بھی خریدنی ہوتی تو یہی نہیں کہ بزرگ سرِ عام ٹن ٹن بجا کے راستہ چلتے ہوؤں تک کی تشفّی کر دیتے تھے کہ دیکھ لو کہیں سے تڑخی ہوئی یا جھوجھری نہیں ہے، بلکہ کمہار کے چاک اور کمہاری کے چال چلن پر بھی ایک نگہ ڈال لیتے تھے۔ وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے

کم ہے۔

یہ کنارا چلا کہ ناؤ چلی

آخری مہمان کے آنے تک مدعوئین کے نصف بہتر حصّہ کا میک اپ پسینے سے بہہ کر رومالوں میں محفوظ ہونے لگا تھا۔ پھر کیا کیا رنگ بہے اس دم، کچھ ڈھلک ڈھلک کچھ چپک چپک!

سب پسینے میں نہا چکے تو ہم نے فینی پر سے کمبل کا گھونگھٹ اُٹھایا جس کی کانی اوٹ میں وہ ہمارے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔ جیسے ہی سوئچ آن کیا چاروں پنکھے بڑے زور سے چلنے لگے اور ان کے ساتھ فینی بھی چلنے لگی۔ چند لمحے تیزی سے چکر کاٹنے کے بعد وہ پلک جھپکتے میں دھڑ دھڑاتی ہوئی ایک خاتون کی کُرسی کے پایوں میں جا کر ایسی فِٹ ہوئی کہ وہ وہیں سینڈوِچ ہو کر رہ گئیں۔ اُٹھ کر جھپاک سے برآمدے میں بھی نہ جا سکیں۔ وہ تو خُدا نے بڑی خیر کی ورنہ اگر ان کے چُنے ہوئے لال دوپٹے میں اُلجھ کر پنکھے "جیم" نہ ہو جاتے تو ہمیں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔

شکر ہے، دوپٹے سے فینی کو کوئی ناقابلِ مرمت نقصان نہیں پہنچا۔ دوپٹے کے اس اثنا میں نہایت موزوں سائز کے سُرخ ربن بن گئے تھے جن سے اسکول جانے والی بچیوں کی چُٹیاں چار پانچ سال تک گوندھی جا سکتی تھیں۔ فینی کو تو منا کر ہم پھر کرتب دکھانے کے لیے وسط میں لے آئے، لیکن وہ خاتون کمبل کا گھونگٹ کاڑھ کے ایسی بیٹھیں کہ فینی کو ناخن تک نہ دکھایا۔

اب ہمیں ایکا ایکی خیال آیا کہ جس وقت ڈھاکہ میں فینی کی کارکردگی کی نمائش کی گئی تھی تو اللہ بخشے★ ۲۵۰ پونڈ وزنی مُوجد اس پر جم کر بیٹھ گیا تھا، جیسے سرکس میں کرتب دکھانے والی حسینہ گھوڑے کی پیٹھ پر دونوں ٹانگیں ایک طرف کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس دفعہ ہم بھی اسی آسن سے بیٹھ گئے۔ اب جو بیگم نے سُوئچ آن کیا تو فینی ہمیں اٹھلائے اٹھائے پھرکی کی صورت گھومنے لگی۔ ایک بچّہ اپنی ممی کی گود سے اُتر کر ضد کرنے لگا کہ میں بھی انکل کیساتھ MERRY-GO-ROUND پر بیٹھوں گا۔ چار پنکھوں کی ہارس پاور کے زور سے فینی اتنی تیزی سے گھوم رہی تھی

★ نورالحسن شیخ کو ۱۹۷۱ کے ہنگاموں میں اس کی "سلیپنگ پارٹنر" مسز . . . نے پناہ دی اور دوسرے سلیپنگ پارٹنر نے قتل کروادیا۔

کہ اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے ہم نے اپنی ٹانگیں آخری انچ تک پھیلا دیں۔ اور ہماری REVOLVING لات کے قطر سے بچنے کے لیے مہمانانِ گرامی اور ان کی بیگمات نزدیک ترین کونے میں مُنہ دے کر کھڑے ہو گئے۔

فینی پر سے چھلانگ لگا کر ہم نے سوئچ آف کیا۔ اب کی دفعہ ہم نے بیگم کو بھی فینی پر بٹھا کر پنکھے آن کیے تو مجال ہے کہ فینی اپنی جگہ سے ذرا بھی ہل جائے۔ اب جو فینی جم کے، جی لگا کے چلی ہے تو ایک قیامت آگئی۔ چو طرفہ جھکّڑ چلنے لگے۔ کمرہ دراصل اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں زیادہ آکسیجن کی سمائی بھی نہیں تھی۔ ایسی طوفانی ہوائیں ہم نے تو زندگی میں صرف ایک بار دیکھی تھیں، جب چٹاگانگ میں سُرخ سائیکلون آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کمرے کی ہر وہ چیز جس کا وزن فینی اور ہم میاں بیوی کے وزن سے کم ہو، ہَوا میں اُڑ رہی ہے۔ دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر کے تمام ورق بیک وقت پڑھے جا سکتے تھے۔ مردوں کے گال اپنی ہی ٹائیوں کے تھپّڑ کھا کے لال ہو گئے۔ سگرٹوں کے جلتے سِرے سگرٹوں سے علیحدہ ہو کر جگنوؤں کی طرح اُڑنے لگے۔ جیسے ہی فینی نے پوری اسپیڈ پکڑی چھوٹے سے کمرے میں نیلی پیلی آندھی آگئی۔ کھڑکی دروازوں کے پردے اس طرح لہرانے لگے جیسے ایئرپورٹ پر نارنجی رنگ کی بادنما سُونڈ لہراتی رہتی ہے۔ ایک خاتون کی چوٹی ایریل کی طرح کھڑی ہو گئی۔ ایک صاحب کی داڑھی میں ہوا سے قدرتی مانگ نکل آئی۔ فرنچ شفان اور بمبئی سے اسمگل کی ہوئی بنارسی ساریوں میں کچھ دیر تو ٹھنڈے جھکّڑ چلتے رہے۔ پھر ایسی ہَوا بھری کہ بھری کی بھری رہ گئی۔ خواتین گلے گلے تک ان رنگین بُلبُلوں میں ڈوب گئیں۔ کچھ نے پنجوں سے بارڈر اور دانتوں سے پلّو دبانے کی کوشش کی تو بنارسی غبّارے اور پھُول گئے۔ ایک غیور شوہر نے پہلے تو اپنے ہاتھوں سے ان بُلبُلوں کو آگ کی طرح بجھانے کی کوشش کی اور پھر ایک ہی جھٹکے میں دوسری خاتون کے سر سے کمبل اُتار کر اپنی بیگم پر ڈال دیا۔ اور انھوں نے کمبل کے خیمے کے حاشیے پر اونچی ایڑھی کی نکیلی چوبیں گاڑ دیں۔ لیکن تا بکے؟

جب اُٹھتی تھی چوبیں تو جھکا جاتا تھا خیمہ
بھرتی تھی ہَوا جب تو اُڑا جاتا تھا خیمہ

لیکن آفریں ہے اس باہمت خاتون پر جس نے اس آندھی میں کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ ان کی پھولدار ساری کا جو نقشہ ہوا وہ قابل دید و ناقابل بیان تھا۔ آپ نے آندھی پانی میں کبھی رنگین چھتری کو ایکا ایکی اوپر اُلٹتے دیکھا ہے؟ ڈنڈی پر کنول سا کھل جاتا ہے۔

اس واقعہ کو سولہ سترہ سال ہونے کو آئے۔ گھر بھی مُدتیں ہوئیں ہم نے تبدیل کر لیا۔ اور اب چھت کے پنکھے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس بی بی نے پھر کبھی ہماری دہلیز پر قدم نہیں رکھا حالانکہ اب تو وہ تنگ موری کا چُست پاجامہ پہننے لگی ہیں۔

مکرر آنکہ، اس افراتفری میں ہم فینی ڈارلنگ کا انجام بتانا تو بھول ہی گئے۔ اس رُونمائی کے چند ہفتے بعد ہمیں اوکاڑہ منڈی جانا پڑا۔ وہاں گڑ کی ایک دُکان کا اسٹاک چیک کرنے پہنچے تو مال کہیں نظر نہ آیا۔ مالک دکان سے پُوچھا، میاں صاحب! گُڑ کہاں ہے؟ انھوں نے اپنے مُنھ پر انگوچھا ڈالا اور دونوں ہاتھوں سے زور زور سے کھجور کا پنکھا جھلا تو زندہ مکھیوں کے نیچے سے بوریاں اور بھیلیاں برآمد ہوئیں جن میں مُردہ مکھیوں کو گُڑ میں حنوط کیا گیا تھا۔ خیال آیا، آئندہ اسٹاک چیکنگ میں آسانی رہے گی، فینی اس غریب کو ہی کیوں نہ پہنچوا دیں۔ لیکن ایک دِن مسٹر اینڈرسن سے یونہی ذکر آ گیا تو انھوں نے محض اس بنا پر گہری شیفتگی کا اظہار کیا کہ اس کے پنکھے کبھی بحری جہاز کا حِصّہ رہ چکے تھے۔ ”سمندری جہاز شاہی سواری ہے۔ کیا کہنا! اور فرسٹ کلاس میں تو ڈِنر اتنے وافر کہ کوئی گدھا ہی ہو گا جو ایسے میں ٹھوس غذا کو ہاتھ لگائے۔“ دوسرے دن ہم نے پنکھے نکلوا کر ان کی نذر کر دیئے۔ اور انھوں نے انھیں دوبارہ اُلٹا کر کے غسلخانوں میں (جہاں اطمینان کی چند گھڑیاں گزاری تھیں) EXHAUST FANS کے طور پر لگوا لیے۔ چونکہ اصُولاً وہ ماتحتوں سے مُفت چیزیں لینے کے سخت خلاف تھے، اس لیے بدلے میں انھوں نے ہمیں اپنا پاسپورٹ فوٹو دستخط کر کے عنایت فرمایا۔

Librarian
Shibli Memorial Library
New Delhi-2

کوئی قلزم، کوئی دریا، کوئی قطرہ، مدد دے!

حجرۂ ہفت بلا

زینت مینشن میں ایک تنگ و تاریک سی کیبن تھی جس میں ڈھنگ کی ایک میز بھی اِس صورت میں سما سکتی تھی کہ کرُسی کا کھٹراگ نہ ہو۔ اس میں چار آدمیوں کی شانہ بشانہ نشست کا اس طرح اہتمام کیا گیا تھا کہ دیوار میں چیڑ کا ایک آٹھ فٹ لمبا، ڈیڑھ فٹ چوڑا تختہ کیلوں سے جَڑ دیا گیا تھا، جسے کاؤنٹر کہتے تھے اِس لیے کہ ڈکشنری میں اس شے کے لیے کوئی علیحدہ لفظ نہیں تھا۔ بیٹھیں تو کھوے سے کھوا، زانُو سے زانُو بلکہ قلم سے قلم چھلتا تھا۔ جب تک دونوں سِروں کے آدمی زور لگا کر خود کو اپنے جڑواں پڑوسی سے علیحدہ نہ کریں، بیچ والے اُٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ سب باجماعت اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ بغیر نوٹس دائیں بائیں سر ہلا کر لطیفے کی داد دینے کی اجازت نہ تھی۔ سو سال پرانی چھت پر چھپکلی بھی ذرا بے احتیاطی سے چلتی تو ہمارے سر پر پلستر کے لیوڑے گرتے۔ دیوار بوسیدہ اور سیلی سیلی۔ کیلیں بار بار اُکھڑ جاتی تھیں۔ بیشتر وقت ہم تختہ کو گود ہی میں لیے بیٹھے رہتے۔ اس "بلیک ہول" میں کسی طرف سے روشنی کا گزر نہ تھا۔ ہَوا کے جھونکے البتہ باتھ روم سے گزر کر برابر آتے اور ہر دفعہ تازہ بدبُو لاتے۔ مکھی اور مچھر یہاں زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کھٹملوں کا ذکر ہم نے عمداً نہیں کیا، اس لیے کہ ان کے جوہر اول دستے کالردں پر رینگتے ہوئے پکڑے گئے، وہ مقامی نہ تھے۔ ان کے خون کے معائنے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا تعلق اہالیانِ پیر الٰہی بخش کالونی، لالو کھیت اور آرٹیلری میدان کے "بلڈ گروپ" سے ہے۔ دُور ترین

کونے میں ۱۵ واٹ کا ایک ننگا بلب لٹکا ہوا تھا۔ (۱۵ واٹ سے کم کے بلب اس زمانے میں دستیاب نہ تھے۔) اسے سُتلی سے کھینچ کر ایسے غیر جانبدارانہ نقطے پر لے آئے تھے کہ سب کو یکساں طور پر دُھندلا نظر آئے۔ یہ بینک کا رجسٹرڈ آفس اور چیف اکاؤنٹنٹ کا دفتر تھا۔ کلرک تو خیر اپنا علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے تھے، لیکن تینوں افسر ایک ہی قمیض پتلون کے کوزے میں بند تھے۔ بینک میں ملازم ہوئے ہمیں مشکل سے تین سال ہوئے ہوں گے کہ اینڈرسن نے ازراہِ مرحمت ہمیں چیف اکاؤنٹنٹ بنا دیا۔ سیکریٹری اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر ہم پہلے سے ہی فائز تھے۔ ہماری دن دُونی رات تگنی ترقی سے بینک کو کُل ۱۵ آنے کا نقصان ہوا، اس لیے کہ تین ربر اسٹامپ بنوانے پر اس زمانے میں یہی لاگت آتی تھی۔ جیسا کہ ہم تفصیل سے کہیں اور بیان کر چکے ہیں، اس ترقی سے ہر چیز میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی سوائے تنخواہ کے۔ وہ بدستور وہی رہی۔

اینڈرسن ڈسپلن، دفتری آداب اور ضابطہ کا اس قدر پابند تھا کہ کبھی ہمیں نام لے کر نہیں بلاتا تھا۔ بلکہ کاغذات کی نوعیت دیکھ کر چپراسی کو حکم دیتا کہ "انسپکٹر آف برانچز کو بلاؤ"، "کمپنی سکریٹری کو سلام دو"، "ایکدم چیف اکاؤنٹنٹ کو حاضر کرنا مانگتا"۔ اور جس حیثیت سے طلب کرتا صرف اسی کے متعلق سوال کرتا۔ دوسرے عہدے سے متعلق کچھ پوچھنا ہو تو دو تین منٹ کا وقفہ دے کر دوبارہ طلب کرتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک گوشوارے میں، جسے ہم نے خود بنا کر خود ہی، بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ، چیکنگ کے دستخط کیے تھے، ایک موٹی سی غلطی پکڑی اور ہمیں دھمکی دی کہ میں چیف اکاؤنٹنٹ کے کام کے ابھی انسپکٹر آف برانچز سے سرپرائز چیکنگ کروا کے بخیے اُڑوا دوں گا! ہم خود کوزہ و کُوزہ گر و گِلِ کوزہ ہی نہیں، کوزہ شکن بھی تھے۔ کبھی اظہارِ خوشنودی کرنا ہو تو یہ نہیں کہتا تھا کہ میں تمھارے کام سے خوش ہوں، بلکہ فقط اتنا اعتراف کرتا کہ جنرل منیجر سردست انسپکشن ڈپارٹمنٹ سے غیر مطمئن نہیں ہے۔ گفتگو صیغۂ جمع غائب ہی میں ہوتی تھی، حالانکہ ڈپارٹمنٹ ہم کو ہماری ذاتِ واحد پر مشتمل تھا۔ اور اس کی علیحدہ دوات تک نہ تھی۔ ویسے تو گھنٹی بھی نہ تھی، لیکن اس کی کمی ہم نے کبھی محسوس نہ کی۔ اس لیے کہ اسے بجا کر بلانے کے لیے کوئی علیحدہ چپراسی نہ

تھا۔ ایک منشتر کہ چپراسی کو اپنی جیبِ خاص سے چار روپے ماہوار دیتے تھے۔ وہ ہمیں صبح وشام سلام کرنے کے علاوہ کبھی کبھی دفتری کام بھی کر دیتا تھا۔

ہماری ضد و جہد

آخرالذکر ترقی سے پہلے، ہمیں یاد نہیں کہ ڈھائی تین برس تک کبھی گیارہ بجے رات سے پہلے بنیک سے فراغت ہوئی ہو۔ اتفاق سے کبھی سات آٹھ بجے گھر پہنچ جاتے تو بیگم پریشان، اور ہم اسکول سے بھاگے ہوئے بچّے کی طرح کھسیانے ہو جاتے۔ "الٰہی خیر! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کام کبھی اتنا زیادہ ہوتا کہ ایک ڈیڑھ بجے تک ختم ہونے کی صورت نظر نہ آتی تو نیند اُڑانے کی گولی کھا لیتے تھے۔ ہمیں ان گولیوں سے ساجد صاحب نے متعارف کروایا تھا جو ایک کلیرنگ فارورڈنگ ایجنسی میں ملازم تھے۔ دن بھر درآمدی مال چھڑواتے اور رات کو یہ گولی کھا کر جہازوں پر برآمدی مال لدواتے۔ لیلۃ القدر اور ۱۰ شعبان کی نفلیں پڑھتے۔ ایک دفعہ یہ ہُوا کہ گزشتہ رات کی جگار سے نڈھال ہو کر ہم نے سرِ شام ہی گولی کھا لی۔ خلافِ اندازہ، کام دس بجے ہی نبٹ گیا اور گھر آکر ہم چارپائی پر صبح تک آنکھیں پھاڑے طبّی سائنس کے کمالات پر غور کرتے رہے۔ جنرل مینجر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک اسٹاک ایکسچینج میں بنیک کے شیئرز (حصص) کی قیمت نہیں بڑھے گی، عملے میں ایک چپراسی کا بھی اضافہ نہ ہونے دیا جائے گا۔ اُدھر کراچی اسٹاک ایکسچینج ہماری بددُعائے نیم شبی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

کافی عرصے تک کھڑے ہو کر اُونچے کاؤنٹر پر خود کام کیا یا اوروں کا چیک کیا۔ رفتہ رفتہ صحت گری تو شام تک پَیروں پر اتنا ورم آجاتا کہ سات بجے کے بعد جُوتے اُتارنے پڑتے۔ چند مہینوں سے سینے میں بھی دائیں طرف درد رہنے لگا تھا جس کا نوٹس لینا ہم نے کسرِ شان سمجھا، اس لیے کہ دل تو بائیں طرف ہوتا ہے۔ تکلیف نے جب اتنی شدّت اختیار کی کہ محسوس ہونے لگا چوبیس گھنٹے کوئی برمے سے سینہ چھید رہا ہے کہ بیٹھ کے آرپار ہوا جاتا ہے تو ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے نرمی سے کہا کہ دایاں پھیپھڑا متاثر معلوم ہوتا ہے۔ پُوچھا، کاہے

سے؟ ژکھائی سے بولا "آف کورس، ٹی بی"۔ فوراً ایکس رے، خون اور تھوک ٹیسٹ کروانے اور تین مہینے کی رخصت پر کوئٹہ یا مری جانے کی ہدایت کی۔ ڈیڑھ سال بعد جب ہماری مالی تکالیف میں افاقہ ہوا تو ایکس رے کروایا۔ اس سے تصدیق ہوئی کہ دائیں پھیپھڑے پر ایک زخم تھا جو کبھی کا خود بخود مندمل ہو چکا ہے۔ اس سے ہمیں اپنی قوتِ ارادی کی مضبوطی کی داد مطلوب نہیں، بلکہ ٹی بی کے جراثیم کی نقاہت اور بوداپن دکھانا مقصود ہے۔

اس زمانے میں اس رُوٹ پر کل تین لنگڑی بسیں چلتی تھیں۔ ایک تو کانی بھی تھی۔ وہ بھی دس بجے بند ہو جاتی تھیں۔ دن بھر ان کی بیچ سڑک پر مسافروں کے دھکوں اور شوروں سے مرمّت ہوتی اور رات کو گیس کی لالٹین کی روشنی میں مالک خود ان کی آنت اوجھڑی باہر نکال کر معائنہ و پلاسٹک سرجری کرتا تھا۔ دس بجے کے بعد رکشا، جس میں سائیکل سوار جُتا ہوتا تھا، میکلوڈ روڈ سے پیر الٰہی بخش کالونی تک، دس آنے سے کم میں نہیں ملتا تھا۔ یاروں کی جیب میں اتنے فالتو پیسے ہوتے تو دوپہر کا کھانا ہی نہ کھا لیتے۔ یا کم از کم سگرٹ کے دو ٹکڑے کر کے تو نہ پیتے۔ لیکن جب سے ایک کروڑپتی دل کے مریض کو سگرٹ کے تین ٹکڑے کر کے سونے کے سگرٹ ہولڈر میں اُڑس کر پیتے دیکھا تو اپنے ٹوٹوں کے سائز پر رشک آنے لگا۔ اکثر سات میل پیدل ہی گھر جانا پڑتا۔ خواہ رات کے تین بج جائیں، آندھی آئے، بارش آئے اور چاہے تو بس ہی کیوں نہ آجائے ——— ہم گھر ضرور جاتے تھے۔ حالانکہ بینک میں کس چیز کی کمی تھی۔ لکھو کھا روپیہ، پنکھے، کمر سیدھی کرنے کے لیے میزیں، حفاظت کے لیے سنتری، رات بھر کام کرنے کے بعد صبح مُنھ دھونے اور اسے دیکھنے کے لیے واش بیسن اور آئینہ . . . . سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے۔ بیوی کے سوا۔ لیکن صاحبو! جو سکھ چھجّو دے چوبارے، اوہ نہ بلخ نہ بخارے۔ گھر پہنچتے تو بیوی آنکھیں مَلتی ہوئی اُٹھتی۔ تام چینی کے تسلے میں سُہاتا سُہاتا گرم پانی اور دو چمچے نمک ڈالتی اور ہم اس سلونے تسلے میں سانولے پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ کسی نے بتایا تھا کہ اس سے پیروں کی سُوجن اتر جاتی ہے۔ ٹھیک ہی ہوگا، اس لیے کہ صبح آئینے میں چہرہ کافی سُتا سُتا نظر آتا تھا۔ صبح بھی اتنی تکان محسوس ہوتی گویا شام ہو۔

منقّت سی مشقّت! تھکن اور ایسی اٹوٹ تھکن کہ ایک ایک مسام میں اُتر جائے اور ہڈیوں تک کو چٹخا دے۔ رُواں رُواں کراہنے لگتا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا اب کے ایسے سوئیں کہ پھر نہ اُٹھیں۔

بہ کچھ اُوڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہے

پھر کھانا گرم کیا جاتا اور دونوں ساتھ کھاتے۔ وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ تنخواہ دونوں بچیوں کے دودھ کے ڈبّوں کے برابر! البتہ اسکول کے مالک کو تگنی تنخواہ کی رسید دینی پڑتی تھی۔ (چار سال سے اُس کی پنشن رُکی ہوئی تھی۔) ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ دن کیسا کٹا۔ ان کے لیے ہمارے دل سے دعائیں نکلتی ہیں خُدا ان کا سہاگ رہتی دُنیا تک قائم رکھے۔ انھوں نے ہماری عادتیں خراب کر دی ہیں۔ اور ہم گھر گرہستی سے اتنے بے خبر ہیں کہ آج بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمارے کُرتے میں کتنا کپڑا لگتا ہے، کریلا کون سے موسم میں آتا ہے، گوشت کہاں سے آتا ہے، ساری کا عرض کیا ہوتا ہے، چیچک کا ٹیکہ کس عمر میں لگوایا جاتا ہے، ایک سیر بریانی میں کتنی چھٹانک نمک پڑتا ہے؟ پھر صبح چھ بجے اُٹھ جاتے اور سات تک تیار ہو کر پیدل گرومندر پہنچتے۔ وہاں سے بس آسانی سے مل جاتی تھی۔ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ ڈھائی تین میل پیدل چلنے میں، پیر آلہی بخش کالونی کے بس اسٹینڈ پر دھینگا مشتی کرنے کے مقابلے میں آدھا پسینہ بھی نہیں آتا۔ ۸-۳۰ تک دفتر پہنچ جاتے اور پھر اس چکّی میں پستے جس کے دو پاٹن بیچ آج تک کوئی ثابت نہ بچا۔

شاہجہانی روزن

بینکوں میں اُس زمانے میں دیوار کی طرف مُنھ کر کے بٹھانے کا رواج عام تھا۔ اس میں غالباً یہ فائدہ ملحوظ تھا کہ دھیان اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا۔ آدمی یکسوئی سے گھنٹوں دیوار اور کام کو گھُورتا رہتا ہے۔ افسر کا مُنھ بھی نہیں دیکھنا پڑتا۔ خیر، ہمیں اس طرزِ نشست سے کوئی قابلِ ذکر تکلیف نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ہم تو یوں بھی ساری عمر نوشتۂ دیوار ہی پڑھتے رہے ہیں

دائیں جانب ایک کھڑکی تھی جس میں زنگ خوردہ سلاخوں کا آہنی سہرا لٹک رہا تھا۔ یہ سڑک کی طرف کھلتی تھی، لیکن بحکم جنرل منیجر بہادر ہمیشہ بند رہتی تھی۔ موصوف کا خیال تھا کہ کھڑکی کھلنے سے بینک کے رازہائے سربستہ نامحرموں پر کھل جائیں گے۔ کبھی پٹ کھلا رہ جاتا تو باقاعدہ "انکوائری" ہوتی: "کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیوں کر کھلا؟" شام کو موصوف اکثر اپنے ہاتھ سے بعض درازوں کی "تلاشی" لیتے۔ زنگ اور دیمک نے ترس کھا کر اس کھڑکی میں ایک ذیلی کھڑکی بنا دی تھی جس میں سے چائے کا کپ اور سر بآسانی گزر سکتا تھا۔ اس کے سامنے کی ایک سلاخ کسی شوریدہ سر نے نکال دی تھی۔ جی گھبراتا تو ہم اس سوراخ میں سے باری باری سڑک کی سیر دیکھتے۔ یہ "شاہجہانی روزن" کہلاتا تھا۔ روایت ہے کہ شاہجہاں جب قلعۂ آگرہ میں اسیر ہوا تو دیوارِ زنداں میں لگے ہوئے ایک نگینہ پر سے نظریں نہیں ہٹاتا تھا کہ اس میں اس کی چہیتی کے روضہ کا پورا عکس نظر آتا تھا۔ ہمیں سردی، گرمی، پھوار پڑنے، دھوپ ڈھلنے اور چاندنی پھیلنے کا اندازہ اسی روزن سے ہوتا تھا۔ ورنہ اندر تو ہمیشہ جھٹ پٹے کا سا سماں رہتا تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد اسے جھاڑن سے ڈھانک دیا جاتا، اس لیے کہ سنسان سڑک اور گھپ اندھیرا دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا تھا۔

چند روز سے ہم دیکھ رہے تھے کہ ایک سفید بلّی شاہجہانی روزن کے نیچے فٹ پاتھ پر اپنے بچوں سمیت آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک دن اس نے بہت میاؤں میاؤں کی تو ہم نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ملباری چائے والے کو اکنّی پھینک کر اسے دودھ پلوا دیا۔ اس کے بعد یہ روزمرہ کا معمول ہو گیا کہ وہ شام پڑتے ہی وہاں آ جاتی اور ہم اس کا حق ادا کر دیتے۔ اس کے بچوں کی بڑھوار دیکھ کر جی خوش ہوتا۔ کبھی ہم وہاں نہ ہوتے یا اس کی فریاد پر دھیان نہ دیتے تو وہ جنگلے پر چڑھ کر روزن میں سے جھانکتی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بڑی بے بسی جھلکتی تھی۔ دودھ پی پلا کر کچھ دیر اپنے بچوں سے ہمارا جی بہلاتی۔ پھر اٹھ کر چلی جاتی اور دوسرے دن چھ بجے سے پہلے نظر نہ آتی۔ گھر پر بچے روز پوچھتے کہ آج وہ بچے کتنے بڑے ہوئے۔ اگر ہمیں اتوار کو بینک نہ آنا ہوتا تو سنیچر کی شام کو اس کے دودھ کی اکنّی چائے والے کو پیشگی ادا کر دیتے۔ کچھ دن سہ پہر ہی سے ہمیں اس کا انتظار رہنے لگا۔ پالتو جانور کی چُپ دُسرانھ اور اس کا پیار

کتنا بھرپور ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی دکھی ہو یا تنہا۔ اس کے بھی چار بچّے تھے۔

سیمنٹ کا بم

بارش کے دن تھے۔ جھڑ لگ رہی تھی۔ ایسی بارش اور ایسی چھت کراچی میں پھر کبھی نہیں دیکھی۔ لگتا تھا آسمان کا پیندا چھلنی ہو گیا ہے۔ مکان کی چھت بھی چھلنی ہو رہی تھی۔ اور کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے کے لیے چھتری لگانی پڑتی تھی۔ کوئی جگہ ایسی نہ بچی جہاں آدمی موسمی حالات سے ہر لحظہ باخبر رہے بغیر سو سکے۔ اس کے باوجود ہم نے اس بے چینی اور پھرتی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا نظیر اکبر آبادی مذاق اڑا گئے ہیں:

مدّت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا
اٹھ کے ہے ان کو مینہ میں ہر آن چھت پہ جانا

چھت پر جانے سے ایک تو پڑوسنیں مچھر دانی اوڑھ لیتی تھیں اور ان کے مرد مچھر دانی کے بانس لے کر باہر نکل آتے تھے۔ دوسرے، کوئی زینہ سرے سے بنایا ہی نہیں گیا تھا، اس لیے کہ چھت اپنے ہی بوجھ کی متحمل نہ تھی۔

دوسرے کمرے کی چھلنی کے چھید اتنے بڑے تھے کہ اس کا پرنالہ ہی خشک ہو گیا۔

ایک رات ایسی بھی گزری کہ چھت رات بھر روتی رہی۔ اس کی دیکھا دیکھی بچّے بھی۔ اور انھیں دیکھ کر ہماری آنکھ بھی بھر آئی۔ ان سب کو رقّت سے باز رکھنے کے لیے دوسرے دن ہم نے لنچ کے وقفے میں آٹھ پونڈ سیمنٹ خریدا اور شام کو اسے لفافے میں ڈال کر، بوچھار بچاتے بچھلتے، بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اتنے میں ایک بیس گواز★ لمبی کار دائیں طرف سے ہمارے آدھے جسم اور لفافے پر برساتی پانی اور کیچڑ کا اسپرے پینٹ کرتی زد میں گزر گئی۔ کچھ دیر بعد ایک اور کار آتی ہوئی نظر آئی تو ہم نے دوسرا گال بھی پیش کر دیا۔ تاکہ ہمارے

★ گواز (بلوچی) دونوں بازو پورے پھیلانے کے بعد ان کا درمیانی فاصلہ۔

کپڑوں کا بایاں حصہ بھی دائیں کا ہم رنگ ہو جائے۔ آخر ۱۹ نمبر کی بس بھی آہی گئی۔ کیچڑ میں لت پت ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ زندگی میں پہلی بار کشتی لڑے بغیر بس پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی نے فاؤل نہیں مارا۔ کسی نے کمر میں ہاتھ ڈال کر پیچھے نہیں کھینچا۔ ہم سیٹ پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک صاحب جو ہمارے بعد چڑھے تھے اپنے بریف کیس کے بمپر سے ہمیں دھکیل کر ہماری سیٹ پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے سفید شارک اسکن کا سوٹ پہن رکھا تھا جو تر بتر تھا مگر بے داغ۔ ہم ان کے پہلو میں چھت کا ڈنڈا پکڑ کر بس کے جھٹکوں کے ساتھ جھولنے لگے۔ ان کی نگاہیں ہمیں جھڑکتی، پرے ہٹنے کی ہدایت کرتی رہیں۔ بس بڑی تیزی سے کیچڑ اچھالتی جا رہی تھی اور ہم گیلے لفافے کو سینے سے لگائے جھوم رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے اچانک سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور بس دو زبردست جھٹکوں کے ساتھ رکی۔ کھڑے ہوئے مسافروں کی لائن میں ہر سر پہلے پیچھے اور پھر آگے والے سر سے ٹکرایا۔ اور مضروبین نے ایک دوسرے کو "ذرا ہوش کر کے کھڑے ہو" کی تنبیہ کی۔ ہم نے لفافے کو گرنے سے روکنے کے لیے اس میں مضبوطی سے انگلیاں گڑو دیں۔ یکایک بھیگا ہوا لفافہ پھٹا اور سیمنٹ کا پرنالہ شارک اسکن کے سوٹ پر دھواں دھار گرا۔ کچھ دیر تک تو سوائے ہمارے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ سیمنٹ کا بم کیوں اور کیسے پھٹا۔ لیکن جب ہوا میں اڑتے ہوئے غبار کا آخری ذرّہ تک شارک اسکن کے سوٹ پر آ کر جم گیا اور ہمارے ہاتھ میں خالی لفافہ رہ گیا تو دو سال کا بچہ بھی بتا سکتا تھا کہ کیا ہوا۔ دو سال کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ اس سے کم عمر کا بچہ سچوایشن کو سمجھ تو سکتا ہے مگر الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ بچّے بولنے سے پہلے ہنسنا سیکھتے ہیں۔ جیسے ہی ان صاحب پر اس سانحہ کی سنگینی اور حدود اربعہ منکشف ہوئے، اُنھوں نے رومال سے اپنا سوٹ رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن گیلے سوٹ پر اعلیٰ کوالٹی کا مضبوط اور پائیدار سیمنٹ، تہمتان کی طرح ایسا چمٹا کہ

پھیلتا ہے اس قدر جتنا کہ رگڑا جائے ہے

اس نے اس عالم میں بزبان اُردو و انگریزی جو کچھ کہا، خدا اسے معاف کرے۔ ہم نے

تو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔ قابلِ اشاعت فقرہ صرف یہی تھا کہ پرسوں ہی درزی کو ۵ روپے نقد سلائی دی تھی۔ بس اور ان کی زبان چلتی رہی۔ ذرا دیر بعد آخری سیٹ سے ایک صاحب نے ٹھیٹ کرخنداری لہجے میں ہدایت فرمائی "بھائی جان! فوراً سے پیشتر نلکے کے نیچوں غسلِ صحت کر لو۔ جھٹ دینی سیمنٹ جم گیا تو پھٹ دینی ملکہ ٹوریہ کا بُت بن جاؤ گے۔ محلّے کے لونڈے لُو لُو بنا دیں گے۔ جوزہ صاحب بھی نہیں پچھان پادیں گی"۔ سیمنٹ پوش صاحب نے منھ سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن دو تین منٹ بعد پہلے ہی پرنالے پر بس سے اُتر گئے۔

چار پانچ دن بعد ہم پھر اس بس میں چڑھنے لگے تو ہمارے آگے آگے چارٹرڈ بینک کے منیجر کی سکریٹری ــــــ ۳۸-۲۴-۳۸ ــــــ تھی۔ کنڈکٹر نے ہمیں آنکھ مار کے، ریزگاری کا تھیلا بجاتے ہوئے ہانک لگائی "بابو جی! ذرا سنبھل کے۔ آگے پیچھے کے بمپر سے ہوشیار! ہاں جی! میکلوڈ روڈ، پوسٹ آفس، صدر، گرومندر، جمشید روڈ، بڑا گھر (جیل)، کالونی۔ مہربان، قدردان! بس میں چھری، چکّو، چرس، گانجا اور سیمنٹ لے جانے کی اِزاجت نہیں ہے"۔

کراچی کی برسات

پانچ چھ سال بعد ایسی بھر کے بارش ہوتی ہے تو کراچی کی تاریخ اور کیچڑ کا حصّہ بن جاتی ہے۔ سارا نظامِ زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسے معمول پر لانے میں پانچ چھ برس لگتے ہیں۔ جھگّی نشینوں کے لیے یہ بارانِ زحمت، آفاتِ ارضی و سماوی کا درجہ رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو غالب بھی بارش کے اس لیے دِلدادہ نہیں تھے کہ پینے کے لیے آبِ مقطّر کی سپلائی بڑھتی ہے کھیتی باڑی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بلکہ

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں

محکمہ موسمیات بارش کا سالانہ اوسط چار اِنچ بتاتا ہے۔ مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہماری تنخواہ اور آدمجی، سہگل اور داؤد سیٹھ کی آمدنی کو جوڑ کر ہمارا اوسط چھ کروڑ نکالا جائے اور اس پر ہم

سے انکم ٹیکس کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر گھر کے سامنے قرقی کا ڈھول بجا کر ہماری تصانیف کی ناقابلِ فروخت کاپیاں، دوائیں اور ٹائیاں نیلام کر دی جائیں۔

"بقدرِ اشکِ بلبل" تو پھر بھی غنیمت ہے۔ کراچی میں تو بارش اس طرح ہوتی ہے جیسے کوئی مگرمچھ آنسو بہا رہا ہو۔ کراچی کے اکثر پرانے مکانوں کی چھتوں میں آپ کو پرنالے اور موریاں نظر نہیں آئیں گی۔ بعض سڑکوں پر تو برساتی پانی، بلکہ ٹریفک کے نکاس کا بھی کوئی انتظام نہ ملے گا۔ کراچی کو دُنیا کے تمام شہروں کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کبھی چھتریاں اور برساتیاں نظر نہیں آتیں۔ یوں تین چار مہینے گھنگھور گھٹائیں چھائی رہتی ہیں۔ بھُولے سے کسی پروگرام ڈائرکٹر کی کھڑکی کھُل جائے تو ریڈیو اسٹیشن ساون کے گیت نشر کرنے شروع کر دیتا ہے۔ کراچی کے مطلع پر ساون بھادوں میں گہرے بادل اور محکمۂ موسمیات کی پیشگوئیوں کا دُھند چھایا رہتا ہے۔

کِشتِ بے آب نے دیکھے ہیں وہ کالے بادل
جو کہیں اور برسنے کو اِدھر سے گزرے

جب دریاؤں میں طغیانی آتی ہے اور پنجاب کے اکثر علاقے زیرِ آب آجاتے ہیں تو کراچی کی ہوٹلوں اور بوتلوں میں سے کئی ہزار کیوسک فی گھنٹہ بادۂ ناب کا اخراج ہونے لگتا ہے۔ غالبؔ ہوتے تو یہ نقشہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ کلکتے اور اس کے "وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے!" کو بھُول جاتے

لیکن اس سال سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بارش اور ایسی بارش! ایسی بارش ہم نے صرف مسوری میں اپنی شادی کے دن دیکھی تھی کہ پلاؤ کی دیگوں میں بیٹھ کر دُلہن والے آ، جا رہے تھے۔ خود ہمیں ایک کفگیر پر بٹھا کر قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر نہ ہم نے ایسی حرکت کی اور نہ بادل ایسا ٹوٹ کے برسا۔ عجب سماں تھا۔ جدھر دیکھو پانی ہی پانی۔ اس دن سوائے دُلہن کی آنکھ کے ہمیں کوئی چیز خشک نظر نہ آئی۔ ہم نے ٹھوکا دیا کہ رخصتی کے وقت دُلہن کا رونا رسومات میں داخل ہے۔ انھوں نے بہت پلکیں پٹپٹائیں، مگر ایک آنسو نہ نکلا۔ پھر کار

میں سوار کراتے وقت ہم نے سہرا اپنے چہرے سے ہٹایا۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔

ایسی ہی بارش ان دنوں کراچی میں ہو رہی تھی۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے کسی سے سنا تھا کہ پنڈی میں تو ٹکے کے برابر اولے پڑے ہیں۔ ایسا موسلا دھار برسا کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ سڑکیں دریاؤں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر چارٹرڈ بینک کے سامنے اصفہانی خاندان کے ایک بزرگ کی کار ڈبکیاں لگا رہی تھی اور وہ اس کی چھت پر بیٹھے کراچی میونسپل کارپوریشن کو قدیم فارسی میں گالیاں دے رہے تھے۔ اسٹاف کو ½۳ بجے ہی چھٹی دے دی گئی تھی اور ہم بھی چھ بجے تک اٹھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وقت معینہ سے کافی پہلے موتی (بچوں نے بلّی کا یہ نام رکھ دیا تھا) آئی۔ ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کلّہم تین آنے! اب اسے اور اس کے ٹبّر کو ایک آنے کا دودھ پلوا دیتے تو بس کے ٹکٹ میں دو پیسے کم پڑ جاتے۔ وہ کھڑکی کے نیچے بھیگتی رہی۔ روتی رہی۔ ہم نے پروا نہ کی۔ پھر اس نے پنجوں سے کھڑ کھڑ کی اور بار بار روزن سے جھانکنے لگی تو ہم نے اسے جھاڑن سے ڈھک دیا تاکہ یکسوئی سے کام سمیٹ سکیں۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے رزق کی تلاش میں کہیں اور نکل گئی۔ بارش ذرا تھمی۔ ہم اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ چائے والا، جس نے اپنی دکان ایک دروازے کی محراب میں منتقل کر لی تھی، کھڑکی کو کھٹکھٹانے لگا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگا بابو جی! تمھاری بلّی ریلی برادرز کے ٹرک کے نیچے آ کر مر گئی۔ یہ لو اس کے بچّے۔ بلک رہے ہیں۔ یہ خون تمھاری گردن پر۔

یہ خون ہماری گردن پر تھا۔ اگر ہم آج بھی پیدل چلے جاتے تو کون سی قیامت آ جاتی۔ چاروں بچّے بارش میں شرابور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہم نے سب سے چھوٹے کو میز پر بٹھا کر ڈسٹر سے خشک کیا تو اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھا گیا۔ ہو بہو ماں جیسی تھیں۔ بارش پھر تیز ہو گئی اور ہم نے کھڑکی کھول کر تین آنے بہتے نالے میں پھینک دیئے۔ انھی کی وجہ سے وہ اپنی جان سے گئی۔ ہفتوں اس کی اداس نیلی نیلی آنکھیں اس روزن سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیں۔ آخر ہم نے تنگ آ کر اس روزن پر براؤن کاغذ چپکا دیا۔

بول میری مچھلی کتنا پانی؟

چاچا فضل دین (چوکیدار) صبح ہمارے لیے پھر سیمنٹ خرید لایا تھا۔ اور اس گارنٹی کے ساتھ کہ اب کے لفافہ سیمنٹ سے زیادہ پائیدار رہے۔ اس نے کہیں سے ٹوکری بھی برآمد کی جس میں لفافہ اور موتی کے چاروں بچے رکھ کر ہم برستے مینہ میں پیدل روانہ ہوئے۔ وہ تین آنے ہمارے پاس ہوتے بھی تو کچھ کام نہ آتے، اس لیے کہ بسیں چلنی کبھی کی بند ہو چکی تھیں۔ پانی کی چادر چل رہی تھی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ سڑک کہاں ہے۔ لیکن سات آٹھ ڈبکیوں کے بعد آسان پہچان ہاتھ آگئی۔ جہاں جہاں پانی زیادہ گہرا اور گڑھے تھے، وہی سڑک تھی۔ بندر روڈ طغیانی پر آئی ہوئی تھی۔ اور ہم اس کی موجوں اور کوڑے کے تھپیڑوں سے بچتے بچاتے گلیوں گلیوں جا رہے تھے۔ لاٹ ہاؤس سینما کے پاس کمر کمر پانی تھا، بشرطیکہ کمر والے کا قد $6\frac{1}{2}$ فٹ ہو۔ لیکن گلی بہت بہتر تھی۔ وہاں صرف کیچڑ تھا۔ چنانچہ ہم اُدھر ہو لیے۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ محسوس ہوا گویا کسی نے سر پر مشک چھوڑ دی۔ لیکن مشک میں سے دلّی کی نہاری کا دھوُاں تو نہیں نکلتا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ سر پر پہلے تربوز کا ہیلمٹ آن کر فٹ ہو گیا، ورنہ فجری آم کی ایک سیر وزنی گٹھلی سے سر پاش پاش ہو جاتا۔ گردن اُٹھا کر دیکھا تو ایک لڑکی بالٹی اُلٹے، چوتھی منزل کی بالکنی میں کھڑی کھلکھلا رہی تھی۔ کہیں سے آواز آئی "... ہرا سمندر۔ بول میری مچھلی کتنا پانی؟" اس کے بعد ہم نے بندر روڈ پر غرقاب ہونے کو گلیوں میں نہاری سے غسل کرنے اور پھسلنے پر ترجیح دی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پھسلنے پر ہمیں خدانخواستہ اصولاً کوئی اعتراض ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح، ہم تو کیچڑ نہ ہو تب بھی پھسلنے کے لیے جی جان سے تیار رہیں:

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا
پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی اک گھٹا
بجلی بھی چمکی حسن کی، مینہ برسا ناز کا
پھسلن جب ایسی آئی تو پھر کچھ نہ بس چلا
آخر کو واں نظیر بھی آ کر پھسل پڑا

جُوتوں کا اکلوتا جوڑا پانی میں بھیگ کر مخمل کی طرح ملائم ہو گیا تھا اور اسے مزید مخملیں ہونے سے بچانے کے لیے ہم نے ٹوکری میں رکھ لیا۔ پانی میں نہ صرف لُطف آیا بلکہ اس کی انگلی پکڑے پکڑے بچپن بھی لوٹ آیا۔ ہمیں ان پر بڑا ترس آتا ہے جو بچپن میں کبھی ننگے پیر نہیں پھرے، اور نہ بارش میں نہائے۔ انھوں نے اپنا بچپن ضائع کیا۔ وہ کیا جانیں کہ جب بادلوں کے جھاجھم بان، گرمی دانوں سے بھرے ہوئے بدن کو باڑھ پر رکھ لیتے ہیں تو کیسی گُدگُدی ہوتی ہے اور زمین کا ہر قدم پر بدلتا ہوا سُبھاؤ اور کورا پنڈا اس کی نرمی، گرمی اور کٹیلا پن کیا چیز ہوتی ہے۔ دھرتی اپنا آپا اور بھید بھاؤ جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

راستے بھر گہرے فکر اور پانی میں ڈوبے رہے۔ صبح تک جُوتے کیسے سُوکھیں گے؟ "اُجلے پوش لانڈری رجسٹرڈ" بھی بارش کی وجہ سے دو دن سے بند تھی۔ بارش سے پہلے اس کے کارندے شہر سے دور دھوبی گھاٹ کے گندے نالے میں "ارجنٹ" دُھلائی کرتے تھے۔ بارش کے بعد یہ سہولت گلی گلی میسّر ہو گی۔ یہ لانڈری بکفایت یعنی ڈھائی آنے میں دِن کے دن قمیض دھو دیتی تھی، جب کہ شہر کی لانڈریاں اس زمانے میں قمیض کی "ارجنٹ" پھڑوائی کے چھ آنے لیتی تھیں۔ ہم سوچنے لگے کہ گھر میں اتنا پانی کہاں کہ کپڑے دھو کر صبح کوئلوں کی استری سے خشک کر لیں۔ آخرالذکر کو برسات میں دھوپ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ گھر میں کوئی مضبوط الگنی بھی نہیں تھی جس پر خُود کو لٹکا کر کپڑے پہنے پہنے سکھا لیتے۔ کالونی میں نلکے نہیں تھے۔ مگر یہ اکبر الہ آبادی کا زمانہ نہیں تھا کہ نلکے لگنے کو ایک قومی سانحہ سمجھ کر شاہ ایڈورڈ کی دہائی دی جائے کہ کیا زمانہ آن لگا ہے:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

بحمداللہ! میونسپل کارپوریشن نے ہمیں پہلے سانحہ سے بذریعہ مشک محفوظ رکھا۔ کالونی کی کوآپریٹو سوسائٹی ٹنکیوں کے ذریعہ پانی تو کیا تقسیم کرتی، بُوند بُوند کو ترساتی تھی۔ ہمیں تین مشک روزانہ کے کوپن ملتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا یہ مشکیں خاص طور پر آرڈر دے کر بکری کے قبل از وقت پیدا ہونے والے بچّوں کی کھال کی بنوائی گئی تھیں۔ ان تین مشکوں میں بھی بھشتی حسبِ توفیق وطاقت پھونک بھر دیتے تھے۔ ربر کی دریافت سے پہلے ایسی مشکیں تیرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی زوری وزاری یا آٹھ دس آنے کے نذرانہ سے ایک مشک زیادہ مل جاتی تو گویا عید بلکہ ہولی ہو جاتی۔ تین دن سے سڑکیں کٹ جانے کے باعث پانی کی ٹنکیاں نہیں آئی تھیں اور پانی پینے کا بھی تیمّم کرنا پڑتا تھا۔

گھر کے سامنے والی سڑک کے نالے کی صحیح گہرائی، آخری اعشاریہ تک، تو ہم نہیں بتا سکتے۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک موج ہماری عینک بہا کر لے گئی اور اب ہم اس قابل بھی نہ رہے کہ، ڈبکی کھائے بغیر، پانی اور خشکی میں تمیز کر سکیں۔ گلی کے نکڑ پر شیخ رحیم بخش، مالک رحیم بس کمپنی، نے ترس کھا کر ایک پُرانا ٹیوب دیا، جسے کمر سے باندھ کر ہم نے چڑھتی ندی پار کی۔ کالونی کے تمام مکان ایک دوسرے کا چربہ تھے۔ اور بغیر عینک کے تو ہر مکان پر اپنے مکان کا گمان ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ تین چار جگہ اہلِ محلّہ نے پان کی ایک ایک گلوری کھلا کر واپس پانی میں چھوڑ دیا۔ دربدر لنگر اندازی کے بعد گھر آیا تو دیکھا کہ برآمدے اور کمرے میں نالے کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے (مکان چوڑا ہے پر نشیبی علاقے کے پیالے میں واقع ہوا تھا۔) جن موریوں کا کام گھر کا گندہ پانی باہر نکالنا تھا، وہ اب فعلِ معکوس انجام دینے میں جُتی ہوئی تھیں جنی باہر کا غلیظ پانی ان کے توسط سے بُھل بُھل اندر داخل ہو رہا تھا۔ سطحِ آب پر جا بجا رُوئی کے گالے تیر رہے تھے۔ ہُوا یُوں کہ ایک دن ہم نے اپنی اولاد کو تنبیہ کی کہ شرفا کے بچّے گلاسوں اور چپلوں سے نہیں لڑا کرتے۔ خُدا ان کی عمر دراز کرے، اس کو ان سعادت مندوں نے ایسا گرہ میں باندھا کہ پھر کبھی تکیے سے زیادہ سخت چیز استعمال نہ کی۔ ایک چارپائی پر دونوں بچّیاں اپنی گڑیوں پر چھتری لگائے سہمی بیٹھی تھیں۔ چھوٹے کے منھ پر ابھی تک دُودھ کی مونچھیں بنی ہوئی

تھیں۔ دوسری چارپائی کتابوں کے مچان تلے بچھی تھی، جو کباڑی سے خریدے ہوئے "صبغے اینڈ سنز، ناشرانِ و سوداگرانِ کتب" کے سائن بورڈ کو دیوار پر ریلوے کی بالائی برتھ کی طرح لٹکا کر بنایا گیا تھا۔ اس پر ساری متاعِ فقیر ——— کتابیں ——— تین قطاروں میں سجی رہتی تھیں اور ان کے اوپر دیگر اشیائے غیر ضروری۔ اس "فالس سیلنگ" کے نیچے چارپائی پر دونوں بیٹے پشیمان بیٹھے تھے۔ بڑے نے سوتے میں نیکر سے باتھ روم کا کام لیا تھا اور اب پیش بندی کر رہا تھا کہ دیکھئے امّی! میری نیکر میں آپ کے گڈّو نے پیشاب کر دیا ہے! تعجب اس پر تھا کہ گڈّو میاں سبکیاں لے لے کر یقین دلا رہے تھے کہ امّی اب نہیں کروں گا! لالٹین ایک کونے میں لٹکی ہوئی تھی جہاں ایک کالی زبان بن گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے گلوب پر جو کاغذ آٹے سے چپکایا گیا تھا وہ آدھا جل چکا تھا★۔ اس کی آنکھ مارتی ہوئی روشنی میں ہمارے بچّوں نے بلّی کے بچّوں کو دیکھا اور دونوں کے بچّے ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

آج ہم نے اپنا چہرہ دیکھا

بیگم بہت خوش خوش نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں کچے صحن میں لے گئیں اور کہا "دیکھو آج میں نے دو ٹنکیاں پانی سے بھر لی ہیں! بالکل موتی کی طرح! ڈھیروں کپڑے دُھل جائیں گے"۔ تین دن سے پانی بالکل بند تھا اور لوگ بُوند بُوند کو ترس گئے تھے۔ یہ دو ٹنکیاں انھوں نے برآمدے کے پرنالے کے نیچے رکھ کر پانی سے بھری تھیں۔ انھیں دیکھ دیکھ کر یہ بی بی اس قدر خوش ہو رہی تھی گویا کوئی خزانہ مل گیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ دونوں لبالب بھری ہیں۔ انھوں نے لالٹین اپنے چہرے تک اٹھائی تو مانگ میں ایک سفید بال نظر آیا جو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانی اولے کی طرح ٹھنڈا ٹھار اور موتی کی مانند

★ یہ شکوۂ ایّام نہیں، تحدیثِ نعمتِ ربِّ جلیل ہے۔ ایک دن بیگم نے بہت خوش ہو کر کہا تھا کہ خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ گھر میں بجلی نہیں۔ ورنہ تمھارے بچے ہر وقت پلگ ساکٹ کے سوراخوں میں انگلی ڈالے بیٹھے رہتے۔

جھلِمل جھلِمل کر رہا تھا۔ ہمیں اس میں اپنا چہرہ نظر آیا۔

مفلسی میں جُوتا گیلا

گھر کی ساری کائنات چارپائیوں پر محفوظ کر لی گئی تھی۔ بچّے ایلومینیم کی پتیلی کو تیرتا ہوا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مٹی کے چوُلھے سے پانی اُبل رہا تھا۔ دیکھا کہ آج پَیروں پر ورم نہیں ہے۔ اتنی دیر ٹھنڈے پانی میں رہنے سے تلوے اتنے گورے ہو گئے کہ ہمیں شبہ ہونے لگا کہ کسی اَور کے تو نہیں آ گئے۔ سلوٹیں پڑنے سے، بقول گڈّو میاں، کریپ سول بن گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں نالا اُتر گیا اور سارے گھر میں اُجلی اُجلی ملائم مٹّی کی دبیز تہہ چھُو گیا۔ بچّے اپنے ننھّے منّے پَیروں کے نشان دیکھنے کے لیے اس پر خوب چلے۔ بالکل ایسے ہی بقدم خوُد نشان پلنگ کی چادر پر بھی تھے، مگر وہ زیادہ واضح اور دیرپا تھے۔ سونے سے پہلے ہم نے دونوں جوتوں کو فیتے سے باندھ کر لالٹین کی گردن میں ہار کی طرح لٹکا دیا تاکہ صبح تک سُوکھ جائیں۔

صبح ساڑھے چار بجے بجلی کے کڑکنے سے آنکھ کھُلی تو کمرے میں چمڑا جلنے کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ اُٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو جُوتا گلوب کے ٹوٹے ہوئے رُخ پر تھا، اس کی ایڑی کے اوپر کا پُشتہ جل کر اب پشاوری چپل بن گیا ہے۔ ہم لالٹین اور جُوتا بجھا کر ایسے سوئے کہ صبح پونے سات بجے آنکھ کھلی۔ اس وقت تک بیوی ہمارے کپڑوں پر استری کر کے اپنے اسکول پڑھانے جا چکی تھیں۔ کپڑوں پر ایک پرچہ رکھا ملا جس پر لکھا تھا کہ رات میں تمھیں بتا نہ سکی۔ ڈاکٹر نے مجھے یرقان بتایا ہے۔ خواہ مخواہ ڈھیر ساری دوائیں اور انجکشن لکھ مارے ہیں۔ میں واپسی میں پاکستان چوک کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے دوا لیتی آؤں گی۔ زرد رنگ تمھارا فیورٹ (پسندیدہ) رنگ بھی تو ہے۔

زخم کا سفر

جوتا ایسی چیز نہیں کہ زیور کی طرح مانگ تانگ کر پہن لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ

آیا کہ چپل پہن کر بینک جائیں اور تین دن بعد تنخواہ ملے تو نیا جوتا خرید لیں۔ پھر خیال آیا کہ اگر اینڈرسن پوچھ بیٹھا کہ آج انسپکشن ڈپارٹمنٹ چپل پہنے کیوں پھر رہا ہے تو کیا جواب دیں گے۔ ایک دفعہ ایک افسر بینک میں بغیر ٹائی کے آگیا تو اینڈرسن نے اس سے پوچھا کہ آج کیا بینک ہالی ڈے ہے، جو یوں ننگ دھڑنگ پھر رہے ہو؟ اسی طرح ایک کلرک کا تین دن کا بڑھا ہوا شیو دیکھ کر دونّی پکڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ اپنا کیموفلاژ منڈوا کر آؤ تاکہ چہرہ شناخت کر کے رجسٹر میں حاضری لگائی جا سکے۔

ذہن پر زور ڈالا تو اس کا حل بھی نکل آیا۔ چپل پہن کر ایک پیر پر پٹی باندھ لیں گے۔ کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے چوٹ لگ گئی ہے۔ اور یہ کچھ ایسا جھوٹ بھی نہیں۔ آخر اندرونی چوٹ تو آئی ہی تھی جس کے بارے میں حضرت نوحؔ ناروی سہل ممتنع میں فرما گئے ہیں:

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

ایک مونڈھے پر نیلے رنگ کا جھاڑن پڑا نظر آیا۔ اس میں سے ایک لمبی سی دھجّی پھاڑ کر پٹّی باندھ لی۔ سہ پہر کو اینڈرسن کی نظر پڑی تو کہنے لگا کہ زخم پر کبھی رنگین پٹّی نہیں باندھنی چاہیے۔ پک جاتا ہے۔ خصوصاً برسات میں۔

دوسرے دن صبح دونوں کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو بیگم دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہنے لگیں کہ تمھارے ان لاڈلوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور کچھ نہیں تو کمبخت آدھا دوپٹہ ہی پھاڑ کر لے گئے۔ ان کا دایاں کان ایک کھونٹے میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

ہم نے پٹّی بجنسہٖ واپس کر دی۔ اور جلدی جلدی ایک پھٹے پاجامے کے لٹھے کی سفید پٹی باندھ کر بینک چلے گئے۔ گیارہ بجے کسی کام سے اینڈرسن نے طلب کیا۔ واپس آنے لگے تو عینک کو ناک کی پھننگ پر رکھ کر اس کے اُوپر سے دیکھتے ہوئے فرمایا

JUST A MINUTE, TAMERLANE!

تمھارے زخم نے چوبیس گھنٹے میں

کافی مسافت طے کی ہے۔ دائیں سے بائیں پیر میں منتقل ہو گیا ہے!"

اب جو ہم نے نگاہ ڈالی تو دھک سے رہ گئے۔ افراتفری میں آج دوسرے یعنی بائیں پیر پر پٹی باندھ کر آ گئے تھے۔

جانا ہمارا کاک ٹیل پارٹی میں

ڈی۔ جے اور انگرکھا

"تمہارے پاس D.J. ہے؟" مسٹر اینڈرسن نے پوچھا۔

"یہ کیا ہوتی ہے؟"

"ڈِنر جیکٹ۔ بلیک ٹائی۔"

"وہی جس کا کالر سیاہ ساٹن کا ہوتا ہے اور پتلون پر بینڈ بجانے والوں کی سی ریشمی پٹّی لگی ہوتی ہے؟"

"سلوا تو لو۔ بینک سے ڈِسمس ہونے کے بعد بینک کی انتظامیہ کی طرف سے بینڈ بجانے پر کوئی پابندی نہیں۔ تم نے سُنا ہوگا، ڈِنر جیکٹ پہن کر تو بینکر کی بھی اشرافوں کی سی صورت نکل آتی ہے۔"

"سر! میں ڈنر جیکٹ پہن کر کہاں جاؤں گا؟ اردو میں مثل ہے کہ جنگل میں مور ناچا کِس نے دیکھا۔"

"HOW STUPID ! جاننا چاہیے کہ مور تو صرف اپنی مادہ کو دکھانے کے لیے ناچتا ہے۔ اسے آدمیوں سے کیا رغبت ہوسکتی ہے؟ پروموشن کے بعد تم بوٹ کلب یا سندھ کلب کے ممبر نہیں بنے؟ کیا ساری تنخواہ دال روٹی پر ہی ضائع کر دیتے ہو؟ اب تو غیر یورو پین بھی ممبر ہو سکتے ہیں۔"

"میں بس سے آتا جاتا ہوں۔ پیر الٰہی بخش کالونی کے بس اسٹاپ کے بھیڑ بھڑکّے، کشتم پچھاڑ

سے دل ڈرتا ہے۔ دو ڈھائی میل پیدل چل کر صبح گرو مندر سے بس پکڑتا ہوں، تاکہ دفتر بغیر قمیض کے نہ پہنچوں۔"

"بینک کے جنرل مینجر کو اس سے سروکار نہیں کہ تم اپنے نیم رضا مند وجود کو ڈرائنگ روم سے بینک میں کس طرح ڈھو کر لاتے ہو۔"

"بائی دی وے، میرے کوارٹر میں کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ ہمارے حصے میں ایک کمرہ آیا ہے، جس میں قالین بھی نہیں۔ WALL-TO-WALL بچے بچھے رہتے ہیں۔"

"میں تمھاری مفلوک الحالی کی بے مثل منظر کشی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ مغرب میں ذاتی مشکلات کا 'اِسٹرپ ٹیز' بدمذاقی سمجھی جاتی ہے۔ اچھا تو، ۲ تاریخ کو میرے ساتھ کاک ٹیل میں چلنا۔ پھر تمھیں CALEDONIAN SOCIETY کے ANNUAL BALL میں بھی لے چلوں گا۔ اسکاٹ کلچر اور پہناوے دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ ڈِنر جیکٹ فوراً بنوالو۔ افسوس کہ تمھارا کوئی معقول 'فارمل ڈریس' نہیں۔ تمھارے جتنے بھی پہناوے ہیں سب کے سب UNSCIENTIFIC"

"کیسے؟" ہم نے بات کو طول دیا کہ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔

"عجیب بات ہے۔ عورتیں تو اپنے خوب صورت چہرے کو نقاب سے اور ملحقہ ارتفاعی تجاوزات کو دوپٹے سے ڈھانک لیتی ہیں اور مرد؟ بُرا نہ ماننا۔ میں نے کلکتہ میوزیم میں اودھ کے نواب کی تصویر دیکھی تھی۔ ڈھاکہ کے ململ کے انگرکھے میں سے ایک عدد نوابی چوچی بطور نمونہ باہر نکال رکھی تھی۔ دوسری بھی ویسی ہی ہوگی۔ VERY UNSCIENTIFIC! اپنے لباس پر غور تو کرو۔ ۱۱۶ ڈگری ٹمپریچر میں سر پر بیس گز لمبا صافہ، اور جنوب میں دس گز گھیر کی شلوار! مانسون کی اُمس میں اچکن اور ناف سے لے کر ٹخنوں تک سرکس والوں کا سا انڈرویئر۔ کیا کہتے ہیں اسے؟"

"چوڑی دار پاجامہ۔"

"ALL VERY UNSCIENTIFIC! "

"لیکن یورپین لباس اس سے بھی زیادہ اَن سائنٹیفک ہے۔ یورپ میں برف گر رہی

ہو اور ٹمپریچر نقطہ انجماد سے بیس ڈگری کم ہو تو ہٹے کٹے مرد تو گھٹنوں تک دوہرے اُونی موزے ، LEGGING اور گرم پتلون پہنتے ہیں اور نازک اندام عورتوں کی ٹانگیں ، رانوں تک کھلی رہتی ہیں !"

"سود خور مُلّا ! تمھیں ننگی ٹانگوں پر کیا اعتراض ہے ؟"

"سر ! مجھے تو باقی ماندہ لباس پر اعتراض ہے۔"

"تم نے کل مجھے بیلجین فرینک کا بھاؤ غلط بتا دیا ۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا ۔" اس نے اِس طرح کہا جیسے ہمارا فقرہ سُنا ہی نہیں۔

مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو

یہ وہ زمانہ تھا جب برٹش کمپنیوں ، فوج ، آئی سی ایس اور انگریزوں کی ماتحتی میں کام کرنے والے دیسی افسر اپنے آپ کو روشن خیال ، سوشل اور اہل ثابت کرنے کی خاطر دِل پہ جبر کر کے شراب پینا سیکھتے تھے ۔ کچھ دن کی مشق کے بعد ایسے رواں ہوتے کہ نہ پینے کے لیے دل پہ جبر کرنا پڑتا تھا ۔ روز کہیں نہ کہیں کاک ٹیل پارٹی ہوتی تھی اور آدمی ذرا سوشل اور خوش اخلاق ہو تو سال کے ۳۶۵ دن دوسروں کے خرچ پر خود کو ہر شام اُلّو بنا سکتا تھا ۔ کاک ٹیل پارٹی بیک وقت انگریزوں سے تقریب بھر ملاقات ، مفت مَے نوشی اور صاحبانِ امروز تک رسائی کا پاسپورٹ ہوتی تھی ۔ عجب مخمصہ تھا ۔ کچھ مسلمان افسر تو اس الزام میں نکال دیے جاتے تھے کہ وہ سوشل نہیں ، یعنی شراب نہیں پیتے ۔ بقیہ افسروں کو اس بنا پر برخاست کر دیا جاتا کہ وہ ALCOHOLIC ہو گئے ہیں اور مکسڈ پارٹیز میں اُودھم مچانے لگے ہیں ۔ دو چار ہی خوش قسمت ایسے ہوتے تھے جو برخاست ہونے کی ذلّت سے بچ جاتے تھے ۔ یہ وہ ہوتے تھے جو ڈسمس ہونے سے پہلے ہی جگر کے "سروسس" میں باعزت طریقے سے وفات پا جاتے تھے ۔ راویانِ رنگیں بیاں سے روایت ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں انگلینڈ میں لوگ بھوت پریت کے بڑے قائل تھے ۔ ہر کسی عورت پر چڑیل ڈائن کا شبہ کرتے ۔ پھر یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ وہ واقعی چڑیل ہے یا بے گناہ ، گاؤں کے پنچ پٹیل اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے کستے

اور بھاری پتھر سے باندھ کر نزدیک ترین دریا میں پھینک دیتے ۔ اگر وہ ڈوب جائے تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ چڑیل نہیں، بالکل معصوم تھی ۔ اور اگر نہ ڈوبے تو اس کا چڑیل ہونا مسلّم ۔ اس صورت میں اسے پانی سے نکال لیتے ۔ گرم کپڑے پہناتے ۔ اچھے اچھے کھانے کھلاتے ۔ اور پھر آگ میں زندہ جلا دیتے کہ چڑیل کی اس زمانے میں یہی سزا تھی ۔ الزاموں کی نوعیت بدلتی رہی ہے، مگر زمانے کا طرزِ تعزیر آج بھی وہی ہے ۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا

مسٹر اینڈرسن کچھ دن سے ہم پر مہربان تھے ۔ ہم ان کے مشیرِ خاص تھے ۔ مطلب یہ کہ ہر اہم مسئلہ پر وہ ہم سے مشورہ لیتے اور ہمیشہ اس کے خلاف عمل کر کے کامیاب ہوتے ۔ دوسرے دن انھوں نے پھر تاکیداً کہا "۲۷ تاریخ نہ بھولنا ۔ ایسی کاک ٹیل پارٹیوں کے دعوت نامے حاصل کرنا تمھارے فرائضِ منصبی میں داخل ہے ۔ چوٹی کے انگریزوں سے میں خود تمھارا تعارف کراؤں گا ۔" اِدھر کچھ عرصہ سے ہم خود محسوس کر رہے تھے کہ ہر چند ہماری تنخواہ میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوا، لیکن جب سے ہم چیف اکاؤنٹنٹ، سیکرٹری اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر بیکوقت فائز ہوئے ہیں ہماری "امیج" میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی ہے ۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسی تنخواہ میں ہم بہتر سگرٹ ڈھکڑے کر کے پینے لگے تھے ۔ ڈالڈا چھوڑ کر اب اصلی گھی کے نام پر دھوکا کھانا شروع کر دیا تھا ۔ لباس اور اس کے لوازمات سے بھی نخوت جھلکتی تھی ۔ یعنی ٹائی کی گرہ پھولی ہوئی ہوتی تھی ۔ اب ایسے موزے بھی نہیں پہنتے تھے جن میں ایسا سوراخ ہو جس میں سے گردن نکال کر انگوٹھا آزادی کا سانس لے سکے ۔

جس محلّے میں تھا ہمارا گھر

چاؤ میں اگلے ہفتے مکان بھی تبدیل کر لیا ۔ اس محلّے میں ایک نہیں، کئی سوداگر رہتے تھے ۔ علاقے کے POSH ہونے کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ ہماری چھوٹی بٹیا ہمسائے کے بچّوں کے بارے میں ہم سے پوچھنے لگی، بابا! یہ ہر روز عید کے کپڑے کیوں پہنے پھرتے ہیں؟ گڈّو میاں

نے ہمسائے کی دیواروں پر ساگوان کی PANELLING اپنی چھ سالہ زندگی میں پہلی بار دیکھی تو ہم سے کہا کہ انھوں نے دیواروں پر بھی فرنیچر لٹکا رکھا ہے! چند روز بعد دائیں ہاتھ والی پڑوسن نے بتایا کہ بائیں ہاتھ والی پڑوسن کہہ رہی تھی کہ ہم اپنے بچّوں کو اس کے نئے قالین پر حوائجِ ضروری سے فارغ کروانے لے جاتے ہیں۔ ملاقات ولاقات تو محض بہانہ ہے۔" کوئی پوچھے، انھیں اِس LOCALITY میں آنے کی کیا مار پڑی تھی۔ ایرانی قالین دیکھے بغیر لاڈلوں کا پیشاب نہیں اترتا۔" ہمارے غسلخانے میں کائی لگے گھڑوں اور ٹنکی کے بجائے اب گرم اور ٹھنڈے پانی کا اہتمام تھا۔ یعنی واش بیسن کی ٹونٹی سے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد پانی نکلتا تھا۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں کوئلے سے دانت نہیں مانجھتے تھے، بلکہ ٹیوب پر کُود کُود کر ٹوتھ پیسٹ کشید کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے افسری کی شان ٹپکنے لگی۔ بینک اکاؤنٹ سے بھی سُرخی جھلکنے لگی۔

انہی دنوں اینڈرسن نے اپنا جی۔ ای۔ سی کا پرانا فرج ازراہِ پرورش چار سو روپے میں ہمیں فروخت کر دیا۔ نیا ساڑھے سات سو میں آتا تھا۔ ہمارے ہاں مہینوں اس میں پپیتے لٹکتے اور بینگن برفاتے رہے۔ پہلے دن تو ہم نے اس میں کوری صراحی بھی رکھی دیکھی تھی۔ تین چار دن استعمال کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا موٹر اینڈرسن کے مزاج کی طرح ہے۔ یعنی چار پانچ منٹ چل کر آگ بگولا ہو جاتا اور شور و غوغا کرنے لگتا۔ اسے ٹھنڈا رکھنے کے لیے ہم نے اسی کمپنی کا بنا ہوا پنکھا سوا تین سو میں خریدا۔ نئے فرج کے مقابلے میں مجموعی سودا پھر بھی ۲۵ روپے سستا پڑا۔ اور انہی داموں ایک کے بجائے دو چیزیں ہاتھ لگ گئیں۔ پنکھا چوبیس گھنٹے فرج کے بلڈ پریشر کو بگڑنے سے باز رکھتا تھا۔ گرمی زیادہ پڑے تو ہم اپنی مصالحتی چارپائی پنکھے اور فرج کے درمیان ڈال لیتے تھے۔

پیرہن یوسفی

اب ہم اُجلے پوتّی کا آٹھ آنے یومیہ تاوان ادا کر کے، پیر الٰہی بخش کالونی لانڈری سے اپنے کپڑے اس اُرجنٹ بنیادی پہ نہیں دُھلواتے اور چھڑواتے تھے کہ جو قمیض صبح دفتر جاتے وقت دے گئے وہ اسی شام شتابی چھڑوالی یا گھر پہ ڈلیور کر دی گئی۔ اس زمانے میں ہم اپنی میلی قمیض رات

کو دھوبی کے پاس ہرگز نہیں رہنے دیتے تھے۔ اب ہم نے ۸ روپے سینکڑا پر تین قمیض دھونے کے لیے ایک نیا دھوبی لگا لیا۔ کپڑوں کی چوری بھی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ طبیعت میں اتنی احتیاط تھی کہ پہلے ہی دھوب میں دو قمیضوں کے کالروں کی دونوں نوکوں پر سامنے کی طرف دھوبی مارکہ لگا دیتا تھا تاکہ ان نشانوں کو دیکھ کر احباب پہچان جائیں کہ قمیض کے نیچے ہم ہی ہیں۔ پچھلا دھوبی کالر پر تو استری اچھی نہیں کرتا تھا مگر موزوں اور انڈر ویئر میں خوب کلف لگاتا تھا۔ بنیان میں کلف لگا کر سُکیڑنے کی شکایت ہم نے قصداً نہیں کی۔ اس لیے کہ ۳۶ انچ کا جو بنیان دُھلنے جاتا تھا وہ ۴۶ انچ کا ہو کر آتا تھا۔ میانوالی کے اس دھوبی کی چوڑی چھاتی سے تنگ آ کر ہم نے خود ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ لکھنؤ کا دھوبی لگایا تھا کہ اس کے ناپ ہم سے ملتے تھے۔ لیکن ہم یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ بنیان پہلے ہی دھوب میں ۵۶ انچ کا ہو گیا۔ اور اس میں باسکٹ بال کی سی دو ٹوکریاں بھی بن گئیں۔ اگلی دھلائی پر وہ ایک لڈّو چاند سا بیٹا ہونے کی خوشی میں لایا۔ نومولود کا وزن ایک پنسیری بتاتا تھا جس کی تصدیق ہمارے بنیان سے بھی ہوتی تھی۔

باقی رہا دفتر، تو وہی کلرک جن کی ہم نے خوشامد کر کے کام سیکھا تھا، اب ہمیں پہلے تمیز سے 'سر!' کہتے پھر آنکھ مار کے ہماری جمع و تفریق کی غلطی نکالنے کی جسارت کرتے۔ جمعدار اجمل خاں اب ہمیں تم کہنے لگا۔ پہلے تُسی کہتا تھا۔ غرض کہ جیسا آپ نے ملاحظہ فرمایا ہماری قدر و قیمت اپنی نظروں میں کافی بڑھ چکی تھی۔ بعض لمحے ایسے بھی آنے لگے جب یوں محسوس ہوتا گویا ہم ہندو دیومالا کی وہ گائے ہیں جس کے سینگوں پر دُنیا ٹھیری ہوئی ہے۔ جب وہ تھکن سے جُھرجُھری لے کر سینگ بدلتی ہے تو بھونچال آ جاتا ہے۔ کراچی کی بڑی بڑی دعوتوں میں بھی ہم مدعو ہونے لگے۔ بڑی دعوتوں سے ہماری مُراد ایسی تقریبیں ہیں جن میں مہمانوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو اور جہاں مدعوئین کی فہرست ٹیلی فون ڈائرکٹری نقل کر کے مرتّب کی جاتی ہے۔ ان میں ہمیں، مع میزبان، کوئی نہیں پہچانتا تھا، سوائے تمبو قناتوں والے نظام دین کے آدمیوں کے جن سے روز روز کی ملاقات کے سبب خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

کاک ٹیل کے آداب

خُدا اور اس کے بندے ماریں یا چھوڑیں، جھوٹ نہیں بولیں گے۔ جب اینڈرسن سے یہ سُنا کہ یہاں شراب پینا فرائضِ منصبی میں داخل ہے تو ایک دفعہ تو عجب رُوحانی انشراح محسوس ہوا۔ دھیرے دھیرے پارٹی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابھی دو ہفتے پڑے تھے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) سے کاک ٹیل پارٹی کے آدابِ بے خودی کے بارے میں استصواب کیا تو انھوں نے کم و بیش وہی معلومات فراہم کیں جو شیخ سعدی کے زمانے میں بھی دستیاب تھیں۔ مثلاً یہ کہ شراب، شباب اور دولت ——— انھیں پاکر جو مست نہ ہو، وہی مرد ہے۔ عرض کیا، جن بچاروں کو یہ نعمتیں میّسر نہ ہوں ان کے مرد ہونے کا بھی کوئی چانس ہے کہ نہیں؟ بولے، کیوں نہیں۔ مرد باید کہ ہراساں نہ شود۔ ہراساں پر عرفی کا ایک شعر سنو۔

جو شعر انھوں نے سُنایا اس کا عُرفی سے ہی نہیں، ہراساں ہونے سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ شعر کا سرور بڑھا اور زبان کھُلی تو فرمایا کہ غالب نے مے کے مقابلے میں شہد کو مگس کی قے کہا ہے۔ شعر اور شراب دونوں ہی دافعِ حجاب ہیں۔ اور یہ نہ بھولو کہ تمھارے پیشے میں حجاب حرام ہے۔ کبھی تم نے غور کیا، شراب کو "ڈرنکس" کہا جائے تو کم حرام معلوم ہوتی ہے! اور ہاں! جب نظریں نظروں سے اور شرابیں شرابوں سے ملیں تو کاک ٹیل ہر جائی کے پیار کی مانند تند و تیز ہو جاتی ہے۔

"کیا لوگ شرابوں کا بھی 'دینِ الٰہی' بناتے ہیں؟" ہم نے ان کے ہیرو اکبرِ اعظم پر چوٹ کی۔

"اسی کو تو کاک ٹیل کہتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں آیا ہے کہ۔ ۔ ۔"

ان کی علمی اُڑان بڑھتی چلی گئی تو ہم نے 'بیلی لینڈنگ' کراتے ہوئے پوچھا "پروفیسر! کاک ٹیل پارٹی میں گلاس کون سے ہاتھ میں پکڑتے ہیں؟" بولے "آف کورس! دائیں ہاتھ میں۔" پوچھا "پھر مصافحہ کون سے ہاتھ سے کریں گے؟" ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا "اگر دوسرے نے بھی گلاس دائیں ہاتھ میں تھام رکھا ہو تو پھر بائیں ہاتھ ہی سے مصافحہ واجب ہے۔"

مرزا عبدالودود بیگ سے صلاح کی تو اس ابتدائی اعلان کے بعد کہ کاک ٹیل پارٹی ملک کی

مضبوط ترین پارٹی ہے، فرمایا "دو پریکٹیکل ٹپ دیتا ہوں۔ اوّل یہ کہ یہ شے کڑوی ہوتی ہے۔ منہ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ تمھارا تو سارا بچپن جوشاندے، کونین مکسچر، کیسٹر آئل، ٹنکچر آیوڈین اور چکرورتی کی ارتھمیٹک سے ہی شغل کرتے گزرا ہے۔ پھر کیا ڈرنا؟ ہائے! کیا خوب کہا ہے ظالم نے:

جو پینے والے ہیں وہ پی کے مُنہ بناتے ہیں

جناب شیخ جو ہیں، مُنہ بنا کے پیتے ہیں"

پوچھا "اور اگر ہم بالکل نہ پیئیں تو کس وقت منہ بنانا مناسب و مباح ہو گا؟"

"مگر یہ تو حضور والا کے چہرے کا نارمل ایکسپریشن ہے! خیر۔ دوسرا ٹپ میں نے رسالہ MEN ONLY میں دیکھا تھا۔ لکھا تھا کہ کاک ٹیل پارٹی میں کوئی بھی بیٹھ کر شراب نہیں پی سکتا۔ مکروہ ہو جاتی ہے"۔

پوچھا "کیوں؟"

پہلے تو چکرائے۔ پھر سنبھل کر بولے "ہاں! کاک ٹیل میں سب کھڑے ہو کر پیتے ہیں۔ تاکہ جب گر پڑیں تو اندازہ ہو جائے کہ اب اعتدال لازم ہے"۔

سیاہ چاول، رم اور مغرور گردن والی

جیسے جیسے ۲۷ تاریخ نزدیک آتی گئی، ہماری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ راہ راست سے بھٹکانے والا کوئی رہبر نہ ملا کہ ہماری دوڑ پاک بوہیمین کافی ہاؤس تک تھی۔ بالآخر نوابزادہ غفران اللہ خاں سے رجوع کیا جو کراچی کے ہر کلب کے ممبر تھے اور جن کے بغیر شہر کی کوئی کاک ٹیل پارٹی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ہر فقرے پر، خواہ اپنا ہو یا پرایا، بے ساختہ قہقہے لگانے کے سبب THE LAUGHING CAVALIER کہلاتے تھے۔ صورت بھی ہال کی اسی نام کی شہرہ آفاق پینٹنگ سے ملتی تھی۔ اینڈرسن کے ہم پیالہ تھے۔ ہم پر شفقت فرماتے تھے۔ باتوں میں وہ رس اور رچاؤ جو علم مجلسی، چھکی چھکائی جنسی آسودگی، میٹھے سبھاؤ اور پندرہ ہزار ایکڑ اراضی سے پیدا ہوتا ہے۔ شہر سے باہر اُن کا بہت بڑا باغ تھا جس میں بوگن ویلیا کی سو سے زیادہ قسمیں تھیں۔ ویسے

بڑے با اصول، انسان دوست اور جفاکش آدمی تھے۔ نانِ حلال اور آبِ حرام پر گزارہ تھا۔ بڑے لطف و مرحمت سے پیش آئے۔ جاپان سے منگائے ہوئے گلابوں کے تختوں کی سیر کروائی۔ وہ قطعہ بھی دکھایا جس پر انھوں نے سیاہ چاول کاشت کیے تھے۔ ہم نے پوچھا، یہ کوئی افریقی ورائٹی ہے؟ بولے، نہیں۔ جنوبی امریکہ گیا تھا تو دو چار مُٹھی بیج اوورکوٹ میں چھپا کر لے آیا۔ لندن سے HYDRANGEA پھُول کے بلب بھی اسی طرح اسمگل کیے تھے۔ مِشی گن میں بھی جنگلی چاول ہوتا ہے، مگر وہ بات کہاں۔ اس سال بیس سیر چاول نکلے۔ سات ہزار لاگت آئی۔ جاتے وقت $\frac{1}{2}$ پونڈ سوغات لے جانا نہ بھولنا۔ ہم نے پوچھا، انھیں کھاتے کیسے ہیں؟ فرمایا، سیاہ چاول تو مغرور گردن والی میلرڈ (مرغابی) اور گلابی رم کے ساتھ مزہ دیتے ہیں۔ دسمبر میں یاد دلانا۔ ان کا بھی بندوبست کردوں گا۔ اسکندر مرزا بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ عرض کیا، حاجت روائی ہی مقصود ہے تواب کی مہاوٹ حضور صرف مغرور گردن والی کا بندوبست فرمادیں۔ اور نسخہ کے بقیہ مقویات کسی اور حقدار کو پہنچادیں۔ کہنے لگے، پہنچانے کی بھی ایک ہی کہی۔ تمھارا خیال ہے کہ چوہے دان خود چل کر چوہے کے پاس جاتا ہے؟ ہاں! تحلیلِ غذا کے لیے تمھیں آدھ گھنٹے ڈارو تھی (ان کی سیکرٹری) کے ساتھ ڈانس کروادوں گا۔ اگلے تیرے بھاگ کھلتے۔ اسی کی RECIPE سے ایک نئی ڈِش بھی کھلاؤں گا جو فرانس میں انگور کی بیل کی سُوکھی ڈنڈیوں کی نیشِلی آنچ پر پکائی جاتی ہے۔ اس پر شیری کا چھینٹا دیتے ہیں۔

بعد ازاں اپنی زمین دوز بار میں لے گئے۔ چار پانچ بٹن دبائے تو رنگ برنگی روشنیوں سے ان کے چہرے پر وہ دلآویز نرمی اور شادابی نظر آنے لگی جو دِھیمے پیسٹل رنگوں میں ہوتی ہے۔ ایک کونے میں نیگرو عورت کا لائف سائز برہنہ مجسمہ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شب تاب تسبیح تھی اور دوسرے میں انسانی کھوپڑی کا پیالہ۔ عورت کا جُوڑا اُٹھا کر دو پیگ ڈال دیں تو دوسری طرف غذائی غدُودوں سے وہسکی رِسنے لگتی۔ ایک مُمتا بھری نپل پر لپ اسٹک کا تازہ نشان اور دوسری سے سِگار کی مہک آرہی تھی۔ گلے میں ایک بِب بندھا تھا جس پر مردانگی و شجاعت کے دیوتا ہرکولیز کی تصویر کڑھی تھی۔ بائیں جانب طاقچے میں گوتھک طرز کی ایک خانقاہ بنی ہوئی تھی اور اس کے

اُدھ کھُلے دروازے پر سیمول جانسن کے یہ اشعار آبدار کندہ تھے جنھیں ہم شراب نوشی کی تبلیغ کے لیے نہیں، بلکہ محض اس غرض سے نقل کر رہے ہیں کہ یہ اس داستان کے مرکزی کردار اینڈرسن کا فلسفہ حیات تھا جس کی وہ تلقین کرتے رہتے تھے۔ یہ تھا وہ یونانی فلسفہ جو اسکاٹ لینڈ کی شراب کی بھٹیوں سے گزر کر ہم تک پہنچا تھا:

Hermit hoar, in solemn cell,
Wearing out life's evening gray;
Smite thy bosom, Sage, and tell
What is bliss, and which the way?

Thus I spoke; and speaking sigh'd;
Scarce repress'd the starting tear,
When the hoary Sage reply'd, ★
Come, my lad, and drink some beer.

انھوں نے اپنا "ڈیپ فریز" بھی دکھایا، جس میں انواع و اقسام کی شرابیں نہ جانے کب سے برف میں لگی منتظر تھیں کہ کوئی تشنہ کام ان سے جگر کی آگ بجھائے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، ڈیپ فریز کی لمبائی چوڑائی ہمارے کمرے کے برابر ہو گی جو گرمیوں میں ایسا تنور ہو جاتا تھا کہ کبھی کبھی ہم کچی صراحی سے گال لگا کر آنکھیں بند کر لیتے یہاں تک کہ وہ جل اٹھتی۔ کہنے لگے کہ میں اُن نو دولتیوں کی طرح نہیں ہوں جو ہر تیسرے مہینے یورپ جاتے ہیں اور سارا زرمبادلہ اور بچی کھچی جوانی نئی کاروں اور سیکنڈ ہینڈ کال گرلز پر خرچ کر دیتے ہیں۔ میں تو ہر ملک کی نایاب WINES کے سوا، کوئی چیز لانا لحم الخنزیر کے برابر سمجھتا ہوں۔ یہ ڈیپ فریز لانے کا گنہ گار ضرور ہوں۔ سو وہ بھی انھی کو قرینے سے رکھنے کے لیے۔

★ اے ضعیف العمر راہب! تو اس تنگ و تاریک حجرے میں اپنی زندگی کی بھگی شام کاٹ رہا ہے۔ بابا! تو کہ دانائے راز ہے، اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کے بتا کہ حقیقی مسرت کیا ہے اور اس کا راستہ کونسا ہے؟" میں نے یہ کہا اور آہیں بھر بھر کے کہا۔ میں اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک ہی رہا تھا کہ وہ بڈھا پھونس راہب بولا:

"بیٹا! میرے ساتھ آؤ اور تھوڑی سی بیئر پیو۔"

ہم سا کہیں جسے

ایسی خوب صورت، سُبک سُبک بوتلیں، بلوّری صراحیاں، رنگا رنگ کنٹر، شیشے اور بویام ہم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ تین چار سو سے کم نہ ہوں گے۔ ہماری نگاہوں کو ان پر آوارہ ہوتے دیکھ کر کہنے لگے کہ ان میں سے چار پانچ پسند کرلو۔ خالی ہوتے ہی گھر بھجوا دوں گا۔ ایک میں منی پلانٹ لگا کر نیک شگون کے لیے برآمدے میں لٹکا دینا۔ دوسری کا ٹیبل لیمپ بنوا کر، اسی کی مُدھر روشنی میں معاشیات کی کتابیں پڑھتے رہنا۔ ہم نے کہا پیرو مرشد! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نشّہ نشّہ ہوتا ہے۔ دیس دیس کے لیبل سے کیا فرق پڑتا ہے؟ قہقہے کے بعد ارشاد ہوا، برخوردار! گھونسے، چُٹکی، چھری، گنڈاسے اور بندوق کی چوٹ ایک جیسی نہیں ہوا کرتی۔ ہر ملک کے پھول، ہر دیس کی ناری کی بُوباس جُدا ہوتی ہے۔ وہسکی بہت حسّاس، بڑی تنک مزاج ہوتی ہے۔ سندھ کلب میں کبھی کسی نمازی بیرے کا ہاتھ لگ جائے تو بخدا سارا پیگ غارت ہو جاتا ہے! نشّہ بڑی نازک شے ہے۔ یہ نازک سا فرق تمھاری سمجھ میں آ گیا ہوتا تو آج تمھارے شانے شمپین باٹل کی طرح ڈھلکے ہوئے نہ ہوتے۔ پھر اس نازک سے فرق کو ذہن نشین کرانے کے لیے انھوں نے ہمیں شمپین کی بوتل نکال کر دکھائی۔ ہمیں اس بچاری پر بڑا ترس آیا۔

شراب، پھولوں اور کتّوں کا کولمبس

پوچھا "اس کنٹر میں کیا ہے؟" بولے "روسی ووڈکا۔ ایک گھونٹ لیتے ہی آدمی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ کس نے گھونسا مارا۔ ایک ہی چلّو میں اُلّو!" پوچھا "اور اس عطردان میں کیا بھرا ہے؟" فرمایا "پگھلا ہوا زمرّد۔ فرانس کی سبز کانیاک۔ ڈنر کے بعد کی چیز ہے۔ اس کے برابر آبِ حیات کُھلا ہے ــــــ چیکوسلوواکیہ کی سونف کی وائن" دریافت کیا "اور اس بلوریں مُگدر میں؟" بولے "یہ ایک افریقی وائن ہے۔ مردوں کا ڈِرنک سچ پوچھو تو بس یہی ہے۔ ایک چُسکی لیتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ، بقول شخصے، گلے سے مشعل بردار مظاہرین کا جلوس گزر رہا ہے۔" سوال کیا "اور یہ بیل کو سانی کھلانے

کی ناند میں کیا پڑا چھلک رہا ہے؟ اور اس میں ڈونگا کیوں ڈال رکھا ہے؟" ارشاد فرمایا "اوہ! یہ پُنچ ہے۔ ایک دوست کے ہاں ہاؤس وارمنگ پارٹی ہے۔ اسے پہنچنی ہے۔ اسی طرح ناند میں بھر کر لان پر رکھ دی جاتی ہے۔" عرض کیا یہ تو غالبؔ کے زمانے میں بھی ہوتا تھا:

'صحن چمن میں رکھ دیں مئے مشکبو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند' "

فرمایا "چار مصرعوں کی رُباعی کو تو ہندی میں چوپائی کہتے ہیں۔ آپ نے تو صحن چمن میں تپائی رکھ دی۔ میرے والد کی عادت تھی کہ کبھی کوئی بُری خبر سُنتے، یا کھڑی فصل کو پالا مار جاتا، یا خاندان میں غمی ہو جاتی تو شعر پڑھا کرتے تھے۔ آپ تو خوش ہوتے ہیں تب بھی شعر پڑھتے ہیں!" پھر پوچھا "اور یہ کیا بلا ہے جو رنگت اور بُو سے مست نچّر کا قارُورہ معلوم ہوتا ہے؟"

کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ! یہ تو دنیا کی بہترین بیئر، میونخ بیئر ہے۔ نازی انقلاب کی بنیاد بیئر خانوں ہی میں رکھی گئی تھی۔"

اُردو زبان کی تہی دامنی کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہمارے ہاں ہر تیز پانی کے لیے صرف ایک گالی ہے —— شراب! اسی طرح کتّے کی اُردو میں لے دے کے دو قسمیں ہیں۔ دوسری کو برادر خورد کہتے ہیں۔ اور آپ کو حیرت ہوگی، فارسی میں تو گلاب تک کے لیے کوئی علیحدہ لفظ نہیں۔ دیکھا جائے تو انگریز نے ہمیں —— پورے برصغیر کو —— کتّوں، پھُولوں اور شراب کی مختلف اقسام اور نفاستوں سے روشناس کیا۔"

ہم نے گرہ لگائی۔ "ورنہ یہاں کیا دھرا تھا۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا"

فرمایا "آپ غلط پڑھ رہے ہیں۔ مویشی چرانے پہ عرب میں جھگڑا ہوتا تھا۔ اپنے ہاں چُرانے پہ ہوتا ہے۔"

کاک ٹیل گائیڈ

لیجیے، دو ڈھائی گھنٹے کے سوال و جواب سے مکمل "رہنمائے کاک ٹیل پارٹی" ــــــ پہلے پیگ سے صبح کے HANG-OVER (خمار) تک ــــــ تالیف ہوگئی۔ خلاصۂ خرافات و خمریات نوآموزوں کی عاقبت سنوارنے کے لیے حاضر ہے: ــــــ

۱۔ پہلا اصُول تو انھوں نے یہ بتایا کہ جب تک کوئی مشترک شناسا تعارف نہ کرائے، کِسی سے بات نہ کرو۔ انگریز تو جب تک باقاعدہ انٹروڈکشن نہ ہو، کسی کی گالی کا بھی جواب نہیں دیتا۔

۲۔ ایک ہی جگہ اتنی زیادہ دیر جم کر کھڑے نہ ہو کہ جملہ پورا ہو جائے۔ سرکُولیٹ (گردش) کرتے رہو۔

۳۔ جو تم سے رتبے میں چھوٹا یا بے فیض ہو، یا آگے چل کر کام نہ آسکے، اس کی صحبت سے گریز کرو لیکن جو تمھارا نوٹس نہ لے، تم بھی اس کا نوٹس نہ لو۔

۴۔ سنجیدہ گفتگو سے پرہیز کرو۔ ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ تم ابھی سے TIPSY (بہکے بہکے) ہو گئے ہو۔

۵۔ اگر ٹماٹر کی گاد یا نمبو پانی پر توکّل کرتے ہو تو کسی سے یہ ہرگز نہ کہو کہ شرعی ممانعت کے سبب نہیں پی رہے ہو، یا PRACTISING MUSLIM ہو۔ خونی پیچش کا بہانہ بنادو۔

۶۔ اگر مذکورہ بالا الابلا یعنی سافٹ ڈرنک پی رہے ہو، تب بھی لیڈیز سے بہکی بہکی باتیں کرو۔

کاک ٹیل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مردوں کو بدتمیزی کرنے کا ایک معقول بہانہ مِل جاتا ہے۔ عورت اگر خوب صورت ہے تو فلرٹیشن اس کا حق ہے۔ اور اگر بدصورت ہے تو اس کے ساتھ حتی الایمان فلرٹ کرنا آدمی کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔ تم بہت کم سخن، کم آمیز ہو۔ بند بند سے رہتے ہو۔ مَیں نے آج بھی کی پارٹی میں دیکھا کہ خواتین سے تعارف کے وقت تم اپنی نظر، نیّت اور نیک ٹائی ہی درست کرتے رہ گئے۔

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

بچّہ! ایسے سمے تو پلک جھپکانا بھی رُوپ کا اپمان ہے۔

۷۔ کاک ٹیل پارٹی میں ہر ایک سے اعتماد کے ساتھ، جم کے بات کرو۔ دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بلکہ نکال کے۔ وہسکی کے ہر گھونٹ کے بعد اپنی بات کا وزن بڑھتا ہوا صاف محسوس ہوتا ہے۔ عرض کیا، پیرو مرشد! یہ کیفیت تو 'لبریم' کی گولی سے بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ فرمایا، بڑا فرق ہے۔ اُستاد ذوقؔ نے کیا خُوب کہا ہے۔ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارُو ہے جس سے ذوقؔ
نامرد مرد، مرد جواں مرد، ہوگیا

لبریم کے بعد بلّی کو چوہوں کی حاجت نہیں رہتی۔ پھر اسے خواب میں چھیچھڑے نظر نہیں آتے، بتے نظر آتے ہیں۔ لیکن شراب پی کر چوہے کی مونچھیں اتنی اکڑ جاتی ہیں کہ اپنے بل میں داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ بلّی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے کہ کدھر گئی وہ مُردار؟

۸۔ جب ہر بات FUNNY اور ہر چہرہ حسین دکھائی دینے لگے تو فوراً کوئی ترش چیز کھالو۔ یہ دستیاب نہ ہو تو اپنی بیوی کی تصویر بٹوے میں سے نکال کر ایک نظر دیکھ لو۔

۹۔ ڈِھیلے کالر کی قمیض پہن کر جاؤ۔ نشہ میں کوئی گر پڑے تو بھُول کر بھی اس کی نیند میں مخل نہ ہو۔ انگلینڈ میں اس صدی کے اوائل میں، جسے ایڈورڈین دور کہا جاتا ہے، اونچے کلبوں میں چھوٹے چھوٹے چھوکرے صرف اس کام پر تعینات ہوتے تھے کہ جیسے ہی کوئی معزز ممبر کرسی سے لُڑھک کر گرے، وہ میز کے نیچے گھُس کر کالر ڈِھیلا کر دیں تاکہ دم گھُٹنے سے کلب میں موت واقع نہ ہو۔

۱۰۔ واپسی میں اپنا سارا وزن کار کے بریک پر ڈالے رکھو۔ بجلی کے کھمبے سے کار روکنے سے گریز کرو۔ کھمبے گِر جائیں تو کتّوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

۱۱۔ نشہ گہرا ہوجائے تو طبیعت سچ بولنے پر بے تحاشا مائل ہوتی ہے۔ لہٰذا گھر پہنچ کر بیوی سے بات چیت کرنے سے پرہیز کرو۔

۱۲۔ صبح آنکھ کھلتے ہی محسوس ہونے لگے کہ معاشرے میں اندھیر مچا ہوا ہے اور حکومت اپنی

پالیسی سے قوم کو تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہے تو ایک اسپرین کھالو۔ دس منٹ کے اندر اندر حکومت کی پالیسی میں افاقہ محسوس ہوگا۔

رُوٹھی دھرتی

انھوں نے موسم کی ترکاریاں اور پھل ہمارے ساتھ کیے۔ اور جیپ میں بٹھا کر اپنے باغ اور فارم کی سیر کرائی۔ کہنے لگے، دس گھنٹے روزانہ کام کرتا ہوں۔ میرا باپ زمیندار تھا۔ مجھے بھی کھیتی باڑی سے لگاؤ ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ پارٹی سے رات کو ڈھائی تین بجے لوٹتا ہوں۔ مگر صبح ساڑھے چار بجے اپنے وقت پر اُٹھ جاتا ہوں۔ گنہ گار ہوں۔ (وہ آبدیدہ ہو گئے) فجر کے بعد دو گھنٹے کھیتوں میں ضرور گزارتا ہوں۔ عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ پَو پھٹنے سے پہلے ہر تیسرے منٹ مطلع اور منظر کا مُوڈ آنکھوں کے سامنے بدلتا نظر آتا ہے۔ اُجالے کی ہر لہر کے ساتھ چڑیوں کی چہکار کی لَے بھی بدلتی جاتی ہے۔ پھر ایک ایک پھُول سے باتیں ہوتی ہیں۔ سب سے اپنی یاری ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی پھُول ڈالی سے نہیں توڑا۔ گیہوں کی سنہری بالیں دیکھتے ہی جھُومنے لگتی ہیں۔ کبھی کوئی بُوٹا اُداس، ماندہ دکھائی دے تو دن بھر خلش سی رہتی ہے۔ زندگی کو سمجھنا چاہو تو کوئی درخت، کوئی پودا، کوئی پھول —— ایک ہی سہی —— کیکٹس ہی کیوں نہ ہو —— لگا کر دیکھو تو سہی۔ زمین کسان سے، اپنے چاہنے والے سے، بار بار بے وفائی کرتی ہے۔ وہ پھر اس پہ اعتبار کرتا ہے۔ دھوکے پہ دھوکا کھاتا ہے۔ پھر بھی پیار کیے چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ پیار کے لائق نہیں رہتا تو گاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ شہر آکر اپنا تھکا ہارا بنجر کسی ہل کے سپرد کر دیتا ہے۔ شہر میں پھر اسے جیتے جی زمین اپنی صورت نہیں دکھاتی۔ دری، چٹائی، سنگِ مرمر، سیمنٹ، ٹائلز کے فرش اور تارکول تلے اپنا مُنھ چھپائے رہتی ہے۔

باٹل سے ڈبنے والے اے آسماں نہیں ہم

ایک دوست نے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ دی جس کا سائی لین سَر پھٹا ہوا تھا۔ اس کے

اُدھماکوں سے اپنی سلامی آپ دیتے اور لیتے ہوئے، ہم پارٹی میں پہنچے تو آٹھ بج رہے تھے۔ اس وقت کاک ٹیل پارٹی اپنے شباب پر تھی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کے نصف حصّے میں تو شباب بھی شباب پر تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رنگ پہ آنے کے بعد کاک ٹیل میں اتنی تاخیر سے شریک ہونا ایسا ہی ہے جیسے تیز چلتے ہوئے MERRY-GO-ROUND (پھرکی کی طرح گھومنے والا جھولا) میں بیٹھنے کی کوشش کرنا۔ لان پر بڑے جگ مگ تھے۔ درختوں اور جھاڑیوں میں اُودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے قمقمے انہی رنگوں کے پیرہنوں کو آنکھ مار رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بیشتر مہمان نہ صرف آچکے ہیں بلکہ بعضے تو اس قابل بھی نہیں رہے کہ واپس جاسکیں۔ بات بے بات ہنسی کہ ان موئے کو پیار آئے۔ آنکھیں گلابی۔ پنڈے گرم۔ چہرے گلنار۔

دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

لان کے پرلے کنارے پر بیرے، مغل بادشاہوں کی یونیفارم، مع راجپوتی پگڑی پہنے ڈرنکس بنا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بیرا نظر بچا کر چیکوسلوواکیہ کے بنے ہوئے گلاسوں کو مُنھ کی بھاپ سے نم کر کے پیمانہ تابدار کو اور بھی تابدار کر دیتا تھا۔ کافی مہمان ایسے تھے جو کسی کاک ٹیل سے آرہے تھے یا کسی اور کاک ٹیل میں جانے والے تھے۔ ہم اصول نمبر ۳ پر سختی سے کاربند تھے کہ جو شخص اپنے سے کم مرتبہ نظر آئے یا آگے چل کر کام نہ آسکے، اس کا نوٹس نہ لو۔ کچھ دیر بعد یکایک منکشف ہوا کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ کوئی ہمارا نوٹس نہیں لے رہا ہے! چاروں طرف نظر دوڑائی، ہمیں کوئی اپنے سے کم حیثیت نظر نہ آیا۔ سُن ہو گئے۔ اب جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑے بڑے لوگ ہمیں "اِگنور" کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ کنارہ کش ہوتے ہوتے ہم نے خود کو ایک کونے میں چینی نارنگی کی جھاڑی کے پاس استادہ کر لیا۔ اور نمکین بادام اور خلال کے تنکوں میں اٹکی ہوئی مرغی کی کلیجی سے شغل کرنے لگے۔

ترکِ مے

اس سے پہلے ہم کسی کاک ٹیل میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ سُنا ہی سُنا تھا۔ چنانچہ

بے حد سراسیمہ و ششدر۔ ایک INHIBITION ہو تو بیان کریں۔ ہمارے ساتھ کے اکثر لوگ کبھی کے گھس گھسا کر ندّی کی چکنی بٹیا★ ہو گئے تھے۔ لیکن ہم ہنوز اس درجہ دقیانوسی اور ناتراشیدہ تھے کہ ڈرنکس کا ترجمہ شراب اور غم غلط کرنے والوں کو شرابی کہتے تھے۔ انہی ایام حیرت کی بات ہے، ہم نے مرزا سے کہا کہ شراب اسلام میں حرام ہے۔ پھر کیا وجہ کہ جتنا ذکر، جتنے قصیدے شراب کے اردو اور فارسی شاعری میں ہیں، اتنے دنیا کی تمام زبانوں کو ملا کر نہیں نکلیں گے!

فرمایا "چودہ سو سال سے طاقِ عصیاں پہ رکھے رکھے، اس کا نشہ صدی بہ صدی تیز تر ہوتا چلا گیا۔"

بعدازاں تشریح فرمائی کہ مغل بادشاہوں نے کبھی اس گناہ کو تعزیری جرم قرار نہیں دیا۔ اگر ایسا کرتے تو بیشتر تاجداروں کی زندگی زنداں میں ہی کٹتی۔ تخت پر کون بیٹھتا؟ فیض کے اسباب ——— پُل، چاہ، مسجد اور بھینسوں کے غسل خانے یعنی تالاب کون بنواتا؟ لیکن مستثنیات کہاں نہیں۔ جناب محمد باقر شمس، مصنف تاریخ لکھنؤ، مرزا یحییٰ آصف الدولہ وزیر الممالک رستم جنگ کے پاس شریعت اور دینداری کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "دیندار بھی بہت تھے۔ پہلے شراب پیتے تھے۔ غفران مآب کے موعظے سے متاثر ہو کر توبہ کی اور بھنگ پینا شروع کی۔ اُنھوں نے بھنگ کی حُرمت بھی بیان کی اور اس کو بھی ترک کر کے افیون پر اکتفا کر لی۔" ہم تاریخ داں تو نہیں، لیکن ہماری چھٹی حس کہتی ہے کہ مرزا یحییٰ آصف الدولہ نے اس مرحلہ پر غفران مآب کی صحبت کو بھی ترک کر دیا ہو گا۔

للی پت کے دیو

سوا آٹھ بجے ہمارے پیرِ مغاں ہنستے کھلکھلاتے وارد ہوئے اور ہماری جان میں جان آئی۔ انھوں نے خواتین و حضرات سے ہمارا تعارف کرانا شروع کیا۔ اور ہم نے "سرکولیٹ" کرنے کی

★ بٹیا: ندی کا چکنا گھسا گھسایا پتھر

کوشش کی۔ لیکن ہر مرتبہ کھوٹے سکّے کی طرح واپس کر دیئے گئے۔ ایک صاحب نے تو ہم سے صرف دو انگلیوں سے مصافحہ کیا۔ سَو سوا سو مردانِ خوش اوقات کی اس محفل میں ہمیں ایک بھی ایسا نظر نہ آیا جس کی آمدنی ہم سے کم ہو۔ جدھر نگاہ اٹھائی، جہاں گئے، وہی ایک منظر ——— مایا کو مایا اور رُوپ کو روپیہ ملے کر کر لمبے ہاتھ۔ اس لنکا میں سبھی باؤن گزے تھے۔ اور یہاں یہ حال کہ فضیلت، نہ عزّت نہ فرمانروائی۔ ہر دیو سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم نے اپنا قد ایک اِنچ کم ہوتا محسوس کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک ہم لان پر رینگنے لگے۔

ہم نے مرشد سے جا کر پوچھا، حضرت! آپ نے تو ہدایت فرمائی تھی کہ خلوئے معدہ وہسکی نہیں پینی چاہیے۔ آپ نے دو پیگ ہماری آنکھوں کے سامنے نوش فرمائے اور مُرغ کی کلیجی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ فرمایا تمہاری نظر ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ہاتھ نہ لگانے کی وجہ یہ کہ انگریزوں کے بیرے مُرغی ذبح کرتے وقت ٹھیک سے کلمہ نہیں پڑھتے۔ ایسا گوشت مکروہ ہوتا ہے۔ ممانعت آئی ہے۔

یکے بعد دیگرے ٹماٹو جُوس کے چار گلاسوں کے بعد ہماری زندگی کا واحد نصب العین یہ رہ گیا کہ، بلا منّتِ بیرے، ٹائلٹ کا نزدیک ترین راستہ دریافت کر لیں۔ (کاک ٹیل میں بیروں، بوڑھوں اور اپنی بیوی سے بات کرنے سے ہمیں سختی سے منع کر دیا گیا تھا) اتنے میں ایک قنات کے پیچھے سے ایک بوڑھے انگریز کو ایک ہاتھ سے اپنا سر اور دوسرے سے پتلون تھامے آتے دیکھا تو جن تاریک راہوں سے وہ نکلا تھا، اسی طرف ہم ایسے ہولے ہولے قدموں سے روانہ ہوئے کہ پیٹ کا پانی نہ ہلنے پائے۔ جان نکلی جا رہی تھی۔ خیر اس کا تو غم نہیں۔ خدشہ تھا جان نکلنے سے پہلے کچھ اور نہ نکل جائے۔ پچاس ساٹھ محتاط قدموں کے بعد، گویا کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے، ہم نے اپنی منزل مقصود کو جا لیا۔ باوردی بیروں کی قطار ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے رنگین تولیے لیے کھڑی تھی۔ ایک نستعلیق سے باریش بیرے نے بڑھ کر پوچھا:

"حضور قے فرمائیں گے یا چھوٹا حاجت؟"

نیوٹن جونیئر

راستے میں میکفرن مِل گیا۔ کہنے لگا کیا بات ہے؟ ابھی ابھی کچھوے کی طرح گئے اور لائیڈز بینک کے گھوڑے★ کی طرح کُدکڑے لگاتے واپس آئے! تم اتنی دیر تک بجلی کے کھمبے کی طرح تن تنہا کھڑے رہے۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ آؤ! تمھیں ایک امریکن شُعلہ بدن سے ملواؤں۔ ڈپلومیٹک کور کی پارٹیوں کی جان ہے۔ پاک امریکی دوستی کی حامی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خیرسگالی کا مظاہرہ گھر پر ڈھیلی گرہ کا لاچا باندھ کر کرتی ہے۔ ذرا دیر باتیں سنو گے تو گرویدہ ہو جاؤ گے۔ کِس طرح کی لذّت ہے تو چکھ دیکھ مرے یار!

میکفرن بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ سب سے بڑی خوُبی تو یہ کہ اس بھری محفل میں وہ تنہا یورپین تھا جس سے ہماری شناسائی ہی نہیں، بے تکلّفی بھی تھی۔ دوسری خوُبی یہ کہ وہ کسی کو اُداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہنس مُکھ، بذلہ سنج، حاضر جواب۔ ان دِنوں اس نے نیوٹن کی کششِ ثقل کی تھیوری میں ایک انقلاب آفریں ترمیم کی تھی۔ معاشیات اور کم لباسی پر ان کے فرمُودات محفل کو گھنٹوں گرم رکھنے کے لیے کافی تھے۔ ان کی تھیوری یہ تھی کہ ۱۹۵۲ء کے بعد سے زمین کی کشش ہر چیز کو نیچے کھینچتی ہے، سوائے قیمتوں، پاکستانی بیوروکریٹ کے سَر اور ماڈرن BRA کے مشمولات کے جو فی زمانہ صرف آسمان کی کشش کے تابع ہیں۔ اس فلکیاتی دریافت کی بنا پر یہ کلب میں نیوٹن جُونیئر کہلاتے تھے۔ ہمیں اُداس اور بے آسرا جان کر عزیز رکھتے اور اکثر اپنی چُلبلی گفتگو سے ہماری سوئی ہوئی بلکہ خرّاٹے لیتی ہوئی اُمنگوں کو بیدار کرتے۔ اِس وقت ہمیں للچانے لگے کہ اسے ایک نظر دیکھو گے تو دل ہی نہیں، تمھاری گھڑی کی دھڑکن بھی تیز ہو جائے گی۔

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

نیوٹن جُونیئر نے اس لذّت چشیدہ کے بارے میں جو معلومات اپنا مُنھ ہمارے کان سے لگا

★ لائیڈز بینک کا نشان:

کر ذاہم کہیں، ہم نے اس لذیذہ کو ان سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ مردوں میں ستر بے مہار پھر رہی تھی۔ میکفرسن نے یہ مژدہ بھی سُنایا کہ شاید طلاق ہو جائے۔ موٹی اسامی کی گھات میں ہے۔ جلتے ہوئے مکان کو کرائے پر اٹھانا چاہتی ہے! وہ اس وقت ایک تنکے میں پرویا ہوا کھٹا زیتون کھا رہی تھی۔ ہاتھ ملایا تو محسوس ہوا گویا اسے ۱۰۵ ڈگری بخار ہے۔ باتوں میں بھی سرسامی کیفیت سمندری نیلے رنگ کے چُست لباس پر سے نگاہیں اور چُست فقرے پھسل رہے تھے۔ واشگاف V نیک لائن نے سمندر جھاگ کھاٹی میں ایسی آدمی ڈبا ؤڈبکی لگائی تھی کہ، جو تیرنے والا شرمندہ اور ڈوبنے والا ناز کرے۔ پیٹھ بھی انگریزی کے U کی طرح تا حدِّ ادب کھُلی ہوئی۔ لیکن ہمارے لیے ان سب سے زیادہ یہ دلکشی کہ اس کا شوہر ایک امریکن کمپنی کا مینجر تھا اور اس کے اکاؤنٹ سے ہمارے دِن پھر سکتے تھے۔ دُگنا تگنا سالانہ انکریمنٹ مل سکتا تھا جس سے ہم نئی عینک بنوا سکتے تھے۔ قالین خرید سکتے تھے۔

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

یوروپین بی بیبیوں کے بارے میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ کچھ بھی پہن لیں، بھلی لگتی ہیں۔ کچھ بھی نہ پہنیں تو یہ کچھ ہٹ ہو جاتی ہے۔ مگر سارا الزام جدید یوروپین فیشن پر رکھنا صریحاً ناانصافی ہوگی۔ یونہی ہوتا آیا ہے۔ سو سال پہلے اسی طور نظیر اکبر آبادی اس زمانے کی کتر بیونت اور اپنے دوطرفہ ردِّ عمل کا اظہار فرما گئے ہیں:

آگا بھی کھُل رہا ہے، پیچھا بھی کھُل رہا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے

اسی سے مِلتا جُلتا نقشہ نواب درگاہ علی خاں نے دِلّی کی نامی گرامی طوائف امر بیگم کا اپنی فارسی تواریخ میں کھینچا ہے جس کا اُردو ترجمہ "نادرشاہی قتل عام کی دہلی" حضرت خواجہ حسن نظامی نے کیا ہے۔ فرماتے ہیں "اس کا کمال یہ ہے کہ یہ حسین اور طوائف ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر ننگی رہتی ہے اور مجلسوں میں بالکل برہنہ آتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جسم کے اسفل حصّہ کو بالکل عُریاں کر کے اس پر

پاجامے کی نقاشی کرواتی ہے۔ کمخواب کے تھان کی طرح اور بوٹے دار پائجامے کی مانند اس کے زیریں جسم پر پائجامے کی تصویر بنی ہوتی ہے جو بالکل پائجامہ معلوم ہوتی ہے۔ جب امر بیگم امیروں کی مجلسوں میں عُریاں پائجامہ پہنے ہوئے آتی ہے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ننگی ہے۔ اس راز کو اس کے مخصوص آشنا ہی جانتے ہیں۔ امر بیگم بہت محبوب خلائق ہے۔" خیر امر بیگم کے محبوب خلائق ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے، مگر اگلے وقتوں کے بزرگوں کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ہر بات میں ثواب کا پہلو نکال لیتے تھے۔ چنانچہ سلیس و لذیذ اردو میں ترجمہ کے بعد حضرت خواجہ حسن نظامی نے کہ دِلّی کے روڑے اور شیدائی تھے صرف یہ حاشیہ لگایا ہے کہ "اس سے دہلی کی مصوّری کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔" ہائے ہائے! نہ ہوئی امر بیگم۔ سُن لیتی تو پاجامہ پیٹ کے رہ جاتی۔

ڈرافٹ بیئر سے اوور ڈرافٹ تک

دیکھئے بات کاک ٹیل سے خواجہ حسن نظامی تک پہنچ گئی۔ کسی پری وش یا گداز ڈپازٹ کا ذکر آجائے تو ہمارا خامہ ہذیاں تحریر اسی طرح مائل بہ گمراہی ہوتا ہے۔ تعارف کے بعد وہ بی بی کہنے لگی "تمہارا ہاتھ خالی کیوں ہے؟ مَیں تو بلیک لیبل پیتی ہوں۔ وہسکی دس سال سے کم کی ہو تو مَیں دوسرے دن چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔ یہ بات نہیں کہ مَیں ڈرنکس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ مَیں تو بائی گاڈ اپنی ناک کی خاطر پیتی ہوں۔ سوفی صد پروف وہسکی سے سارے SINUSES کھل جاتے ہیں۔ تم بھی ناک میں بول رہے ہو۔ ایک چُسکی میرے گلاس میں سے لگا کر دیکھو۔ خود کو سچ مچ کا مرد محسوس کرنے لگو گے۔ میرا میاں تو وہائٹ ہارس پیتا ہے۔ اور ہاں! تمہارے ہاں مرد دو گھوڑا بوسکی کیوں پہنتے ہیں؟ SO EFFEMINATE! میرے میاں پر گہری نیلی اُداسی کا دورہ پڑتا ہے تو چینی کھانا کھاتا ہے اور چھ مہینے برف میں لگی ہوئی ڈرافٹ بیئر کے مگ پہ مگ چڑھاتا ہے۔ اور باتھ روم کے چکر پہ چکر کاٹتا ہے۔ ہاہا! مگر تم اتنے فکر مند کیوں نظر آ رہے ہو؟ زندگی مختصر ہے۔"

ہوا دراصل یہ کہ ڈرافٹ بیئر پر ہمیں یکلخت اوور ڈرافٹ یاد آ گیا۔ موقع غنیمت جان کر ہم نے

روایتی پچّر کا پتلا سِرا ٹھونک ہی دیا۔" آپ کے شوہر کی کمپنی کا اکاؤنٹ کہاں ہے؟"

"بینک میں۔ آف کورس!"

کس لیے آئے تھے ہم، کیا کر چلے

پھر چڑھی ہوئی آنکھیں اور چڑھا کر بولی "ہاں! خوب یاد آیا۔ تم تو بینکر ہو، نا؟ تمھارے ADENOIDS بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مُنھ کھول کر بات سُنتے ہو۔ تو سنو، میں نے رمی میں ایک لاکھ پینسٹھ ہزار روپے جیتے ہیں۔ میرا میاں دورے پر جاتا ہے تو ایک جائنٹ سیکرٹری اور دو سیٹھ میرے ساتھ رمی کھیلنے آجاتے ہیں۔ شاید انھیں میرے میاں کی کمپنی کی ایجنسیاں چاہیئیں۔ جم، میرا میاں، مارچ میں بیروت گیا تو V.D. لگا لایا۔ ہفتوں چھدرا چھدرا چلتا رہا۔ جیسے تمھارے ہاں قیدی بیڑی پہن کر ZIG-ZAG کرتے ہیں۔ مجھ سے چھُپایا۔ وہ تو ڈاکٹر بٹر فیلڈ نے مجھے بتا دیا۔ مگر اس بدذات کا خیال ہے کہ جم کو یہ انفکشن مجھی سے لگا۔ ہا ہا ہا! ابدی مثلّث! متعدی مثلّث! اچھا تمھارے تو اسٹیٹ بینک کے بدذاتوں سے مراسم ہوں گے۔ میرے یہ ایک لاکھ پینسٹھ ہزار شکا گو بھجوا دو۔ پلیز! کہہ دینا کہ میری سیونگ ہے۔ صبح دس سے پہلے گھر فون مت کرنا۔ جم دس بجے دفتر جاتا ہے۔"

ہم "سرکیولیٹ" ہونے کی غرض سے بادلِ نخواستہ اس سے جُدا ہونے لگے تو پھر نظر سے بھالا مار گرایا۔ جسم کے درمیانی حصّہ کو جھُولا جھُلاتے ہوئے کہنے لگی مجھے تو چکّر آرہا ہے۔ ذرا جم کو تلاش کر کے گھر چلنے کو کہو۔ ہم نے پوچھا بی بی! ہم اس مردِ خُدا کو کیوں کر پہچانیں گے؟ ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی، آج اس نے سِلک کا انڈر ویئر پہن رکھا ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کا ہے۔ کل دس بجے مجھے فون کرنا مت بھولنا۔ نمبر اس وقت یاد نہیں آرہا۔ صبح مجھے فون کر کے پوچھ لینا۔

ہمارے باس کا نزولِ اجلال

اس وقت تک محفل کا نقشہ دگرگوں ہو چکا تھا۔ کسی کو کسی پر ہنسنے کا ہوش نہ تھا۔ مردوں

کی حرکات و سکنات میں فرق آچکا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ حرکات ختم ہو چکی تھیں، صرف سکنات رہ گئے تھے۔ بقولِ شاعرِ شیوہ بیاں :

جو کھڑا تھا، کھڑا رہا وہ وہیں
جو پڑا تھا، پڑا رہا وہ وہیں

اس مرحلہ پر مسٹر اینڈرسن جھومتے جھامتے داخل ہوئے۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر اسے شامیانے کی نیشنل سرحد پر لا کر چھوڑ دیا۔ ہم نے آگے بڑھ کر اس سے کراچی کے موسم کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہا تو اندازہ ہوا کہ ہمیں پہچاننے میں اسے یہاں تکلّف و تامل ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی اس کا نوٹس لینا چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چھنگلیا سے بُلانے کا اشارہ کیا۔ ہم دوڑے دوڑے گئے تو کہنے لگا کہ مَیں تو بیرے کو بُلا رہا تھا۔ میرے گلاس میں سوڈا زیادہ ہے۔ مگر یہ کیا بات ہے؟ تمھارا گلاس اندر سے بڑا، باہر سے چھوٹا ہے! اچھا! تم آہی گئے ہو تو بتلاتے جاؤ، کچھ CONTACTS بنے؟ کچھ یورو پین ڈپارٹ ہاتھ لگے؟ ہم نے مختصراً اسے مطلع کیا کہ اب تک جتنے یورو پین حضرات کو ہم نے "کنٹکنٹ" کیا، انھوں نے اُلٹا اوورڈرافٹ مانگا، جس کی مجموعی رقم اس گلاس تک ستّر لاکھ ہو چکی ہے۔ بُرا سا مُنھ بناتے ہوئے بولا، تم جہاں سے آئے تھے، وہیں واپس جا سکتے ہو۔

اسی نوع کے چار پانچ مزید خسارہ خیز "کن ٹیکٹس" قائم کر کے، ہم چینی نارنگی کی جھاڑی کے پاس، اپنے بارہ سُنہری اصولوں کی چھتری تلے کھڑے ہو گئے۔ ذرا دیر بعد دیکھا کہ اینڈرسن ہماری طرف لڑھکتا لڑھکتا آ رہا ہے۔ ہم نے بھی اسے آخری نقطۂ اتصال تک لڑھکنے دیا۔ پیشوائی کو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔ قریب آ کر کہنے لگا کہ تم برٹش ہائی کمشنر سے بھی ملے؟ اور یہ تم سپیرے کی طرح گلپھڑے پُھلا پُھلا کر کیا پی رہے ہو؟ زمزم واٹر؟ تمھاری ٹائی میرے موزوں سے میچ کرتی ہے! یہ کہہ کر اپنی ظرافت سے آپ ہی محظوظ ہوا اور ہلارے ہنسی کے مُنھ بھر کے وہسکی کی کُلّی کر دی جو آدھی فرش پر ضائع ہوئی، آدھی ہمارے گلاس میں محفوظ ہو گئی۔

سوال دیگر، جواب دیگر

مہکتی بہکتی لیڈیز اب شراب اور "شوَلری"★ سے لبریز مردوں سے دامن کشاں اپنا ایک علیحدہ جھُرمٹ بنا چکی تھیں۔ یہ جھُرمٹ قریب سے فرنچ خوشبوؤں کا بگولہ اور دُور سے صبح کا ستارہ نظر آتا تھا، جس کی کٹیلی نوکیں مردانہ دائروں میں تا حدِ آرزو پیوست تھیں۔ جب وُہ، بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، "گِگل گِگل" ہنستیں تو ہر مرد اپنی اپنی گھنٹی کی آواز پہچاننے کے لیے کنوتیاں اُٹھاتا۔ ان خواتین کا طرزِ تخاطب و تکلّم دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جہاں سات آٹھ عورتیں جمع ہوں تو سب بیک وقت بولتی ہیں اور اس سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ کہ بولتے میں سب کچھ سُن بھی لیتی ہیں۔ گویا ایک عورت نان اسٹاپ ٹرانسمٹ بھی کرتی ہے اور اس عمل کے دوران سات آٹھ WAVELENGTHS پر کان ٹیون کر کے اوروں کی سُن بھی لیتی ہے۔ لیکن مردوں کی بات اَور ہے۔ سات آٹھ مرد یکجا ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے صرف ایک بولتا ہے۔ باقی ماندہ نہیں بولتے۔ اور نہ سنتے۔

بے محل سہی، مگر مرزا کا قول یاد آتا ہے کہ تاش کے جتنے بھی کھیل ہیں وہ مردوں نے ایک دوسرے کو چُپ رکھنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔

ہمارے وہ پڑھنے والے جو کبھی اس آتشیں بپتسمہ سے نہیں گزرے، ان کی اطلاع و عبرت کے لیے عرض ہے کہ اگر سو ڈیڑھ سو باتونی بہروں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ان کے درمیان جو گفتگو ہوگی، وہ من و عن وہی ہوگی جو کاک ٹیل پارٹی میں سُننے میں آتی ہے۔ ہر ایک اپنی ہانکے چلا جا رہا ہے۔ سوال کچھ، جواب کچھ، مگر دونوں مطمئن۔ اور چاہیے بھی کیا؟ اب ہم خواتین کے چیدہ چیدہ مکالمے نقل کرتے ہیں جو وقتاً فوقتاً کاک ٹیل پارٹیوں میں ہمارے کان میں پڑے۔ ان میں ربط یا کسی اور شے کی کمی محسوس ہو تو اس عاجز ناقل کو معاف فرمائیں۔ (ایسے میں مردوں کے مکالمے چونکہ آہ! واہ! وِہسکی اور سِسکی سے آگے نہیں بڑھ پاتے، اس لیے مجبوراً زنانہ مکالموں پر اکتفا کرنا

★ CHIVALRY

پڑا۔)

"مجھے رُوسی زہر لگتے ہیں۔ میرا میاں جب رُوسی 'وودکا' پیتا ہے تو ساری کراکری توڑ دیتا ہے۔ پھر مجھے 'میٹرنٹی ڈریس' پہننا پڑتا ہے۔ ہو ہو ہو!"

"کیسا پیارا TAN ہے تمھارا! کیا ہاکس بے گئی تھیں؟"

"ایلس کے میاں کی سیکرٹری ہر سال اپنڈکس کا آپریشن کرواتی ہے!"

"تم نے ڈاکٹر رسم کا کس کی نئی یونانی لاڈلی کو دیکھا ہے؟"

"سیخ کباب کے سوا، مجھے لوکل کلچر کی اور کوئی چیز پسند نہیں آئی۔"

"تم نے کبھی ریچھ اور کتے کی لڑائی دیکھی ہے؟ ہمارے گولڈن ریٹریور کے ایک زمیندار نے چار ہزار لگائے ہیں۔ کیسے بے رحم ہیں! مئی میں ہمارا پاکستان سے تبادلہ ہو گا تو ڈاکٹر فیروز سے کتے کو زہر کا انجکشن لگوا دوں گی۔ اس کا باپ بہت FASTIDIOUS ہے۔ چلم میں اونٹ کی سڈول ہموزن مینگنیاں ڈال کر حقّہ پیتا ہے۔"

"TWO CUBES OR THREE CUBES ? HA! HA!"

"تم اس ایوننگ ڈریس میں بڑی پیاری لگ رہی ہو۔ پیرس سے خریدا؟ میں نے پچھلے سال فینسی ڈریس بال میں بھاری بنارسی ساری پہن کر رقص کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنی دبیز تہ در تہ ساری کے نیچے بھی کچھ پہنا جاتا ہے۔ ایک فاسٹ نمبر میں اس کا بارڈر مسٹر احمد کے جوتے کے نیچے آگیا۔ جیسے ہی میں جھوم کر تیزی سے پلٹی تو ایک ہی جھٹکے میں ساری کھل کر فلور پر آرہی۔ جلیبی سی بن گئی۔ تم نے کبھی کھائی ہے؟ سڑے ہوئے مکھن اور چینی کے قوام کو آٹے کے نارنجی کیپسول میں بند کر دیتے ہیں؟ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی، اس لیے کہ میں نے کاٹن (سُوتی) کا انڈر ویئر پہن رکھا تھا۔ اوہ! ایسٹ از ایسٹ! عجیب بات ہے جب بھی میں کسی پاکستانی سہیلی سے چپاتی بنانے کی RECIPE مانگتی ہوں تو وہ ٹھٹھے مارتی ہے!"

"ہائے! سارے بال بکھرے جا رہے ہیں۔ آج ہی سیٹ کرائے تھے۔ کراچی میں اتنے زور کی پچھمی ہوا چلتی ہے کہ کسی کبڑے کو پچھم کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا کر دو تو ایک ہی دن میں ساری

کوب نکل جائے۔"

"تم نے سُنا؟ جب سے وہ جاپانی مَساج کرنے والی آئی ہے، کراچی کے سبھی کروڑپتی گٹھیا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بیرا! وہسکی آن دی روکس، پلیز!"

★ "BLOODY MARY FOR ME."

"CAMPARI"

"تم نے نئے جرمن اتاشی کی بیوی دیکھی؟ دُودھیا بُھٹّے جیسے بال۔ ٹماٹر جیسے گال۔ ٹانگیں جیسے کِنگ سائز دوشاخہ مُولی۔ بالکل دیہاتن لگتی ہے۔ بدن سے بَیل کی بُو آتی ہے۔"

"اور اس کا میاں تو بالکل ہی جنگلی ہے۔"

"ہائے! مرد کی بہترین قسم یہی تو ہوتی ہے، پگلی!"

"جینی کو بریسٹ کینسر ہو گیا۔ بیٹی ڈِین کی عادی ہو گئی ہے۔"

"سُنا ہے تمھاری کزن کی تصویر VOGUE میں چھپی ہے؟"

"کیا بجا ہے؟ مجھے ایِن کے ڈنر میں جانا ہے۔"

"صدیقی چارمنگ ہے، مگر بہت BOOKISH - ایک دفعہ ناچتے ناچتے نشے میں اپنے ہونٹ میرے VACCINATION MARK پہ رکھ کے کہنے لگا، ہَنی! تمھاری رانیں کیلے کے تنے جیسی ہیں! اسی نے بتایا کہ یہ تشبیہ کالیداس نام کے کسی شاعر نے استعمال کی ہے۔ میں صبح اٹھتے ہی کیلے کا تنا دیکھنے گاندھی گارڈن گئی۔ "HOW SWEET OF KALIDAS !

"اُوہ ڈیئر! اوہ ڈیئر! اوہ ڈیئر!"

"مجھے نیتھیا گلی سے کرسمس ٹری منگوا دو نا۔ ورنہ پھولدار جھاڑو کا کرسمس ٹری بنانا پڑے گا۔"

"نو تھینکس! بہت ہو گئی۔ بائی بائی وینیسیا!"

"تمھیں مونچھیں پسند ہیں؟"

"مرد کی یا عورت کی؟"

★ ٹماٹو جُوس اور وودکا کو ملانے سے بنتی ہے۔

"مونچھ اور سگار کے بغیر پیار کیسا ادھورا ادھورا، پھیکا شیرخوار لگتا ہے!"

"مردوں کو ہوانا سگار کی بو بہت بھاتی ہے۔ اسے بنلتے وقت لڑکیاں ران پر رکھ کر ROLL کرتی ہیں۔"

"میں نے چٹاگانگ سے بدھسٹ خانساماں بلوایا ہے۔"

"خان ڈرنک ہولڈ نہیں کر سکتا۔ اسے تو آئی ڈراپر سے اپنے منھ میں چوانی چاہیے۔"

"نپولین برانڈی۔"

"آم اور مہندی کی بدبو ۴۸ گھنٹے تک نہیں جاتی۔ نہ جانے یہ لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔"

"فرانس میں آج کل لمبے اسکرٹ اور مڈل ایجڈ مرد فیشن میں ہیں۔"

"میرا لکی اسٹون زمرد ہے۔ جب میری طلاق ہوئی ہے تو میں نے اسی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔"

"تم سنڈے کو چرچ نہیں آتیں؟"

"پانی نہیں، سوڈا"

. . . ترے کوچے سے ہم نکلے

ساڑھے نو بجنے میں دو تین منٹ باقی ہوں گے کہ ایکا ایکی بھگدڑ مچ گئی۔ وہی نستعلیق باریش بیرا ہانپتا کانپتا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اپنے باس کو سنبھالیے۔ اس نے آپ ہی کے بینک کے ڈائرکٹر سیٹھ . . . . . کے سر سے ترکی ٹوپی اتار کر اس میں اُلٹی کردی۔ اور اب ڈرنکس کی میز کے نیچے گھس کر مرغے کی بولی بول رہا ہے۔ سب میمیں بھاگ گئی ہیں۔ ایک تو اپنا پرس اور ہینڈ بیگ بھی چھوڑ گئی۔ جلدی چلیے۔ اس کا نیا ڈرائیور عشا پڑھنے گیا ہوا ہے۔ آپ چارج لیجیے۔ مسٹر اینڈرسن بن بلائے ہر کاک ٹیل میں پہنچ جاتا ہے۔ آج بھی گیٹ کریش کیا ہے۔

"ڈبل وہسکی، پلیز!"

ناٹک

بے در و دیوار ناٹک گھر بنایا چاہیے

صحیح نام اور پتہ بتانے سے ہم قاصر ہیں، اس لیے کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ سر دست اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ اس تھیٹر کو اداکاروں کی ایک کوآپریٹو سوسائٹی نقصان باہمی کی بنیاد پر چلا رہی تھی۔ پہلی تاریخ کو بڑی پابندی سے مہینے بھر کا خسارہ تمام ممبران کو بحصّہ مساوی بانٹ دیا جاتا تھا۔ صرف ٹکٹ گھر پختہ تھا کہ اس پر کھیل کے بعد اکثر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ہال کی دیواریں اور چھت ٹاٹ کی تھیں، جن میں خلاف محاورہ پیوند بھی ٹاٹ ہی کے لگے تھے۔ چھت قمری کیلنڈر کا کام دیتی تھی۔ ٹاٹ کی قناتوں میں بھی جا بجا سر کے برابر سوراخ ہو گئے تھے۔ کھیل کے شروع میں ان میں سر گھسا کر باہر والے اندر کا تماشا دیکھتے، آخر میں اندر والے گردن نکال کر باہر کی رونق دیکھ لیتے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ پونے نو آنے کا ہوتا تھا۔ اس میں صوفوں کا تکلف تھا، جن کے فولادی اسپرنگ لباسِ مجاز پھاڑ کر چھ چھ انچ باہر نکل آئے تھے۔ انھیں رانوں کے بیچ میں لے کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ چھ آنے کا تھا۔ اس میں سرکنڈوں اور لوہے کی پتریوں کے مونڈھے، مونجھ کی پیڑھیاں اور چنیوٹی کھٹولیاں پڑی تھیں۔ تیسرے درجے میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ فرشی سے ہماری مراد فرشِ خاکی ہے۔ اس کلاس میں جو ناظرین باتمکین زیادہ نک چڑھے واقع ہوئے تھے وہ گھر سے انگوچھے کے کونے میں ریزگاری باندھ کر لاتے۔ کسی گانے یا ناز و ادا پر طبیعت بہت بے قابو ہو جائے تو نیچے سے نکال کر گوپھن کی

طرح گھماتے اور اسٹیج پر داد کے انگوچھے برساتے۔ چند "ماہواری ناظرین" نے کٹے پاؤں کی پیڑھیاں ڈال رکھی تھیں جن پر بیٹھ کر وہ مہینے بھر مزے سے مونگ پھلیاں اور پیچھے بیٹھنے والوں کی گالیاں کھاتے رہتے تھے۔ روارَوی میں ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ پیچھے بیٹھنے والوں کی سہولت کے لیے ہال میں "نشستی" ڈھلان اس طرح پیدا کیا گیا تھا کہ اگلے یعنی اسٹیج سے ملحق حصے میں دو ڈھائی فٹ گہری زمین کھود کر ایک اکھاڑا سا بنا دیا گیا تھا۔ اس میں فرسٹ کلاس والے خاک پھانکتے اور سیکنڈ کلاس والے لوٹیں لگاتے تھے۔ اکھاڑے کی دائیں بائیں مُنڈیر پر چند "خلیفے" پیر لٹکائے بیٹھے رہتے تھے۔ اسے گیلری سمجھ لیجیے۔ آرکسٹرا اور فرسٹ کلاس کے درمیان ہم نے ہمیشہ ایک پھاوڑا پڑا دیکھا۔ اور کبھی کبھار یہ بھی دیکھا کہ پیچھے بیٹھنے والے کسی "ناظرین تمکین" (تماشائی کے لیے ہمیشہ یہی صیغہ جمع استعمال ہوتا تھا) کو کسی دوسرے "ناظرین" کی ٹوپی یا کلف دار طرّہ نظر آنے لگے تو وہ انٹرول میں خود پھاوڑے سے ایک دو بالشت اکھاڑا کھود کر سرکش صوفے کو مع سرِ پُرغرور زمین میں دھنسا دیتا تھا۔ اسی آلے کے پاس ایک ادھ کھدی قبر میں منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کی کھٹیا پڑی رہتی تھی۔ ان کا صرف چہرہ اور مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی پھُدکتی نظر آتی تھی۔

مصوّرِ درد منشی ریاضت علی سوختہ

یہ بزرگ جو ستّر کے پیٹے میں ہوں گے، اسی کھٹیا پر گاؤ تکیہ لگائے صاحبِ فراش رہتے تھے۔ ایک پاؤں قبر میں، دوسرا اسٹیج پر۔ سپید میدہ رنگ جو جوانی میں ہی نہیں اب بھی شہابی تھا۔ تیکھے تیکھے نقوش۔ غلافی آنکھیں۔ بے شکن پیشانی۔ انھیں اس بڑھاپے میں بھی وجیہہ کہا جا سکتا تھا۔ بر میں سپید ململ کا چُنا ہوا کُرتا۔ کُرتے پر کشیدے سے کڑھے ہوئے چنبیلی کے سپید پھول۔ پھولوں میں تازہ پان کا رنگ بھرا ہوا۔ پھنسا پھنسا چوڑی دار پاجامہ۔ نڈھال نڈھال سے رہتے تھے۔ پاجامے کے علاوہ کسی چیز میں چُستی نہیں پائی جاتی تھی۔ (پہننے کے بعد پائینچے کس کے سیتے تھے) سُرخ ریشمی ازار بند میں ٹرنک کی چابی جھُولتی رہتی۔ ازار بند بھی

اتنا چھوٹا کہ اکڑوں بیٹھ کرتالا کھولنے سے پہلے خود اسے کھولنا پڑتا تھا۔ گرمیوں میں ہلالی عینک کی چاندی کی کمانیاں جلنے لگتیں تو ان پر سائیکل کا VALVE TUBE چڑھا لیتے تھے۔ تھیٹر کے رسیا تھے۔ چالیس برس پہلے انھوں نے موجودہ ہیروئن کی نانی کو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے اسٹیج پر پہلے پہل لکھنؤ میں دیکھا تو اپنی لکڑیوں کی ٹال (جسے وہ ہمیشہ ہیزم سوختنی کہتے تھے) کو ٹھکانے لگا کے، ایک مونڈھا منڈپ میں ڈال لیا جو مرورِ ایّام اور اضمحلالِ قویٰ سے پستا پستا ریلوے وٹینگ روم کی چھ فٹ لمبے ہتھّے والی کرسی بنا اور اب جھلنگے کا روپ دھار چکا تھا۔ اگر نیچے نقشین مرادآبادی اگالدان نہ رکھا ہوتا تو ان کی کمر فرش (فرش سے یہاں بھی وہی مُراد ہے) سے جا لگتی۔ وہ مہ جبیں تو ایک مدّت ہوئی اس بزم سے اٹھ گئی، مگر یہ یہیں کے ہو رہے کہ آسودگی کی جان اسی انجمن میں تھی۔ اس بی بی کے لب و رخسار اور آنکھوں کے گلابی ڈوروں کو یاد کر کے تو ہمیشہ آبدیدہ ہو ہی جاتے تھے لیکن آخر آخر میں اتنے رقیق القلب ہو گئے کہ اپنے مہوبے کے گلابی نسوں والے پان کی بھی یاد آجاتی تو گلا رُندھ جاتا، جسے کسی حسبِ حال شعر سے صاف کرتے۔ تھیٹریکل کمپنی نے انھیں روٹی کپڑے پر اداکاروں کا شین قاف درست کرنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ پہلی تاریخ کو سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار گھاٹا ان کے نام کھاتے میں درج کر کے بھرپائی کے دستخط لے لیے جاتے تھے۔ یہ منشی دِل کے مکالموں میں جہاں تہاں سوز و گداز کے پیوند لگاتے جو بسا اوقات اصل سے بھی بڑے ہوتے تھے۔ مصوّرِ درد کہلاتے تھے۔ ہمارے سر میں بھی ان کے مکالموں سے کئی دفعہ وہ ہوا جس کے یہ مصوّر کہلائے جاتے تھے۔ کسی سین میں کوئی بول، بھاؤ یا اپنا ہی کوئی پیوندی فقرہ پسند آجائے تو اُچھل پڑتے۔ گویا بجلی کا شاک لگا ہو۔ دو زانو ہو کر انہی اعضا کو زور زور سے پیٹتے۔ کمالِ فن کے اعتراف میں اپنے دونوں کان پکڑتے اور زبان کو باہر نکال کر مصنوعی دانتوں تلے دبا لیتے۔ گردن دائیں بائیں ہلا کر زبان نکالے نکالے گونگی داد دیتے۔ آخر کے تئیں جب ناظرین کی نگاہیں اسٹیج سے ہٹ کر ان پر مرکوز ہو جاتیں تو کنکری پر ایک روپے کا نوٹ لپیٹ کر اسٹیج پر پھینک دیتے۔ ان کی دیکھا دیکھی تماشائی بھی سونے کے دانت والی ہیروئن پر نوٹوں کی بوچھار

کر دیتے۔ ایک دِن کسی نے ہمیں بتایا کہ تھیٹر والے انھیں سوا پانچ روپے یومیہ دیتے ہیں جن میں ان کے پھینکے ہوئے پانچ روپے بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس تھیٹر میں کوئی کسی کا آقا یا ملازم نہیں تھا۔ سب مِل جُل کر کام بگاڑتے اور ایک دوسرے کے سر درد اور مسائل میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ مکالمے تو بالعموم منشی دِل کے ہوتے تھے، لیکن ناظرین کی اکثریت اور ہال کے ماحول کے پیشِ نظر اداکار بھی ان میں فی البدیہہ تضمین اور حک و اضافہ کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کسی دن ہال میں پٹھان ناظرین کی اکثریت ہو تو سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کے منظر میں سر سے کفن باندھ کے گھمسان کا خٹک رقص ہوتا۔ ورنہ ہم جیسوں کو تو کتھک ناچ پر ہی ٹرخا دیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی دن فرسٹ کلاس میں کوئی بڑا کاٹھیاواڑی سیٹھ نظر آ جائے تو ماسٹر غفار یعنی فرہاد، اپنا گنڈاسا یعنی تیشہ، کوہِ بے ستوں کے دامن میں پھینک دیتا اور گجراتی مناجات کے ذریعے غیبی طاقتوں سے فوری تعاون اور ہنگامی امداد طلب کرتا۔

سَیٹ ڈیزائن

سَیٹ اور پردے بھی سب کی اصلاح و مشورے سے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ سینری کے ہر رنگ سے مشورہ ٹپکتا تھا۔ ایک پردے پر گاؤں کا روح پرور منظر کچھ اس طرح دکھایا گیا تھا کہ ایک البیلی مٹیار آرزو اور تہذیب دونوں سے کمتر لاچا باندھے، سر پہ ایک چمپئی رنگ کا گول مٹکا رکھے، بالکل اسی رنگ اور سائز کے دو کولھے مٹکاتی پنگھٹ جا رہی ہے، جہاں حضرت امیر خسرو کے حُلیے کے ایک بزرگ بغل میں ننگی تلوار دابے اوک سے پانی پی رہے ہیں۔ سارا ڈول خالی ہو گیا مگر نظریں کہہ رہی ہیں کہ "گوری! پردیسی کی پیاس نہیں بُجھی۔ اور ا!" دُور پس منظر میں گاؤں کے جوہڑ میں ایک اسٹیمر کھڑا ہے جس کی چمنی کے دھوئیں سے آسمان پر "اللہ" رقم ہو گیا ہے۔ سامنے گلابی گھاس پر ایک سبز رنگ کی گائے چر رہی ہے۔ کونے میں گملا رکھا ہے جس میں گلاب کے پھول میں چنار کے پتے لگے ہیں۔ دائیں جانب ایک کُتّا دُم سے سوالیہ نشان بنائے کھڑا ہے۔ کھیل کے آخری سین سے پہلے مینجر کمپنی ہذا اسٹیج کے کنارے

پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا کہ پبلک کے پُر زور اصرار پر ادر" کو مپنی کی مشوری کے لیے" کل بھی یہی کھیل نئی سین سینزی کے ساتھ دکھایا جائے گا۔ سین سینزی میں نیا پن اس طرح پیدا کیا جاتا تھا کہ انہی پردوں کی ترتیب اُلٹ دی جاتی تھی۔ مثلاً اسٹیج پر گھمسان کی لڑائی میں کسی کا دمِ واپسیں دکھایا جارہا ہے تو پیچھے پنگھٹ والے پردے پر دو چمپئی مٹکے مٹک رہے ہیں۔ سوالیہ دُم پوچھ رہی ہے" کون سی چال ہے یہ آگ لگاتے نہ چلو" ایسے میں آنکھوں کا دم نکلے تو کیوں کر نکلے۔

نِکاح رُوبرو، باادب، باملاحظہ

ہر کھیل میں غزلیں داغ دہلوی اور نعتیں امیر مینائی کی گائی جاتی تھیں۔ غالب، اقبال، حسرت موہانی اور فیض کے وجود کی کمپنی ہذا کو ہنوز اطلاع نہیں ملی تھی۔ داغ کا سکہ گھس ضرور گیا تھا مگر کھوٹا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس صدی کی تیسری دہائی تک تو یہ حال تھا کہ اگر داغ کے کلام کے مجموعوں کی تمام کاپیاں تلف ہو جاتیں تو طوائفیں پوری کلیات املا کروا سکتی تھیں۔ ابھی اس کے عینی شاہد موجود تھے کہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کے دربارِ دُربار میں جو تازہ غزل اُستاد داغ پڑھتے تھے، وہ ایک ہفتے میں سینہ بسینہ یعنی حسینہ بہ حسینہ، رؤسائے دلّی و لکھنؤ و رامپور تک پہنچ جاتی تھی۔ (آج کل کی طرح اس زمانے میں ریڈیو اور ٹی وی تو تھے نہیں۔ لہٰذا شعر و شاعری سے بیزار کرانے کا کام صرف قوالوں اور طوائفوں ہی کو انجام دینا پڑتا تھا) داغ ہی کے الفاظ میں سارے جہان، یعنی ہندوستان، میں ان کی زبان کی دھوم تھی۔ چنانچہ اس تھیٹر میں اکبر کے دربار میں، فیضی کی موجودگی میں بھی، تان سین داغ ہی کی غزل داغتا تھا۔ قرائن سے تو یہی لگتا تھا کہ اکبر دربار کا ڈھونگ ہی ہمیں یہ غزل سنوانے کے لیے رچاتا تھا۔ کیا شوکت و دبدبہ تھا اس دربار کا! جب طرحدار کنیزوں، چوب بردار جسولنیوں، قلماقنیوں، اُردہ بیگنیوں اور الجتانی پاتروں کی دو رویہ قطار سے مغلِ اعظم کاغذ کا پھول سونگھتے ہوئے نزولِ اجلال فرماتے تو ایک جاہل نقیب چوبِ نقرئی ٹھونک ٹھونک کر صدا دیتا:

" نکاح رُوبرو! باادب، باملاحظہ ہوشیار!"

سارے اسٹیج کی لکڑیاں اور لڑکیاں لرز اُٹھتیں۔ خدا جانے اس میں اُس کے تلفظ و نیت کا خلل تھا یا ہمارے اپنے حسنِ سماعت کا دخل۔ نکاح کی شرعی دھمکی کے علاوہ "ہوشیار!" بھی اس گھن گرج سے ادا کرتا جیسے اندھیری راتوں کو چوکیدار لاٹھی بجا بجا کر چوروں اور نقب زنوں کو خلقِ خدا سے ہوشیار خبردار کرتے ہیں۔

اس زمانے میں ہال میں سگرٹ بیڑی پینے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ البتہ اسٹیج کے دائیں چوبی ستون یعنی بَلّی پر ایک نوٹس آویزاں تھا "شراب پی کر دُند مچانا، دنگا کرنا منع ہے۔" حالات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ناظرین نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ بغیر شراب پیئے، دنگا فساد کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔

مرزا راون کے رُوپ میں

سچ تو یہ ہے کہ اسٹیج اور اس کے رموز ولذائذ سے ہماری واقفیت بچپن میں رام لیلا اور بعد میں کالج ڈراما سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اور وہ بھی مرزا عبدالودود بیگ کے طفیل و توسّط سے۔ مسلمان لڑکوں کو اس زمانے میں رام لیلا میں کوئی رول دینے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں تو ہنومان جی (بندر سینا کے سردار جنھوں نے لنکا کو آگ لگائی تھی) تک کا پارٹ نہ ملا۔ خیر اس کی تو یہ معقول وجہ ہو سکتی تھی کہ ہمارے دُم نہیں تھی۔ صورت بھی اُس زمانے میں ان سے نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں مرزا (عمر ۱۲½ سال) محلّے کی سیتا (عمر ۹ سال) پر جی جان سے فریفتہ تھے۔ بارہا اس کا نام کانپ کے نیچے لکھ کر اُس کے گھر کے رُخ پتنگ اُڑائی ہی نہیں بلکہ محلّے کے لونڈوں سے کٹوائی اور لٹوائی بھی۔ دسہرے سے چار روز قبل رامچندر جی کے حواریوں نے راون کی ایسی پٹائی کی کہ کوئی ہندو لڑکا راون بننے کے لیے راضی نہ ہوا۔ اس اَڑے وقت میں مرزا نے اپنی خدمات یعنی پیٹھ پیش کی۔ کہنے لگے جب تک میرے دَم میں دَم ہے محلّے میں رام لیلا ضرور ہوگی۔ ایک بندریا کے روٹھ جانے سے برندا بن سُونا نہیں ہو جاتا۔ راون کے رول کی واحد دلکشی ان کے لیے یہ تھی کہ اس میں سیتا کو اغوا کرنے کا موقع ملتا تھا۔ مزید برآں، مرزا کے

پاس ایک پالتو ہرن بھی تھا جس کی رام لیلا میں ہر سال ضرورت پڑتی تھی۔ مرزا کو راون کا پارٹ ملا تو انھوں نے ہمیں اپنا مہامنتری مقرر کیا کہ ہم اس زمانے میں بھی ان کی اردلی میں تھے۔ (مرزا آج بھی ہمارے بغیر کوئی مشتبہ و پُرخطر کام نہیں کرتے۔ کہتے ہیں پُل صراط پر بھی تمھارے بغیر قدم نہیں رکھوں گا۔ گمان غالب ہے کہ وہ ہم پر سوار ہوں گے۔) ہمارا کام یہ تھا کہ جب وہ سیتا جی کو لے کر فرار ہوں تو کم از کم دس منٹ تک ہم ان کے عوض رامچندر جی کے عقیدتمندوں سے مار کھاتے رہیں، تاکہ وہ دوسری گلی میں مغویہ سے جی بھر کے باتیں کر سکیں۔ دوسرا کام ہمارے سُپرد یہ تھا کہ جب وہ راون کے دس چہروں والے "ماسک" اور پٹائی سے پسینے میں شرابور ہو جائیں تو ہم مورچھل سے انھیں ہوا کریں۔ اور ایک بوتل لیمونیڈ سے چھکا کر لنکا ڈھانے کے منصوبے سُجھائیں۔

"ونس مورا!"

یہ ہمیں مرزا عبدالودود بیگ ہی نے بتایا کہ اسٹیج کے پہلے پردے کے اوپر جو جھالر ہوتی ہے اس کی اوٹ میں خالی مٹکوں کی ایک قطار تھی جن کے پیندے ناظرین کی طرف اور منھ ایکٹر کی طرف۔ مقصد ان کا ایکٹر کی آواز میں گونج اور گرج پیدا کرنا تھا۔ یہ مائیکروفون کا نعم البدل تھے۔ مرزا ہی سے مروی ہے کہ ان کی موجودگی کا انھیں اس وقت علم ہوا جب ایک گھڑا سُہراب کے سر پر عین اس وقت گرا جب وہ ناخلف اپنے باپ رستم سے ہاتھ چلا چلا کر نہایت مقفّیٰ و مسجّع اُردو میں گستاخانہ گفتگو کر رہا تھا۔ پردہ کھینچنے کے فرائض خود منیجر کمپنی ہذا سیاہ "بو" لگائے اپنے دستِ خاص سے انجام دیتے تھے۔ ونگ میں دوہرے ہو کر اس طرح کھینچتے تھے جیسے گہرے کنوئیں کے ڈول کو پنہاری۔ پردہ گرانے میں بھی بعض اوقات اتنی دیر لگتی کہ اسٹیج پر پڑی ہوئی فنا ہتھلیں (لہورنگ جو چند منٹ میں اُڑ جاتا ہے) کے خون میں لت پت لاش میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ شائقین کو موت یا قتل کا کوئی سین بطورِ خاص پسند آتا اور "ونس مورا! ونس مورا!" کی صدائیں آتیں تو اسے بار بار دکھایا جاتا۔

مقتول اُٹھ اُٹھ کر حیدرآبادی انداز سے ہاتھ کا ادک بنائے سب کو آداب و تسلیمات بجا لاتا اور پھر انتقال فرما کے دکھاتا۔ دیکھنے والے بالعموم ٹریجڈی پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بعض ڈرامے ہی ایسے ہوتے تھے جن میں اصل مجرم یعنی مصنف کے علاوہ سب قتل کر دیے جاتے تھے۔ ہر کردار کو چُن چُن کر کیفرِ کردار کو پہنچا دیا جاتا۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے پردے کے پیچھے سے کوئی صاحب گھڑے میں مُنہ ڈال کر گونج دار آواز میں لاکھ بُرا چاہنے والے مُدّعی کو مطلع کرتے :

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے

لیکن اگر اس سے ان کی مُراد یہ تھی، جو کچھ اسٹیج پر ہوتا تھا تو اس کی منظوری کا الزام خُدا پر رکھنا، منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کی صریحاً حق تلفی ہوگی۔

ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدلنے کا نسخہ

اس زمانے کے چلن کے مطابق ٹریجڈی کو کامیڈی کا رنگ دینے کی یہ ترکیب نکالی گئی کہ تمّت بالخیر یعنی آخری سین میں عاشق نامُراد کی تُربت دکھائی جاتی جس پر ایک ہزار کینڈل پاور کا نُور برس رہا ہے۔ سوگوار ہیروئن سیاہ برقع اور سیاہ چوڑیاں پہنے، طباق سا مُنھ کھولے آتی ہے۔ اسٹیج کے عقب میں خالی کنستروں پر کُود کُود کر بجلی کڑکنے کا صوتی تاثر دیا جاتا ہے۔ ہیروئن ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے سے غرارے کے پائینچے اٹھائے ہوئے ہے جس سے بھری برسات کے علاوہ بھری بھری پنڈلی کا سماں بھی دکھانا مقصود ہے۔ وہ "اسلام علیکم یا اہل القبور!" کہہ کر قبر سے لپٹ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے علاوہ اسٹیج پر بھی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بجلی پھر کڑکتی ہے اور قبر شق ہو جاتی ہے۔ اس میں سے ہیرو مرحوم و مدفون، علیگڑھ کٹ پاجامہ، ترچھی رامپوری ٹوپی اور عطر سہاگ لگائے، کفن پھاڑ کے برآمد ہوتا ہے۔ ہیروئن قبر چھوڑ کر اہلِ قبر سے بغلگیر ہوتی ہے اور دونوں قبر پر بیٹھ کر بلمپت میں حمد گاتے اور آفاتِ ارضی و سماجی کو للکارتے ہیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔ یا پھر فردوسِ بریں کا منظر ہوتا ہے جہاں مُردوں کی سرگرمیاں دکھائی

جاتی ہیں۔ مرحومین یعنی شیریں اور فرہاد باغِ ارم میں چہلیں کرتے دکھائے جاتے ہیں۔ متوفّی بڑھ کر متوفّیہ کو آغوشِ محبت میں کھینچتا ہے تو وہ بامحاورہ اُردو میں یہ کہتی ہوئی کہ "ہٹو! یہاں بھی کانٹوں میں گھسیٹتے ہوا" کانٹوں کو گلے سے لگا لیتی ہے۔ ہیرو اس کا جواب عام فہم اور سلیس سسکیوں میں دیتا ہے۔ میّت کے پانچ بچے بھی دکھائے جاتے ہیں جن کی عمروں میں صرف ایک ایک مہینے کا فرق ہوگا کہ یہ منشی ریاضت علی سوختہ کی ذہنی کوکھ سے جنمے تھے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔

شاذونادر ہی کوئی ایسا ڈراما ہوتا تھا جس میں فرض اور محبت کی خونین ٹکر نہ دکھائی جائے۔ مثلاً منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی نے پانچوں انگلیاں خونِ دل میں ڈبو کر ایک رقّت انگیز سین لکھا تھا، جس میں شہزادہ سلیم کو اپنے ہی نام کی شاہی جوتی پہنے اسٹیج پہ لمبے لمبے ڈگ مارتا جذباتی کش مکش میں مبتلا دکھایا جاتا ہے۔ ایک طرف فرض ہے۔ دوسری طرف محبت۔ اور تیسری طرف ——— جدھر منشی جی کی نظر نہیں گئی ——— عقلِ سلیم یعنی COMMONSENSE انارکلی کے گریبان میں منھ ڈالے کھڑی ہے۔ آخر میں تینوں لہولہان ہو جاتے ہیں۔ فتح تینوں میں سے کسی کی نہیں ہوتی۔ فتح ہوتی ہے منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی کے ایک ناموزوں مصرع کی، جس پر کھیل کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اسٹیج کے "آلات کشاورزی"

فرسٹ کلاس میں بیٹھنے والوں کو گرین رُوم میں جاکر اداکاروں کو مبارکباد کے علاوہ نقدی دینے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ گرین رُوم کی دیواریں چٹائی کی اور ستون بانس کے تھے۔ چھت یاد نہیں کاہے کی تھی۔ غالباً سیمنٹ کی نہیں تھی۔ چھت سے ذرا دُور، میک اپ کے لیے ایک کھوکھے پر چیچک زدہ قدِ آدم آئینہ رکھا تھا۔ اس آئینے میں چہرہ نظر آنا تو بعد کی بات ہے، خود آئینہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ قدِ آدم ہم نے اس لیے کہہ دیا کہ آدمی کا قد ساڑھے تین فٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس کے پہلو میں تختِ طاؤس پڑا تھا جو اچھے دِنوں میں ڈینٹسٹ کی کرسی

رہ چکا تھا۔ اب اس پر نادر شاہ درانی کے دانت تھے۔ چاروں طرف، بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ناٹک کے آلاتِ کشادرزی بکھرے پڑے تھے:-

نورجہان کے دو کبوتر، نظام سقّہ کی مشک، مجنوں کا گریبان، لات گھونسے کھانے والے دِلن کی پیٹھ کا حفاظتی پیڈ، سائیڈ ہیروئن کی چولی بھرنے کے لیے گودڑ جو غالباً کسی تیلی کے لحاف میں سے نکالا گیا تھا اور جس سے بقول حضرت جوشؔ ملیح آبادی "جھل جھل کرتی چست انگیا کی کٹوریوں میں زیرِ تعمیر تاج محل کی ہمکار" دکھانی مقصود تھی۔ (معاف کیجیے جوشؔ صاحب کے مستورہ بالا استعارے کا سہارا ہم نے محض اس رعایت سے لیا کہ دیکھا جائے تو تاج محل کے گنبد تلے آخر دو مُردے ہی تو دفن ہیں۔) سائیکل کے اگلے بریک کے دوشاخہ سے بنایا ہوا اسٹیتھس کوپ جسے کانوں سے لگا کر ڈاکٹر مریضہ کے گودڑ کا معائنہ کرتا تھا۔ قارورے ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹری سے خریدی ہوئی خالی بوتلیں جنھیں رانا سانگا کے ساتھ جنگ کرنے سے پہلے توڑ کر بابر شراب نوشی سے توبہ کرتا تھا۔ باتھ روم فلش کی زنجیر جس پر سنہری پینٹ کیا ہُوا تھا۔ یہ زنجیرِ عدل تھی جسے کھینچ کر فریادی جہانگیر سے فوری حاجت روائی چاہتے تھے۔ آئینے کے پاس ڈیمپ کی ربر کی ناک پڑی تھی جسے وہ حرّافہ ہر شب کٹواتی تھی۔ اتوار کو دو دفعہ کٹتی تھی، اس لیے کہ میٹنی شو میں بھی اپنی بدذاتی سے باز نہیں آتی تھی۔

چُوڑی دار پاجامہ

کھیلوں میں زنانہ ملبوسات کی تراش خراش تو ظاہر ہے وہی تھی جو اس زمانے میں الٹرا ماڈرن سمجھی جاتی تھی۔ یعنی وہ جو آج کل ہر گھر میں نانیاں دادیاں پہنتی ہیں۔ لیکن ایک نکتہ آج تک سمجھ میں نہ آیا۔ وہ یہ کہ عورت کو جب پاکباز، پتی ورتا یا باعصمت دکھانا مقصود ہوتا تو اسے چُنا ہوا دوپٹہ اور سفید چُوڑی دار پاجامہ پہنایا جاتا۔ تاڑنے والے مہین مہین چُنٹوں اور پاجامے کی چوڑیوں کی تعداد ہی سے عصمت کی شدّت کا اندازہ کر لیتے تھے۔ لیکن جب وہ بدراہ یا مائل بہ بدی ہوتی تو ساری زیبِ تن کر لیتی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی کوئی گُل اندام ساری پہن کر

اسٹیج پر نمودار ہوتی، ناظرین کے دل کا کنول کھل جاتا۔ پُراُمید نظروں سے تھپتھپاتے۔ دیر تک تالیاں بجتیں۔ جن کے مُنھ میں دانت تھے وہ سیٹیاں بھی بجاتے۔ انتہا یہ کہ انارکلی نے مغلِ اعظم کے سامنے بھی مرہٹی اسٹائل سے ساری باندھ کر زخمی مورنی کا رقص کیا۔ یہ رقص بے مثال و بے نظیر تھا۔ اس لحاظ سے کہ اوّل تو مورنی کبھی ناچتی نہیں۔ دوم، اس مورنی کے پیر خوبصورت ہونے کے علاوہ محاورۃً بھاری بھی تھے۔ اور اس صورتِ حال کی مبینہ ذمہ داری شہزادہ سلیم کے بجائے ایک شرارتی چوب دار پر عائد ہوتی تھی۔ رقص کے لباس کے معاملہ میں انارکلی کی چھوٹی بہن ثریّا اور بھی اختصار پسند واقع ہوئی تھی۔ سینۂ ہمشیر سے باہر ہے دُم ہمشیر کا۔

پردہ اُٹھتا ہے

شو کے اوقات میں تھیٹریکل کمپنی گھڑی گھنٹے کی غلام نہ تھی۔ ½ ہال کے ٹکٹ بک جائیں تو پھر ایک گھنٹہ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایک چار فٹ لمبی تختی مستقل لگی رہتی تھی:

ہاؤس فل نہیں ہے

پردہ اُٹھنے سے پہلے تین رہکلے داغے جاتے تھے۔ یہ وہی توپیں تھیں جن کے چلتے ہی ایک کھیل میں غنیم کے ہاتھی اس بُری طرح بدکے تھے کہ ایک تو اپنی چپّل اور بیڑی کا بنڈل بھی چھوڑ گیا۔ پلاسی کی جنگ میں جب یہ بونی توپیں چلتی تھیں تو جتنی دُور گولہ جاتا، اس سے دو چار گز آگے اچھل کر یہ خود پہنچ جاتی تھیں۔ جو عیّار فرنگی گولے سے بچ نکلتا وہ ان سے ڈھیر ہو جاتا۔ پردہ اُٹھتے ہی سب مل کر سلامی گاتے۔ تھیٹر کی دُھنوں کے ٹکڑے، کبھی کبھار ریڈیو کی ٹرانسکریشن سروس سے نشر ہوتے ہیں تو ایک دوسری دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ کسی کی یاد سے وابستہ خوشبو کا جھونکا، کسی بھولے بسرے نغمے کی گونج ایک پل میں اس ہمزاد کو سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے جسے زندگی کے کسی موڑ پر تنہا چھوڑ کر ہم آگے چلے آئے۔

وکیلِ صفائی

ڈھائی تین سال تک تو اتوار بھی بینک میں گزرتا تھا۔ بارے فراغت نصیب ہوئی تو اتوار کی صبح پاک بوہیمین کافی ہاؤس میں مرزا عبدالودود بیگ اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس سے عالمی مسائل پر مناظرہ کرنے جانے لگے۔ اور سہ پہر کو اس تھیٹر میں گنڈے دار حاضری۔ اتوار کا میٹنی شو پابندی سے دیکھنے والوں کو دو آنے رعایت دی جاتی تھی۔ لیکن ہمیں کبھی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لیے کہ ہم ہمیشہ طاہر صاحب ایڈووکیٹ کے مہمان ہوتے تھے۔ موصوف کمپنی ہٰذا کے شبِ اوّل سے وکیلِ صفائی تھے (کمپنی ہٰذا عدالت، کچہری، میونسپل کارپوریشن اور تھانہ میں ہمیشہ مدعا علیہا اور ملزمہ کی حیثیت ہی سے پیش ہوتی تھی۔) طاہر صاحب کمپنی سے نقد فیس نہیں لیتے تھے۔ احباب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گھیر گھار کر لے جاتے جس کا بنیادی مقصد تفریح سے زیادہ کمپنی کو مالی نقصان پہنچانا تھا۔ طلاق اور خلع کے مقدموں کے اسپشلسٹ تھے۔ مشہور تھا کہ ان کی پرچھائیں بھی پڑ جائے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ کراچی سٹی کورٹ کو مرکز بنا کر پرکار سے ۲۰ میل کا ایک دائرہ کھینچا جائے تو اس میں خلع کی خواہشمند کوئی عورت بچی ہوگی جس نے ان سے رجوع کر کے اپنا گوہرِ مراد یعنی طلاق حاصل نہ کی ہو۔ ان سے بھی اکثر و بیشتر فیس نقد نہیں لیتے تھے۔ ایک دیہاتی مثل یاد آرہی ہے کہ آسمان کی چیل، چوکھٹ کی کیل اور کورٹ کے وکیل سے خدا بچائے۔ ننگا کر کے چھوڑتے ہیں۔ طاہر صاحب کی باتوں میں بلا کا لوچ تھا۔ وہ جھوٹ بھی بولتے تو جی چاہتا کہ خدا کرے یوں ہی ہوا ہو۔ ہمارے مخدوم اور قدر دان تھے۔ دُور کے جلوے کے قائل نہیں تھے۔ دو تین دفعہ ہاتھ پکڑ کر گرین رُوم میں لے گئے اور اپنی منظورِ نظر سونے کے دانت والی ایکٹرس سے تعارف کرایا۔ میک اپ کے بغیر وہ اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔

سات آٹھ مہینے بعد طاہر صاحب مسٹر اے۔ ٹی۔ نقوی، کمشنر کراچی، کی جنبشِ قلم سے علاقہ مجسٹریٹ بن گئے۔ ان کا علاقہ نیپیر روڈ اور جاپانی روڈ (کراچی کا بازارِ ؟) سے شروع ہو کر غالباً وہیں ختم ہوتا تھا۔ اب کچھ اور ہی طنطنہ تھا۔ گھر پہ اہلِ معاملہ کا ہجوم رہنے لگا۔ داؤں پڑے تو

بے خرخشہ معاملت بھی کر لیتے۔ دل کا دورہ پڑنے کے بعد شراب اور رشوت میں اعتدال برتنے لگے تھے۔ پُرانے دوستوں سے مِلتے اب بھی تپاک سے تھے مگر، ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں۔ ایک دن سرِراہے مڈبھیڑ ہوگئی تو ہم نے شکایت کی، اب آپ مہینوں اپنے نیازمندوں کی خبر نہیں لیتے۔ بُرا مانے بغیر بولے، اگر کسی سے برسوں ملاقات نہ ہو تو سمجھ لیجئے کراچی ہی میں ہے۔ اور بالکل خیریت سے۔

ہم نے مجُرا دیکھا

ان کے بیٹے کے ختنے ہوئے تو احباب نے فرمائش کی کہ زندہ ناچ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ تو پھر ہوجائے چھُن، چھَنن چھَنن! چھَن، چھَنن، چھَنن! انھوں نے متعلقہ انسپکٹر پولیس تک فرمائش پہنچا دی۔ اشارے کی دیر تھی۔ اس ظالم نے سارے شہر کی طوائفوں کو بجری ڈھونے کے ٹرکوں میں لاد کر لا حاضر کیا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ غالباً پہلی رات تھی کہ شہر میں کہیں مجُرا نہیں ہُوا۔ مجُرا یہاں بھی نہیں ہوا۔ اس لیے کہ ناظم آباد کے اس چار سو مربع گز مکان میں طوائفیں ایسی ٹھسا ٹھس بھری تھیں کہ مجُرا تو کجا، طبلہ دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ جو جہاں بیٹھی تھی وہیں زِرت مدرا دکھا کے بیٹھ رہی۔ ایک منچلی نے بیٹھے بیٹھے ہی طبلے کی تھاپ اور تتکار کے ساتھ کولھا بھی لگایا۔ مگر اس طرح جیسے دفعتاً آنکھ بدشگونی سے پھڑکنے لگے اور سارا جسم دیکھتا رہ جائے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنی پاکٹ ڈائری میں حساب لگا کے ہمارے کان میں مژدہ سُنایا کہ فی تماشائی ½ ۷ طوائفیں پڑ رہی ہیں۔ اور ڈھیر ساری نائیکائیں رُودکن میں۔

سونے کے دانت والی لڑکی

افسوس کہ وہ بساطِ عیش چشم زدن میں اُلٹ گئی۔ ایک منحوس صبح طاہر صاحب کے پڑوسی نے فون پر اطلاع دی کہ طاہر صاحب صبح پانچ بجے چل بسے۔ آخر وہ خوُن کی پھُٹکی جو

ان کی رگوں میں پانچ سال سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی، دماغ تک پہنچ گئی اور وہ ہنستے کھیلتے اس گھاٹی سے گزر گئے جس سے ہر ذی رُوح کو گزرنا ہے۔ زندہ دِلوں کی طرح وہ بھرا میلہ چھوڑ کر چل دیئے۔ میلہ بچھڑنے کا انتظار نہیں کیا۔ دو مہینے بعد سُنا کہ اُس سونے کے دانت والی لڑکی نے بھی بندر روڈ کے عقب میں ایک عطائی ڈاکٹر کے مذبح خانے میں اسقاط کے آپریشن کے دوران دم توڑ دیا۔ خون کسی طرح بند نہ ہوا اے۔ بی گروپ کا کمیاب خون سڑک کے اُس پار سول اسپتال میں دستیاب تھا مگر اسے وہاں منتقل کرنے کے لیے "ڈاکٹر" کسی طور تیار نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم زرد اور آنکھیں بے نور ہوتی چلی گئیں۔ کوئی دم کی مہمان تھی کہ مینجر کمپنی ہذا نے صابن لگا کر اس کی انگوٹھی اتاری۔ پھر لونگ اور طاہر صاحب کی دی ہوئی چوڑیاں اتار کر رکھ لیں۔ دانت پر سے سونے کا پتّر اتارنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس کی پیشانی پر بالوں کے قریب ابھی رات کے میک اپ کے نشان باقی تھے۔ منشی ریاضت علی اور چار پانچ ساتھی راتوں رات اسے میوہ شاہ قبرستان میں طاہر صاحب کی پائینتی گاڑ آئے۔ اس کے جسم نے ہوس کی بہت مار سہی تھی۔ دوزخ میں اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟

اور اس کے بعد وہ تھیٹریکل کمپنی بھی بند ہوگئی۔

اس زمانے میں بھی کراچی میں سینما گھروں کی کمی نہ تھی۔ انگریزی فلمیں بکثرت دکھائی جاتی تھیں۔ اور ہندوستانی فلموں پر بھی کوئی قدغن نہ تھا۔ اس کے باوجود کراچی کی اس پہلی اور غالباً آخری تھیٹریکل کمپنی کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہمارا شمار تو خیر طفیلیوں میں تھا، لیکن ہم نے یہاں ایسے ایسے نک چڑھوں کو جادُو سے آتے دیکھا جو ہالی وُوڈ کی اچھی اچھی فلموں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جسے ایک دفعہ اسٹیج کا نشہ ہو جائے، پھر جب تک آنکھوں میں دم ہے اس کا خُمار نہیں جاتا۔ جس نے ایک بار گوشت پوست کا روپ بہروپ دیکھ لیا اس کی تسکین پھر کبھی پرچھائیوں سے نہیں ہوگی۔ یہ اسی کا جادُو نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک بے سروساماں تھیٹر کا نام بر سبیل تذکرہ آیا اور ہم نے بلا قصد و ارادہ دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ کون جانے اسی بہانے اس کا حق غمگساری و چارہ گری ادا ہو جائے جس نے ایک گمنام، بے نوا کے نہ جانے کتنے اُداس لمحوں میں اُجالا کیا۔ باہر اندھیرا

ہی اندھیرا تھا۔

مسٹر ولیم شیکسپیر مرحوم

بیس برس ادھر کی بات ہے۔ ایسا ہی ایک اتوار اور ایسا ہی ایک شو تھا۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے "مینجر کمپنی ہذا" نے ناظرین باتمکین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "اب مسٹر ولیم شیکسپیر مرحوم کا ڈرامہ رومیو جولیٹ بمعہ چار کتھک رقص پیش کیا جائے گا۔ مسٹر ولیم شیکسپیر مرحوم انگریزی ڈرامہ کے آغا حشر کاشمیری مرحوم ہیں۔ (ہمیں تو آج تک ان دونوں میں مرحوم ہونے کے علاوہ کوئی اور بات مشترک نظر نہ آئی۔) مصوّر درد منشی ریاضت علی سوختہ سندیلوی نے مسٹر ولیم شیکسپیر مرحوم کے ڈائلاگ میں سے بیس مخرّب اخلاق فقرے نکال کر مسدّس حالی مرحوم کے پچیس اخلاقی شعر ڈال دیئے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

دوسرا ناٹک

نگاہیں پردہ اٹھنے کی منتظر تھیں کہ اتنے میں مسٹر اینڈرسن کا ڈرائیور غفّار ہمارا کھوج نکال کر ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں پہنچ گیا۔ یہ نوکر اپنے مالک ہی کے منہ نہیں، اس کی بوتل کے منہ بھی لگا ہوا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (کہ خود عالم بے بدل و باعمل اور پیر طریقت تھے) نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک ظریف کا قول ہے کہ مولویوں اور کسبیوں کے ملازم کاہل ہوتے ہیں۔ کیونکہ جہاں ان کے منہ سے کچھ نکلا، بہت سے حاضر باش کام کرنے کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اس لیے ان کے ملازم بے کار، اجدی ہو جاتے ہیں۔ آقاؤں کے اس زمرے میں ہم یوروپینوں کا بھی اضافہ کرسکتے ہیں۔ وہ اپنا کام آپ کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اس لیے ان کے نوکر ہاتھ پر ہاتھ دھرے زبان چلاتے رہتے ہیں۔ یہ ڈرائیور بھی بگڑ چکا تھا۔ رات کو چوری کی شراب کے نشے میں دُھت نہ ہو تو بینک کی کار چوری چھپے پرائیویٹ ٹیکسی کے طور پر چلاتا تھا۔ رات گئے شہر سے غیر ملکی ملاحوں اور ٹورسٹوں کو

ملیر کے ایک پرائیویٹ قحبہ خانے میں لے جاتا جہاں صرف پونڈ اور ڈالر میں محنتانہ وصول کیا جاتا تھا۔ غفّار مُنھ مانگا کرایہ اور جانبین سے دلاّلی کا کمیشن وصول کرتا۔ ایک رات ملیر سے واپسی میں ایک یونانی ملاّح پر مجرمانہ دست درازی کی کوشش میں ناک تڑوا بیٹھا۔ اور کار چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پھر نہ لوٹا۔ صبح گیارہ بجے ڈرگ روڈ تھانے نے ہمیں فون پر مطلع کیا کہ کار مشتبہ حالت میں کھڑی ہے۔ نیز کچّے میں اس کی چال سے معلوم ہوتا ہے کہ واردات سے قبل مالِ مسروقہ نے پٹرول کے بجائے وہسکی پی رکھی تھی۔ اسے لے جائیں۔ آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

غفّار جودھپور کا رہنے والا تھا۔ اس کے تلفظ اور مارواڑی لہجے کی نقل بہت دشوار ہے۔ ہر لفظ کے آگے پیچھے دو چشمی ھ لگا کر بولیں تو شاید لہجے میں وہ دھڑدھڑاہٹ اور ھمھمہ پیدا ہو جو راجستھانی بولی کا ٹھاٹھ اور سنگھار ہے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا "آپ کو تماش بینی کی پڑی ہے۔ اُدھر بڑا صاب مُنھ ھندیرے سے ھُدھم مچا رہا ہے۔ دارُو کا ادّھا چڑھا گیا ہے۔ آپ کو تو وہ مرڈر کیس اچھی طریوں یاد ہوگا۔ اس کے یار مسٹر جیمسن کا ننگی حالیت میں قتل۔ جب نُمھُنّے لونڈے نے شراب کے گلاس میں تیزاب بھر کے اس کی آنکھوں پہ پھینکا۔ پھر جھٹ دینی ڈبل روٹی کاٹنے کی چھری سے ذبح کر دیا۔ وہ دِن ہے اور آج کا دِن۔ بڑا صاب بوتل سے مُنھ لگا کے پیتا ہے۔ لطیفی صاب (ایک بڑے افسر جن سے مسٹر اینڈرسن کی ذرا نہیں بنتی تھی) سے آیئنے میں کھڑا تُوتکار کر رہا ہے۔ بلکہ انگریزی میں فادر مدر کر رہا ہے۔ بڑے بڑوں کی شان میں یکّے بعد دیگرے، دیگرے بعد یکّے، غستاخی ہو رہی ہے۔ گیارہ بجے اس نے لطیفی صاب کی کنپٹی پہ کس کے ایسا گھونسا مارا کہ آیئنہ کرچی کرچی ہوگیا۔ ساری مغروریت خاک میں رل گئی۔ گھونسا بھی خونم خون ہوگیا۔ ابھی ابھی ڈاکٹر بٹر فیلڈ کو بُلا کر پٹی کروائی ہے۔ یقین نہ آئے تو جا کے چشم دید دیکھ لینا۔ آپ کو سلام بولتا ہے۔ آرڈر ہے کہ آپ جس حالیت میں بھی ہوں، گاڑی میں ڈال کے بنفشِ نفیس حاضر کروں۔ قصّہ کھوتاہ، آپ کی انتظاری میں چشم بھراہ ہے۔ اپن کو تو لگتا ہے آج کچھ دھرم بھرم ہونے والا ہے۔ سویرے سے مالجادی بائیں آنکھ پھڑک کے جا رہی ہے۔"

"کیا لطیفی صاحب کو بھی بلایا ہے؟"

"نہیں۔"

بہت آگ چلموں کی سلگانے والے

لطیفی صاحب کے حلقۂ معتوبین میں ہم نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ دو مہینے پہلے وہ ہمارے رزق کا دروازہ بند کرنے کی دھمکی دے چکے تھے اور ہم بھی اتنے عاجز آچکے تھے کہ صبح کا سلام تک بند کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز بند کرنا ہمارے اختیار میں تھا بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم دُم دبائے رہتے تھے، لیکن اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ اس پر کسی کو کھڑا ہونے دیں۔ انھوں نے اپنے گرد منتخب روزگار نا اہل جمع کر لیے تھے جو دوسروں کے لیے بھی وہ پسند نہ کرتے تھے جو اپنے لیے ناپسند کرتے تھے۔ یعنی کام۔ ان کا واحد مشغلہ لطیفی صاحب کی ہر ادا اور ہر لطیفے پر لوٹ پوٹ ہونا تھا۔ اور ہم بڑے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے سے اس لیے بھی احتراز کرتے ہیں کہ اگر ہم کسی کی رائے سے اتفاق کریں تو لوگ اُسے احمق سمجھنے لگتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد یہ نہیں کہتے کہ اکبر اَن پڑھ، جاہل یا کاہل تھا۔ فرماتے ہیں "علوم نے اس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی اور فنون نے دماغ پر دستکاری خرچ نہ کی تھی۔" گویا سارا قصور اور تمام تر کوتاہی علوم و فنون ہی کی ٹھیری جو سراسر حرام خوری اور کاہلی پر اُتر آئے تھے۔ لیکن دربارِ لطیفی کے تو نورتن بھی اپنے بادشاہ پر پڑے تھے۔ یعنی عینک وغیرہ کے تکلّفات سے بے نیاز۔

وہ بغیر عینک کے کہاں سے کہاں پہنچ چکے تھے اور ہم؟ ہم، بقول مرزا، معاشرے کی وہ پسلی ہیں جس میں کہنیاں مار مار کے آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے ہیں۔ اب جو ٹھنڈے دل سے محاسبہ کرتے ہیں تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری خواری میں ان کی خصومت سے زیادہ ہماری اپنی ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کو دخل تھا۔ ہم جوان تھے۔ برخود غلط تھے۔ (برخود غلط تو آج بھی ہیں، مگر پہلی خرابی دُور ہو چکی ہے۔) ان کی مسٹر اینڈرسن سے ٹھنی ہوئی تھی اور ہمیں

اس کا قربِ خاص حاصل تھا۔ مطلب یہ کہ ہم جنرل مینجر کے اتنے قریب ہو گئے تھے کہ اس کے غیظ و غضب کی ابتدا ہم ہی سے ہوتی تھی۔ پشتو کہاوت کے بمصداق سانڈوں کی لڑائی میں مینڈک کچلے جاتے ہیں۔ سو ہمارا بھی قیمہ ہو گیا مگر ٹرانا نہ گیا۔ دیکھا جائے تو لطیفی صاحب کو ہم سے کیا عداوت یا رقابت ہو سکتی تھی۔ ان کا ایک ادنیٰ سا افسرانہ مطالبہ تھا جسے ہماری انا سمجھ نہ پائی:

مجھ کو بھی پوجتے رہو تو کیا گناہ ہو

لطیفی صاحب کی عمر ہم سے ۱۲ سال، سُوجھ بُوجھ ۴۴ سال اور تنخواہ ۱۶۰۰ روپے زیادہ تھی۔ لہٰذا اسے صحیح معنوں میں تصادم نہیں کہا جا سکتا۔ ہم خود ریل کی پٹڑی پر انجن کو چیلنج کرنے کے لیے سینہ تان کر لیٹے تھے۔

تڑپے ہے مُرغا قبلہ نما آشیانے میں

اونٹ کی کمر جس روایتی تنکے سے ٹوٹی وہ ان کی کرسچین سکریٹری مس راٹھور تھی جس کے ناوک نے زمانے میں صَید نہ چھوڑا تھا۔ اُن کے مزاج ہی میں نہیں، کام میں بھی دخیل تھی۔ پہلے غزہ ہی غزہ تھا، اب غُرّانا بھی شروع کر دیا۔ ہم سے بھی غرفش کرنے لگی۔ اور بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس یہ نوبت آ گئی کہ

تڑپے ہے مُرغا★ قبلہ نما آشیانے میں

ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے بھی شیشے میں اتار لیتا یا کم از کم خود اتر جاتا کہ یوں بھی عورت کی ایڑی ہٹاؤ تو اس کے نیچے سے کسی نہ کسی مرد کی ناک ضرور نکلے گی۔ مگر اس کو کیا کریں کہ طبیعت ہی غصیلی اور زود رنج پائی ہے۔ التفاتِ دلِ دوستاں نہ رہے، یا کاروبارِ دُنیا ہماری عین مرضی

★ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے، سوداؔ کے مصرع "تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں" کو اسی طرح پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ مطلب یہ بتاتے ہیں کہ ذبح ہوتے وقت مُرغا اپنا مُنھ قبلہ کی طرف کر کے تڑپ رہا ہے!

کے مطابق نہ چلے تو بلبلا اُٹھتے ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں ہوتے تو ہم چوبیس گھنٹے زنجیرِ عدل ہی سے لٹکے رہتے۔ اُس بچارے کا سونا لیٹنا حرام ہو جاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ ہم سدا سے زبان کے پھوہڑ ٹھہرے اور وہ چُغل خور نکلی۔ مولانا احسن مارہروی فرماتے ہیں:

هزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں

وہ ایک قطرۂ خُوں جو رگِ گلو میں ہے

ہمیں یقین ہو چلا ہے کہ یہ فسادی قطرۂ خوں ہماری زبان میں ہے جس پر ہمیں اتنا ہی قابو ہے جتنا عشّاق کو اپنے دِل پر ہوا کرتا ہے۔

یار لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ یہ اسٹینوگرافر دن بھر سامنے بیٹھی اپنے باس کو فرمائشیں ڈِکٹیٹ کرواتی رہتی ہے۔ ہم نے جب دیکھا سوئٹر بُنتے یا موٹی اسامیوں پر مُسکراتے ہی دیکھا۔ مرد کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ چوں مرگ آید تبسّم برلبِ اوست۔ یہاں اگر مرگ کی بجائے مرد پڑھا جائے تو مصرع اس عورت پر بھی چسپاں ہوتا تھا۔ ویسے لطیفی صاحب کا سارا کام زبانی اور بیشتر حکم احکام ٹیلیفون پر صادر ہوتے تھے۔ لکھنے لکھانے کو تکلّف بے جا جانتے تھے حالانکہ بنئے کا مانا ہوا اصول ہے کہ پہلے لکھ، پیچھے دے، بھُول پڑے کاغذ سے لے۔ مس راٹھور کا لقب نہ جانے کیوں اور کب سے "مس رنتھمبور" چلا آتا تھا۔ بڑے بڑے افسروں کے ساتھ نتھّی رہ چکی تھی۔ وجہ تسمیہ ہمیں معلوم نہیں۔ البتہ قلعۂ رنتھمبور کے بارے میں اتنا یاد پڑتا ہے کہ اس پر ہر بادشاہِ وقت نے لشکر کشی کی۔ کسی نے منجنیق سے سر کیا۔ کوئی اسپِ تازی کو ایڑ لگا کے خندق پھلانگ گیا۔ کوئی سنگلاخ فصیل ڈھاتے ڈھاتے خود ڈھے گیا۔ کسی نے شبخون مارا۔ اور کوئی دِن دہاڑے فولادی میخوں کی اَنی کو بلونت ہاتھیوں کے مستک سے موڑتا توڑتا، صدر دروازے کو ریلتا دھکیلتا، پھریرا اڑاتا ہوا قلعہ میں داخل ہو گیا۔ ہم نے تو بس ان معدودے چند بادشاہوں کے نام رٹ لیے تھے جنھوں نے اس قلعہ پر دھاوا نہیں بولا ورنہ امتحان میں ہر بادشاہ کا نام اور اس کے بعد ڈیڑھ دو صفحوں میں رنتھمبور کی رٹی رٹائی لفظی تصویر کھینچ کر لکھ دیتے کہ مذکورہ بالا نے مندرجہ ذیل پر یورش کی۔

ڈیوڑھا آدمی

لطیفی صاحب نہایت ملنسار، زمانہ شناس، خوش خلق اور خوش تدبیر تھے۔ ان کی اہلیت ان کے حوصلوں کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتی تھی۔ سیدھی سڑک سے انھیں سخت الجھن ہوتی تھی۔ ہمہ وقت "شارٹ کٹ" کی تلاش میں رہتے، خواہ وہ کتنا ہی اوبڑ کھابڑ کیوں نہ ہو۔ اس کی تلاش میں اکثر دُگنا وقت لگ جاتا۔ گرمیوں میں بھی واسکٹ پہنتے، اس لیے کہ اس کی جیبوں میں انگوٹھے ڈالے بغیر بات نہیں کر سکتے تھے۔ دشمنوں نے اڑا رکھی تھی کہ چوری چھپے پانچ بسیں چلاتے ہیں جن کی آمدنی کو ہر مہینے گیارھویں کی نیاز دلوا کر پاک کر لیتے ہیں۔ آخر جنّت کا بھی تو کوئی شارٹ کٹ ہوگا۔ نگاہِ بدبیں نے کہاں کہاں ان کا تعاقب نہ کیا۔ اتوار کو دیکھا کہ اینگلو انڈین بھبوکا چھوکریوں کو کار میں بھر کے نہلانے دُھلانے سینڈزپٹ لے جا رہے ہیں۔ ابھی کار کی سیٹیں ٹھیک سے ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی ہوں گی کہ دیکھا اسی کار میں اٹا ٹٹ مولوی ٹھونسے شبینہ پڑھوانے گھر لے جا رہے ہیں۔ اور ڈِکی میں اتنے ہی عدد مرغیاں بھری ہوئی ہیں۔ سنیچر کی رات کو وہ "لا گو رمے" میں اس طرح ڈانس کرتے دیکھے گئے کہ دُور سے تو یہی لگتا تھا کہ ابھی تو پنجے لڑا رہے ہیں۔ دم کے دم میں گتھ مریں گے۔ اور اہلِ درد نے انھیں پاک پتن شریف میں روضہ کی جالی پکڑے اشکبار بھی دیکھا۔ خود ہم نے انھیں ۱۹۵۲ میں جھگیوں میں سات روپے سیر کے بمبئی کے الفانسو آم تقسیم کرتے دیکھا۔ کہتے تھے روٹی تو روکھی سوکھی سب کو مل جاتی ہے۔ قلمی آم غریبوں کو برسوں نصیب نہیں ہوتے۔ بقر عید پر پندرہ بیس بکرے ذبح کرتے تھے تاکہ گورنمنٹ کے بڑے افسروں کو سالم رانیں بھیج سکیں۔ چھوٹے بڑے ہر بزنس مین سے ان کی یاد اللہ تھی۔ سب سے جھک کر ملتے، پورے سے بھی زیادہ سُود وصول کرتے اور تاکید و تقاضے میں بھی شہد★ گھول دیتے۔ اپنا کام نکالنے کا ہُنر جانتے تھے۔ زمین میں ذرا سا سُوراخ کرنا ہو تو پوری طاقت سے کُدال چلانی پڑتی

★ پروفیسر قاضی عبدالقدوس کہتے ہیں کہ تحریر میں بھی سُود کھانے سے لذّت پیدا ہوتی ہے۔ مثال میں ہمیں پیش کر دیتے ہیں۔

ہے۔ لیکن خاک بسر بیج، کومل اکھوے اور نرم و نازک پنیری کس دھیرج سے اسی زمین کو ایک ادا سے رضامند کر کے نکل آتے ہیں۔

لطیفی صاحب کو کامیاب ہونے میں دیر نہیں لگی، اس لیے کہ دُنیا جس زاویہ سے کج ہے اسی زاویہ تک انھوں نے اپنی رفتار و گفتار و کردار میں کجی پیدا کر لی تھی۔ فرماتے کہ "بزنس میں صرف گھاٹا حرام ہے۔ باقی سب چلتا ہے۔ ہر پکڑ، ہر داؤں۔ ارے بابا! یہ تو ایک کھیل ہے۔ ناٹک۔ ہر آدمی سوانگ بھر کے اپنا اپنا ڈائلاگ بولتا ہے۔ کھیل ختم، ڈائلاگ خلاص۔ جھوٹ سچ کا سوال کہاں۔ کٹھ پتلیوں کے لیے کیا پاپ، کیا پُن۔" پیسہ کیسے جُڑتا ہے۔ روپیہ اپنے آپ کو کس طرح ضرب دیتا ہے۔ زر خُدا نہ سہی، لیکن کتنا "غالب و کار آفرین، کار کُشا و کارساز" ہے۔ پیسے سے کیا کیا خریدا جا سکتا ہے۔ ناخنِ زر سے کیسی کیسی گرہیں کُھل جاتی ہیں۔ لکشمی کس کس چیز کی بھینٹ مانگتی ہے ــــــ آدمی یہ بیوہار اور بیوپار بہت قریب سے ساری عمر دیکھتا ہے اور آزردہ و دل گرفتہ نہ ہو تو بڑے حوصلے یا پھر اتنی ہی بے حسی کی بات ہے۔ دو ہی راستے ہیں۔ یا تو آدمی کھرا کھوٹا پرکھنے کی کسوٹی نزدیک ترین گٹر میں پھینک کر نچنت ہو جائے یا پھر سارے سنسار سے ناتا توڑ کر اپنی ذات کی گپھا میں اپنا نروان آپ ڈھونڈے۔ یونانی دیومالا کی دیوی میڈوسا گارگن نے زمین کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد نور سے بنے ہوئے دیوتاؤں کو زیر اور خوار و زبوں کرنا تھا۔ کوئی آدم زاد اسے قتل نہیں کر سکتا تھا، اس لیے کہ جیسے ہی اس کے چہرے پر نظر پڑتی، آدمی پتّھر کا ہو جاتا تھا۔ آخر کار، پرسی ئیس نامی ایک جوان شہزادے نے یہ ترکیب نکالی کہ اپنی جلا کی ہوئی ڈھال میں اس کا عکس دیکھ کر تلوار کے ایک ہی وار سے سر تن سے جُدا کر دیا۔ تو صاحبو! یہ دُنیائے دَنی اس وقت تک دِلوں کو پتّھر میں تبدیل کرتی رہتی ہے جب تک انسان کسی آدرش یا عقیدے کی سِپر میں عکس دیکھ کر اس کی شہ رگ نہ کاٹ دے۔ اور ایک بار پھر اس خرابے کو انسانوں کے رہنے کے لائق بنا دے۔

نذرِ ارسطو

لطیفی صاحب ہی کا قول ہے کہ زندگی کے ہر درد کا مداوا، تمام مصائب کا حل کسی نہ کسی انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے کہ درحقیقت انسان ہی مسبب المصائب ہے۔ اور وہی مُشکل کُشا۔ لہٰذا اسی کا دامن تھامو۔ اسی سے مدد چاہو۔ پھر بیڑا پار ہے۔ ان کی اپنی نیّا نہ صرف منجدھار پار کر چکی تھی بلکہ ریگستانی ساحل کے میلوں اندر گھس گئی تھی۔ اتوار کی صبح کو دلّی کی نہاری پر بیس پچیس مسبب المصائب مدعو ہوتے۔ قوالی اور کاک ٹیل کے دلدادہ تھے۔ اکثر فرماتے کہ "آدمی کی یہی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ان تقریبوں میں دونوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ (جو داں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے) کامیاب بینکر بننے کے لیے پچہتّر فی صد یاری، پچاس فی صد عیّاری اور پچیس فی صد نہاری درکار ہے۔" عرض کیا "جناب! یہ تو ڈیڑھ سو فی صد ہو گیا۔" بولے "اور کیا! یہ پروفیشن تو ڈیوڑھا آدمی مانگتا ہے۔ آدھے پونے آدمی سے کام نہیں چلنے کا۔ یونیورسٹی کی پروفیسری تھوڑا ہی ہے کہ زندگی بھر کتابیں پڑھ پڑھ کے ایک کتاب اور لکھ ماری۔ اجی کہیں گئو سے گئو بھی گیا بھن ہوئی ہے؟ انٹلکچوئل لوگ اسپیڈو میٹر دیکھنا جانتے ہیں، اسٹیرنگ وہیل نہیں سنبھال سکتے۔ قسم خدا کی! اگر ارسطو آج قبر سے اُٹھ کر آجائے اور اس مارکیٹ میں کپاس کی ایک گانٹھ بھی دو پیسے منافع پر بیچ لے تو میں اپنی بھنویں مُنڈوا دوں۔" (مونچھیں پہلے ہی کسی ایسی ہی شرط پر نذرِ ارسطو کر چکے تھے۔ سر پر بھی شرط لگانے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔)

جُملۂ تیموریہ

ماتحتوں کو اس پیشہ کی نجابت، نفاست اور نجاست سے متعلق نصیحتیں کرتے رہتے۔ گاہے ماہے مہربان ہوتے تو چاندماری کے لیے ہمیں بھی منتخب فرماتے۔ ان کے ڈیوڑھا آدمی ہونے میں کِسے کلام ہو سکتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے انھیں لنچ پر سالم مُرغی کھا کر اپنی سکریٹری کے سامنے انگلش کریم پر دست درازی کرتے دیکھا ہے۔ ہم نے آج تک اتنے قراٹے

زور اور اعتماد سے کسی انگریز کو بھی غلط انگریزی بولتے نہیں دیکھا۔ صحیح املا و تلفظ کو اپنے مرتبۂ افسری سے پست جانتے تھے۔ ان کا ہر جملہ، جملۂ تیموریہ ہوتا تھا ــــ یعنی لنگڑا اور حملہ آور۔ ان کی دیکھا دیکھی ماتحتوں نے بھی اپنی انگریزی میں شرعی عیب پیدا کر لیے۔ سندھی میں بڑے مزے کی کہاوت ہے کہ کبھی ایک ٹانگ والوں کے دیس میں جاؤ تو اپنی ایک ٹانگ کندھے پر رکھ لو۔ ہم نے تو بہ نظر احتیاط اپنی انگریزی کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دی۔ بلکہ اعضائے رئیسہ بھی کاٹ کر پھینک دیئے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اس اپاہج پن سے آگے چل کر ہمیں بے شمار فائدے ہوئے جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ خود آپ نے دیکھا ہوگا کہ خاندانی فقیر اور دُور اندیش بھکاری اپنے بچّوں کے ہاتھ پاؤں عالمِ شیر خوارگی میں ہی توڑ دیتے ہیں تاکہ بڑے ہو کر بچّوں کو روٹی کمانے میں آسانی رہے اور ماں باپ کے محتاج نہ رہیں۔

طعن و تشنیع سے ہماری کافی اصلاح ہوئی۔ کتابی باتوں سے احتراز کرنا سیکھ لیا۔ ان جیسے کامیاب لوگوں کی مصاحبت و مجالست کا یہ اثر ہوا کہ ہم نے کتابیں پڑھنے سے توبہ کی اور کتاب لکھنے کا تہیہ کر لیا۔ بچپن کے کھلونے ٹوٹتے ٹوٹتے ہی ٹوٹتے ہیں۔ ڈلن تھامس نے غلط نہیں کہا تھا کہ میں نے جو گیند باغیچے میں کھیلتے ہوئے اُچھالی تھی وہ ابھی تک زمین پر واپس نہیں آئی۔

لطیفی صاحب کا چال چلن نارمل تھا یعنی ویسا ہی جیسا کہ ہمارے ہاں نارمل آدمی کا آسانی سے کامیابی اور دولت حاصل ہونے کے بعد ہو جاتا ہے۔ ازدواجی زندگی کو عمر قید سمجھتے تھے، یعنی محبّت بامشقّت۔ مشہور امریکی سفیر اور ماہرِ اقتصادیات پروفیسر گالبریتھ اپنی چٹخارے دار کتاب "سفیر کی ڈائری" میں یورپ میں تعینات ایک رنگین مزاج امریکی سفیرِ کبیر کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ موصوف ہر مسئلہ، ہر مشکل کا سامنا بند ذہن اور کھلے ازار بند سے کرتے تھے۔ لطیفی صاحب بینکنگ کے پیچیدہ ہی نہیں، غیر پیچیدہ مسائل بھی اسی طریقے سے حل کرنے لگے تھے۔

انھیں ایک دفعہ اچانک رخصت پر کلکتہ جانا پڑا اور ہم ان کے قائم مقام مقرر ہوئے تو حسینوں کے فون اور خود حسین متواتر پندرہ دن تک آتے رہے۔ ڈان کھوٹے کے رازداں خدمت گار کی

طرح ہم بھی عصمت دہندگان کی فہرست بڑی محنت سے مرتب کرتے رہے۔ گھڑی تو وقت کا حساب رکھتی ہے۔ وقت سے لطف نہیں اٹھاتی۔ سولھویں دن وہ خود آ گئے۔ اور ہماری قائم مقامی ختم ہوئی۔ حیف در چشم زدن صحبتِ بد آخر شد۔

فردِ جُرم

اتنا طویل تعارف اس لیے اور ناگزیر ہو گیا کہ جب ہم مسٹر اینڈرسن کے حضور لرزاں و ترساں پیش ہوئے تو دیکھا کہ نشہ کو غصّہ نے سہ آتشہ کر دیا ہے۔ اور وہ لطیفی صاحب کو ناقابلِ اشاعت گالیاں دے رہا ہے۔ عجیب عجیب بہتان لگا رہا ہے۔ کہنے لگا کہ میں نے جو رسّی دراز کی تھی، وہ اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن گئی۔ وہ کمیشن کھاتا ہے۔ بسیں چلاتا ہے۔ بینک کے ذریعہ درآمد کیا ہوا سوا روپے گز کا جاپانی لٹھا بالا بالا اپنے "بینامی" پارٹنر کو ۵ آنے گز میں بیچ دیا۔ بینک کے فرنیچر سے میک نیل روڈ پر اپنی گرل فرینڈ کا پلش فلیٹ فرنش کرایا ہے۔ بے شمار قرضے بلا اجازت و ضمانت دیے۔ جن کے سُود کے حساب سے تم رات کے بارہ بجے تک مغز مارتے رہتے ہو۔ اور تو اور مسٹر ——— وزیر حکومت پاکستان کے نام ایک لاکھ روپے کا قرض دکھا کر ایک نئی کمپنی کے شیئرز خریدے جن پر ڈیڑھ لاکھ کا منافع ہوا۔ انکوائری ہوئی تو وزیر نے صاف انکار کر دیا کہ فارموں پر سرے سے میرے دستخط ہیں ہی نہیں! یہی نہیں، لطیفی ایک کاک ٹیل پارٹی میں بلیک ٹائی کے بجائے لاؤنج سوٹ پہن کر گیا اور بینک کی بھد اُڑوائی۔ ایک سنگین الزام ان پر مسٹر اینڈرسن نے یہ بھی لگایا کہ انھوں نے ہیڈ آفس سے اجازت لیے بغیر اپنی سکریٹری کے سینڈل کی اونچی ایڑی دو دو انچ کم کرا دی تھی! فردِ جرم سنانے کے بعد مسٹر اینڈرسن نے مطلع کیا کہ کل شام بورڈ آف ڈائرکٹرز نے مسٹر لطیفی کو برخاست کر دیا۔ یہ تلوار تو اس کی گردن پر ایک نہ ایک دن گرنی تھی۔ قتل میں عجلت کی فضیلت پر اس نے اپنے "فیورٹ کریکٹر" میکبتھ کا قول دُہرایا (اسکول کے اسٹیج پر میکبتھ کے رول میں وہ خود کو کئی مرتبہ کامیابی کے ساتھ قتل کروا چکا تھا):

"If it were done when 'tis done, then t'were well if it were done quickly..."

پھر ہدایت کی کہ اسی وقت میری کار میں بینک جا کر اس کی تجوری، الماریاں اور میز کی دراز میں اور جو کچھ تمھیں اس کا نظر آئے ——— سیل کر دو۔ اس کے حمایتیوں کے مُنھ بھی۔ چٹ پر اپنے دستخط کر کے چپکا دینا اور صبح ٹھیک نو بجے اس سے کیش کا چارج لے لینا۔ وہ باسٹرڈ مجھ سے چارج لینے کے "ڈے ڈریمز" دیکھا کرتا تھا۔ ہا ہا ہا! روپیہ اور عورت کبھی میری کمزوری نہیں رہی۔ اور ہاں! نوٹ گِننے کے لیے لعابِ دہن کے بجائے کسی دوسرے سیّال پر اکتفا کرنا۔ تم اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟ ترقی مبارک! تم سے زیادہ اس عہدے کا اہل میرے پاکستانی ماتحتوں میں اور کوئی نہیں۔ مجھے تم سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ گُڈ لک! اور ہاں! صبح اس کی کار بھی اپنی تحویل میں لے لینا۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ تمھیں شیورلٹ کار لے دوں۔ لیکن بڑی کار میں تو تم اور بھی مُنّے سے لگو گے۔

نظام سقّہ

ہم رات کے دس بجے تک ہر الماری، کیبنٹ، دراز اور تجوری پر اپنی دستخطی سلپیں بجاتے گوند سے چسپاں کرتے رہے۔ ازروئے احتیاط ان کے تھرماس پر بھی مہر لگا دی۔ صبح لطیفی صاحب نے ہمیں اپنی کرسی کے کنارے پر نروس بیٹھے دیکھا تو اسے ہماری طبعی شوخی اور دفتری گستاخی پر محمول کیا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے ان کی برخاستگی کا پروانہ پیش کیا۔ بھونچکے رہ گئے۔ انھیں اپنی برخاستگی سے زیادہ ہماری ترقی کا صدمہ تھا۔ اور جھوٹ کیوں بولیں، ہماری مسرت کی بھی ترتیب بالکل یہی تھی۔ جس ڈائرکٹر نے سنیچر کی شام کو ان کی برطرفی کی قرارداد بورڈ سے بعجلت منظور کروائی تھی، اس نے اتوار کی صبح کو ان کے ساتھ دلّی کی نہاری کھائی اور دِن بھر ڈکاریں لے لے کر رمی کھیلی۔ ہنٹ "تک نہ دیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لطیفی صاحب نے جھنجھل میں چابیاں اس سیاہ میز پر، جو کل تک ان کی اور آج ہماری تھی، اتنے زور سے پھینک کر ماریں کہ میز پر

لگے ہوئے دبیز شیشے میں ایک سورج سا بن گیا جس کی کرنیں دُور دُور تک پھیل گئیں۔ پہلے اس شیشے میں ہمیں اپنی ایک ہی تصویر نظر آرہی تھی۔ ٹوٹا تو ایک ایک کرچی میں اسی کا جلوہ تھا۔ میں ہی آیا نظر، جدھر دیکھا۔ وہ بغیر کچھ کہے سُنے چل دیئے۔

دِن بھر ہم اپنے نئے فرائض نہایت جوش اور تندہی سے انجام دیتے رہے۔ رات کو ٹھاٹ سے لطیفی صاحب کی کار میں گھر گئے اور اپنے کوارٹر کی دہلیز پر اس وقت تک قدم نہیں رکھا جب تک باوردی شوفر نے اُتر کر دروازہ نہ کھولا۔ بچّوں نے لالٹین کی روشنی میں ہماری کار اور ترقی کا ہر زاویہ سے معائنہ کیا۔ انھیں ڈرائیور کی ٹوپی بہت پسند آئی۔ بیگم نے مڈگارڈ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ ہلکا سبز رنگ مجھے شادی سے پہلے بھی پسند تھا۔ ماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا، بیٹا! تم نے آج بھی روٹی کھائی یا نہیں؟

دوسرے دن یوم آزادی کی تعطیل تھی۔ ہم نے سب احباب اور اپنے تمام بہی خواہوں کو دلی کی نہاری کھلائی اور "آنکھ کا نشہ" کھیل دِکھایا۔ ۱۵ اگست کو دفتر پہنچے تو ایک کرُسی پر ایک ڈائرکٹر کے مُنھ چڑھے افسر نور علی نجم الدین کھانڈ والا کو بیٹھے دیکھا۔ ہماری ہر الماری، کیبنٹ، دراز اور تجوری پر ان کی دستخطی سلپ چسپاں تھی۔ حد یہ کہ ناک میں ڈالنے کے "ڈراپس" کی شیشی جو ہم میز پر بھول گئے تھے، اس پر بھی لال چپڑی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ہم انھیں اپنے تخت ہمایوُنی پر متمکن دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ انھوں نے اپنی تقرری اور ہمارے تبادلہ کا پروانہ دکھایا۔ مسٹر اینڈرسن سے پرسوں سہ پہر کو ایک گھنٹے تک ہماری گفتگو ہوئی تھی۔ "ہنٹ" تک نہ دیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہم نے چابیاں اس سیاہ میز کے سُورج پر، جو پرسوں تک ہماری اور آج ان کی تھی، پھینک کر ماریں اور بغیر کچھ کہے سُنے چل دیئے۔

ہم آکر اپنی پرانی میز پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد مسٹر اینڈرسن خود ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے "تمھارے بغیر جنرل مینجر کا آفس سُونا سُونا لگتا ہے۔ ویلکم بیک ہوم! تم سے زیادہ اس عہدے کا اہل میرے پاکستانی ماتحتوں میں کوئی نہیں۔ مجھے تم سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ میری ڈریسنگ ٹیبل میں نیا آئینہ لگوا دو۔ بدذات بلّی نے توڑ دیا ہے۔ بیچوں بیچ سُورج سا بن گیا ہے۔ ایک زخمی ہاتھ

کے بجائے سو زخمی ہاتھ نظر آتے ہیں۔"

رات گئے، حسبِ معمول بس کے ڈنڈے میں بانہیں حمائل کیے، گھر آئے۔ بیگم نے پُوچھا کار کہاں گئی؟ بچّوں نے پوچھا کیا ڈرائیور بھی چھین لیا؟ ماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا، بیٹیا! تم نے آج بھی روٹی کھائی یا نہیں؟

نظام سقّہ کو اس کی مشک واپس مل گئی۔

(پردہ گرتا ہے)

موصُوف

شیشے کی آنکھ

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی زندگی میں ہی قصہ کہانی بن جاتے ہیں۔ انواع واقسام کی خوبیاں اور خرابیاں اس سے منسوب تھیں۔ کوئی کہتا ہم نے مسٹر اینڈرسن کو کبھی مُسکراتے نہیں دیکھا۔ مُنھ لال، ہونٹ کنجوس کے بٹوے کی مانند ہمیشہ بند۔ پر دِل کا بُرا نہیں۔ بلغمی مزاج کا انگریز ہے۔ محض اپنا گلا صاف رکھنے کی خاطر چیختا رہتا ہے۔ منظور اس سے قطع محبّت نہیں اسے۔ دوسرا کہتا چوبیس گھنٹے نشے میں چُور رہتا ہے۔ آنکھ کھُلتے ہی پینا شروع کر دیتا ہے۔ صبح ڈرائیور اور جمعدار اجمل خاں سہارا دے کر کار سے اُتارتے ہیں۔ کار میں بھی ایک اسٹپنی بوتل ساتھ رکھتا ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ شام کو بیرا اپنے ہاتھ سے پلاتا ہے۔ رات کو بستر پر فیڈنگ بوٹل سے پیتے پیتے سو جاتا ہے۔ تیسرا کہتا کہ ایک آنکھ شیشے کی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کی یادگار۔ لیکن خان سیف الملوک خاں تو ہمارے سرِ عزیز کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ دونوں شیشے کی ہیں۔ بس انگریز کا اقبال ہے! نصیر فاروقی سے روایت ہے کہ ایک آنکھ نیلی اور دوسری سبز تھی۔ ماں آئرش اور باپ اسکاٹ تھا۔ لیکن یہ وہ بھی نہیں بتا سکتے تھے کہ کون سی آنکھ مادری ہے اور کون سی پدری۔ چہرے کی طرف نگاہ بھر کے دیکھنے کی یہاں کس میں تاب تھی۔ لکشمن بھی تو سیتا کو چہرے سے نہیں پہچان پائے تھے۔ اس لیے کہ اُن کی نگاہِ باادب کبھی پیروں سے اوپر نہیں اٹھی تھی۔

وہ بلا کا مغلوب الغضب، سخت گیر، بدزبان اور بدلحاظ مشہور تھا۔ سُنا ہے سُود خور کی آنکھ میں مروّت نہیں ہوتی۔ طوطا چشم ہم اس لیے نہیں کہیں گے کہ طوطا چشم سے طوطا چشم طوطا کم از کم اپنی مادہ کا چہرہ تو پہچان لیتا ہے۔ لیکن بنکیر، خواہ کہیں کا ہو، اس کی آنکھ چہرے نہیں، صرف نوٹ پر چھپی ہوئی شبیہ کو پہچانتی ہے۔ مارک ٹوین نے ایک شقی القلب بنکیر کا خاکہ اڑایا ہے، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک آنکھ شیشہ کی ہے۔ لیکن یہ کبھی تحقیق نہ ہو سکا کہ دائیں یا بائیں۔ کسی نے مارک ٹوین سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ دائیں۔ پوچھا، یہ کیسے؟ بولا دائیں آنکھ یقیناً شیشے کی ہے اس لیے کہ اس میں مروّت کی جھلک نظر آتی ہے!

ہماری انمول گھڑی

۳ یا ۴ جنوری ۱۹۵۰ کا ذکر ہے۔ ہم نے بنک میں قدم رکھا تو دبیز گرم تھری پیس سُوٹ میں ملبوس تھے جس کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ واسکٹ کی جیب میں ایک نہایت قیمتی سونے کی گھڑی تھی جو ہماری پرسنلٹی کے پسماندہ حصّوں سے جو سُوٹ سے باہر نکلے رہ گئے تھے قطعی لگاّ نہیں کھاتی تھی۔ یہ نواب سر ابراہیم علی خاں، والیٔ ریاست ٹونک، نے ۱۹۲۸ء میں ابا جان کو بخشی تھی اور انھوں نے ہمیں بی۔ اے میں یونیورسٹی میں اوّل آنے پر تحفتہً دی تھی۔ سونے کی زنجیر اتنی لمبی تھی کہ ابتدائے ملازمت میں ہم اس کی کڑیوں پر بنک کا حساب اس طرح کرتے تھے جیسے چینی اپنے COUNTING BEADS پر۔ بٹن دباتے ہی یہ دھیمی دھیمی بجنے لگتی اور ائے کے ساتھ گھنٹے بجانے کے بعد تحت اللفظ میں کوارٹر (پندرہ منٹ) بھی بتاتی۔ صبح آنکھ کھولے بغیر وقت معلوم کرنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ ایک روز ہم دن کے بارہ بجے اسے کان سے لگائے وقت کی مدھر تان سُن رہے تھے کہ موصوف آنکلے۔ کہنے لگے، دفتری اوقات میں یہ بیل گاڑی کا مترنم پہیّہ کان میں گھیڑنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ اس محاکاتی تنبیہ کے بعد ہم ترنم سے وقت سننے کے بجائے دیکھنے لگے۔ اور موسیقی سے خواہ وہ ٹائم پیس یا فائر بریگیڈ کے الارم ہی کی کیوں نہ ہو، اجتناب کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ خود کو دفتری ماحول کا

اس حد تک خوگر کر لیا کہ جب تک آکسیجن میں فائلوں کی بُو شامل نہ ہو، سانس لینے میں دُشواری محسوس ہونے لگی۔

اس سُوٹ اور گھڑی کا ذکر قدرے تفصیل سے یوں بھی کرنا پڑ رہا ہے کہ سونے کے بٹن بیچ کر مکان کی پگڑی دینے کے بعد "یہی کچھ ہے 'ساقی' متاعِ فقیر"۔ اتنا ضرور ہے کہ فقیر اور سادھو سنیاسی کوٹ پتلون کی کھکھیڑ میں نہیں پڑتے۔ اختصار سے کام لیتے ہیں۔ بعضے بعضے تو اپنا مُنہ داڑھی سے چھپا کر تن پر فقط بھبوت مل لیتے ہیں۔ اپریل کا مہینہ آیا تو واسکٹ اتر گئی۔ مئی میں چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگا تو کوٹ بھی تہ کر کے رکھ دیا۔ جُون تک پتلون میں رفو ہی نہیں، اندر ریلیشیا کا استر بھی لگ چکا تھا۔ قمیصوں کے کالر کے "چگّی داڑھی" نکل آئی جس کی روز حجامت کرنی پڑتی تھی۔ جوتوں سے ہویدا تھا کہ چشم بددُور، ہمارا انگوٹھا بیل کی کھال سے کہیں زیادہ مضبُوط ہے۔ یہاں ہم اپنے افلاس و انکسار کی شیخیاں مار کر اپنی ناشگفتہ بہ حالت کی داد نہیں چاہتے۔ بس گزارشِ احوالِ واقعی منظور ہے، ورنہ بقول حالیؔ

مصیبت کا اِک اِک سے احوال کہنا
مصیبت سے یہ ہے مصیبت زیادہ

وہ اِک مردِ مسلماں تھا

۲۶ جون ۱۹۵۰ کو روزے کی حالت میں ابّا جان پر ٹنڈو آدم میں اچانک دِل کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ کسی عطائی نے نہ جانے کیا سمجھ کر کونین کا انجکشن لگا دیا اور وہ آن کی آن میں سارے بکھیڑوں، بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔ جے پور ریاست کے "مقامی" مسلمانوں میں وہ پہلے گریجویٹ تھے۔ جے پور میونسپلٹی کے چیئرمین، اسٹیٹ مسلم لیگ اور دیگر مسلم تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے صدر اور اسمبلی کی حزبِ اختلاف کے لیڈر رہ چکے تھے۔ اسمبلی ہی میں سقوطِ حیدرآباد پر پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر انھیں ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ سادہ دل، بے ریا، پابندِ شرع، فقیر منش اور زبان کے کھرے تھے۔ دِل کی بات

زبان پر لانے میں انھیں ذرا بھی نہیں سوچنا پڑتا تھا۔ موروثی جائیداد سے وہ اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ راجستھان میں مسلمانوں کے دیرینہ و بے لوث خدمت گزار اور تحریکِ پاکستان کے سپاہی کی حیثیت سے سبھی نہیں جانتے پہچانتے تھے۔ انتقال کے بعد کسی اللہ کے بندے نے ان کی میّت ٹرک میں رکھ کر حیدر آباد پہنچا دی۔ غریبِ شہر کی لاش تین چار گھنٹے تک سڑک کے کنارے جون کی لُو میں اس انتظار میں بے گور و کفن پڑی رہی کہ اگر کوئی وارث ہے تو آئے اور مٹی کے اس ڈھیر کو پہچان کر لے جائے۔ ان کے خُدا نے ان کی بے کسی کی شرم رکھ لی۔

دوسرے دن غروبِ آفتاب سے ذرا دیر پہلے سیدھے حیدر آباد کے مُچھیلی قبرستان پہنچے تو کافی انتظار کے بعد قبر آدھی بندگی جا چکی تھی۔ ان کا چہرہ پُرسکون تھا۔ زردی نے ماتھے پر سجدے کے نشان کو زیادہ واضح کر دیا تھا۔ ایک جھلک دیکھی۔ پھر اس کے بعد کچھ نظر نہ آیا۔ انتقال سے کچھ دن پہلے وہ چند گھنٹوں کے لیے کراچی آئے تو ٹاٹ کے ایک تھیلے میں اپنا کھانا ساتھ لائے تھے کہ تنک حوصلہ بیٹے نے جو رزق تلاش کیا اس میں سُود کی آمیزش تھی۔ زندگی میں جس نے ان کی کوئی خدمت نہ کی، اسے انھوں نے کندھا دینے کی سعادت سے بھی محروم رکھا۔ قبر پر نہ گلابوں کی چادر نہ چنبیلی کا ڈھیر۔ نہ گھر پر آہ و بکا کا شور۔ وہ تھے تو گھر اتنا بے سر و سامان نظر نہیں آتا تھا۔ ماں نے سر پہ ہاتھ رکھا اور کلائی کو میلی چادر سے چھپا لیا۔

اب اپنے خاندان، بے روزگار بھائی اور اس کے بیوی بچے، بہن اور اس کے کنبے، اور ان کے گرد گھومنے والے طفیلی سیّارے ——— ان سب کی خورد و نوش کا انتظام، بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ فاقہ کروانے کی اخلاقی ذمّہ داری ہم پر عائد ہوتی تھی۔ ایک دن یونہی خیال آیا تو مشقی سوال کے طور پر ہم نے اپنی تنخواہ کو کنبے کے لواحقین اور لواحقین کے متوسّلین پر تقسیم کیا تو مقسوم ۲۳ روپے پونے چار آنے نکلا۔ کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایک آدمی ۲۳ روپے میں بسر اوقات کر سکتا ہے۔ حساب میں یقیناً کوئی غلطی ہو گی۔ گھڑی کی زنجیر کے کمپیوٹر پر چیک کر کے دیکھا تو وہی جواب آیا۔ زندگی ہندسوں سے کہیں زیادہ لچک دار نکلی۔ انسان بڑا سخت جان ہے۔

ان اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ ستودہ کی زیادہ تشریح و تشہیر یہاں اس لیے بھی غیر ضروری ہے

کہ سارا اردو لٹریچر ——— از ولی دکنی تا ایں دم ——— قناعت اور مفلسی کے فائدوں اور فضیلتوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمیں محمد جان چپراسی کی قسمت پر بڑا رشک آتا تھا۔ اس کی تنخواہ ستّر روپے تھی اور چھڑا دم۔

ان کی گھڑی کو بخار چڑھا

نوابی گھڑی اب واسکٹ کی جیب سے نکل کر پتلون کی جیب اور طلائی زنجیر بیگم کے گلے میں پہنچ چکی تھی۔ ایک دن ہم موصوف کے سامنے پیش ہوئے تو استفسار فرمایا:

"What's this big abscess on your thigh?"

اس دن سے ہر شخص ہمارے اس اُبھار کو وقت بتانے والا پھوڑا کہنے لگا۔

اخروٹ توڑنے کا، اخروٹ ہی کی لکڑی کا بنا ہوا، خوبصورت زنبور آپ نے دیکھا ہوگا۔ موصوف کے پاس شخصیت توڑنے کا ایسا ہی کوئی آلہ تھا۔ ہمارا چھلکا کبھی کا تڑخ چکا تھا۔ گری البتہ محفوظ تھی۔ روٹی بھر طور کما کھانے کا بکھیڑا نہ ہوتا تو مچھندر خود کو اس وقت بتانے والے پھوڑے سمیت کبھی کا دریا بُرد کر چکا ہوتا۔ واقعہ سخت تھا پر اہل و عیال کی جان بھی عزیز تھی:

وہ جاں پہ بنی ہے کہ جئے بن نہ رہا جائے

گھر میں کوئی اور گھڑی بھی نہ تھی۔ اور گھڑی بغیر ہم ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے۔ گھڑی کا سب سے بڑا فائدہ یہ دیکھا کہ ہر منٹ یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ ہم کتنے لیٹ ہو چکے ہیں۔ ایک دن حیدری صاحب کو ہم پر ترس آگیا اور انھوں نے از خود پیش کش کی کہ وقت نما پھوڑے کا میری رسٹ واچ سے تبادلہ کر لو۔ میں اسے اپنے مالک مکان راجہ صبح صادق کو دے آؤں گا۔ اسے ANTIQUES جمع کرنے کا بڑا خبط ہے۔ چار مہینے سے مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے۔ روز اپنے پٹھان چوکیدار کو بھیج دیتا ہے۔ بچارا شریف آدمی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ علی الصبح گھر کے سامنے پانچ دس منٹ ڈنڈا بجا کر چلا جاتا ہے۔

ہم بھی دُبدھا میں پڑ گئے۔ حیدری صاحب نے یہ گھڑی مبلغ ٦٠ روپے میں ایک پائلٹ کے ذریعہ عدن سے منگائی تھی جسے اس زمانے میں اسمگلروں کا باغ عدن کہا جاتا تھا۔ ایسی گھڑی اب خلانوردوں کے پاس ہو تو ہو، اس زمانے میں زمین پر چلنے والے کے پاس ہم نے نہیں دیکھی۔ تاریخ، دن، مہینہ، سنہ، چاند کی منزلیں، ہائی اور لوٹائیڈ (جوار بھاٹے) کا حال، سمت، سیکنڈ اور گرینچ مین ٹائم بتاتی تھی۔ ڈائل کو پٹ کر کے کلائی پر الٹی باندھ لیں تو جسم کا، ورنہ چت حالت میں کمرے کا درجہ حرارت، اور اللہ جانے کیا کیا افشا کر دیتی تھی۔ ڈائل پر متفرق معلومات کا وہ طومار تھا کہ اگر محض وقت ہی معلوم کرنا ہو تو دو منٹ لگ جاتے تھے۔ چند دن تو یہ اپنے اوراد و وظائف کی پابند رہی، پھر اپنی اوقات یعنی سراسر حرام خوری پہ اُتر آئی۔ حیدری صاحب گھڑی کے بہت پابند تھے۔ جیسے ہی ان کی گھڑی صبح کے پانچ بجاتی، ان کا ایک پیر بینک کے اندر اور دوسرا باہر ہوتا۔ اس وقت لندن کی گھڑیاں بھی پانچ ہی بجا رہی ہوتی تھیں۔ پاکستانی گھڑیاں پانچ گھنٹے تیز چلتی تھیں۔ وقت پر دفتر آنے کی بدعت کے وہ کبھی مرتکب نہ ہوئے۔ اپنی گوناگوں خدمات کا معاوضہ وہ ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے دھروا لیتی تھی۔ وہ اس صورت میں کہ پانچ چھ مہینے تک حیدری صاحب اوسطاً تیس روپے ماہوار اس کی مرمّت پر خرچ کر کے ہمارے مقروض ہوتے چلے گئے۔ تبادلے کی پیش کش اسی زمانے کی بات ہے۔ یہ آلہ واٹر پروف بھی تھا۔ اپنی سیلزمین شپ سے ہمیں اکثر للچاتے کہ آپ پانچ سو فٹ گہرے پانی میں ڈوب جائیں، تب بھی یہ گھڑی ایک ہفتے تک بند نہیں ہوگی۔ اگر آپ قطبِ شمالی میں سکونت اختیار کر لیں تو مقناطیسی اثرات سے مفلوج نہیں ہو گی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ واقعی سوفی صد واٹر پروف ہے، حیدری صاحب بینک پہنچتے ہی اسے پانی کے گلاس میں ڈبو دیتے اور شام کو گھر جاتے وقت نکال کر کلائی پر باندھ لیتے تھے۔ دن بھر ہر آئے گئے کو گلاس اُٹھا اُٹھا کر غرقاب گھڑی کی کارکردگی دکھاتے۔ شکّی مزاج والوں کو گھڑی کان سے لگا کر سنواتے کہ چلتی بھی ہے۔ گلاس ہلاتے تو جوار بھاٹے اور چڑھتے چاند کا حال بھی بتا دیتی۔ ایک مہینے کی غرقابی کے بعد یہ گھڑی وقت کے سوا ہر چیز ٹھیک بتانے لگی۔

ہر چیز سے ہماری مراد تاریخ، دن اور سنہ ء ہیں۔ جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حیدری صاحب صبح دفتر پہنچتے ہی گھڑی کو کیلنڈر سے ملا لیا کرتے تھے۔ جن دنوں ہماری گھڑی واسکٹ سے پھسل کر پتلون کی جیب میں پہنچی، قریب قریب اسی زمانے میں یہ گھڑی گلاس سے نکل کر قمیض کی جیب کی زینت بنی۔ درجات بلند ہوتے ہوتے یہ آرائشی مقام حاصل کر چکی تھی۔ کسی بہتر ملازمت کے انٹرویو کے لیے جانا ہو، یا اسٹیٹ بینک کے ناخداؤں سے مُڈبھیا ہو تو کلائی پر اس کا امام ضامن باندھ کر نکلتے۔ کف کی اوٹ سے صرف اسٹریپ نظر آتا تھا۔ ڈائل کا رُخ اپنی ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ واپس آتے تو گھڑی کو ۱۰۵ ڈگری بخار چڑھا ہوتا تھا۔

عالیجاہ نے رپٹ لکھوائی

افسوس کہ ان گھڑیوں کا تبادلہ قدرت کو منظور نہ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ سنیچر کی رات کو گھر کے خورد و کلاں، حسبِ مراتب، صحن، برآمدے اور سڑک کے کنارے سو رہے تھے۔ چور نہ جانے کب اور کیسے آئے اور جو کچھ اثاثہ ہاتھ لگا، اٹھا کر لے گئے۔ "جو کچھ" سے ہماری مُراد مذکور الصدر گھڑی اور پتلون ہے جسے پہن کر ہم نے سیکنڈ شو دیکھا تھا اور پھر اپنے کمرے میں نیند سے بے حال، خود کو اس میں سے نکال کر جہاں کی تہاں پڑی رہنے دی۔ خیریت گزری کہ گھر والوں کے کپڑے لتّے چوری نہیں ہوئے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ سب انھوں نے پہن رکھے تھے۔ مرزا عبدالودود بیگ نے بہت منع کیا کہ "غیر رقمی چوری کی رپٹ تھانے میں نہ لکھواؤ۔ شرفا کے لیے یہ بڑی بے عزّتی کی بات ہے کہ گھر میں چور آئیں اور چُرانے کے لیے کوئی رقم ہی نہ نکلے۔" بہرکیف، ہم تھانے میں رپٹ لکھوانے پہنچ گئے۔ ایس۔ ایچ۔ او نے گھڑی کی قیمت پوچھی۔ ہم نے محتاط اندازے کے مطابق پانچ ہزار بتائی۔ چونک کر پوچھا، عالیجاہ کوارٹر کا کرایہ کیا دیتے ہیں؟ عرض کیا ۳۵ روپے۔ ہمارا جواب سُن کر وہ ایک معنی خیز "ہوں! عالیجاہ!" کر کے رہ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں ہر شخص ایک دوسرے کو عالیجاہ پکارتا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب جنھیں عالیجاہ کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا

حوالات میں ہتھکڑی پہنے چٹائی پر مُرغا بنے جوتوں سے اپنی تواضع و تفتیش کروا رہے تھے۔

"اور کیا چوری گیا، عالیجاہ؟"

"کچھ نہیں"

پتلون کا ذکر ہم نے F.I.R. (ابتدائی رپورٹ) میں قصداً نہیں کیا تھا کہ کل کلاں کو مالِ مسروقہ چور کے قبضے سے برآمد ہو جائے تو بھری عدالت میں ہر پیشی پر ہماری پتلون کی نمائش لگائی جائے گی اور اسے EXHIBIT NO.1 کے جھنڈے پر چڑھا کر ہم سے جرح کی جائے گی کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کہ تم واقعی اسے ستر پوشی کے لیے استعمال کرتے تھے۔

"تو گویا دو چور صرف ایک گھڑی چرانے آئے تھے؟" تھانیدار صاحب اپنے ڈنڈے سے کھیلتے ہوئے بولے۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

"انھیں یہ کیسے علم ہوا کہ عالیجاہ کے پاس یہ انمول گھڑی ہے؟"

"خدا بہتر جانتا ہے۔"

"چوری کے کوئی عینی گواہ ہیں؟"

"وہ تو خود چور ہی ہو سکتے ہیں۔"

"اچھا تو آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ دو چور تھے؟"

"چار پاؤں کے نشان تھے۔"

"تو گویا چار پاؤں کا مطلب دو آدمی ہوتے ہیں؟ گھڑی کہاں رکھی تھی؟"

"ہماری پتلون میں۔"

"پتلون کہاں ہے، عالیجاہ؟" انھوں نے ہمارے پاجامے کو، جس میں جمعہ کی نماز کے گھٹنے بنے ہوئے تھے، گھورتے ہوئے پوچھا۔

"چور لے گئے۔"

"ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ کوئی اور چیز چوری نہیں ہوئی۔ اب تفتیش کے دوران آپ

اقبال کر رہے ہیں کہ پتلون بھی چوری گئی۔ یہ تو صاف سرقہ بالجبر دفعہ ۳۹۰ کا کیس ہوا۔ تو گویا واردات کے وقت آپ نے پتلون مسروقہ پہن رکھی تھی؟"

"نہیں۔"

"آپ نے اس سرقہ کو کیوں چھپایا؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں۔"

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اعانتِ مجرمانہ ہے۔ قابل دست اندازیٔ پولیس جرم کو چھپانا بھی جرم ہے۔ آپ پر زیر دفعہ ۱۰۹ تعزیراتِ پاکستان فوجداری مقدمہ چل سکتا ہے۔ مجسٹریٹ اگر ACQUITTING NATURE کا ہوا تو چھ مہینے کی بامشقت ہوگی۔ منشی جی! ذرا اِدھر آیئے۔"

"حاضر ہوا، عالیجاہ!" منشی جی نے تمباکو کے پان کی پہلی پیک ٹیچ سے حوالات کے جنگلے میں تھوکتے ہوئے کہا۔

"اچھا! گھڑی کی رسید لائے ہیں، عالیجاہ؟"

"میں رپٹ لکھوانے آیا ہوں۔" ہم نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ کو معلوم ہے آپ اس وقت کس کے بالمواجہ ہیں؟ آپ نے جب یہ گھڑی مبلغ پانچ ہزار میں خرید فرمائی تو اس کی رسید تو لی ہوگی۔ وہ کہاں ہے؟"

"رسید تو نہیں ہے۔"

"ہوں! منشی جی! یہ تو معاملہ ہی گویا کچھ اور ہے! جلدی آیئے۔"

"حواضر ہوا عوالی واہ!" منشی جی آسمان کی طرف مُنھ کر کے بلبلائے۔ دیر تک پان کی پیک سے گرگل گرگل کرتے رہے۔

۲۱ پیتیں

ہم نے وہیں سے فون پر دُہائی دے کر ایک دوست سے، جو سپرنڈنٹ پولیس تھے،

سفارش کروائی، تب کہیں ہم پر تفتیش کا باب بند ہوا اور گھر جانے کی اجازت ملی۔ ڈھائی گھنٹے تاخیر سے بینک پہنچے۔ کچھ دیر بعد اینڈرسن اِدھر سے گزرا تو ہمیں اچکن پاجامے میں ملبوس دیکھ کر کہنے لگا "بالکل 'جیسی' لگتے ہو۔ گھڑی کی 'اسٹوریج' کے لیے تو تمھیں ایک نہ ایک دن کنگرو کی سی تھیلی آگے لٹکانی پڑے گی"۔

ایسے فقرے وہ اکثر چُست کرتا رہتا تھا۔ خُدا جانے ہمیں جلانے کو انجان بن رہا تھا یا سچ مچ ناواقفِ حال، ایک دن سوکھا سا مُنھ بنا کر پوچھنے لگا کہ مجھے ادھر رہتے بستے تیس پینتیس برس ہو گئے، پر یہ آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ تمھارے ہاں ملازمت کی درخواستوں پر ایک ہی ریفرنس نمبر کیوں دیا جاتا ہے۔ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا تو دو تازہ درخواستیں ہمارے آگے بڑھا دیں جن کی پیشانی پر ۷۸۶ لکھا ہوا تھا۔

ایسے شگفتہ لمحے کم ہی آتے تھے، کیوں کہ وہ دائمی طیش میں رہتا تھا۔ اس کا غصہ بالکل خالص ہوتا تھا۔ یعنی بلا وجہ۔ فون پر بولتا تو تار جل اٹھتے۔ ہر لفظ کی تیوری پر بل، ہر فقرے کی آستین چڑھی ہوئی۔ غبن اگر ڈھاکہ میں ہوا ہے تو ڈانٹ کراچی کے کیشیئر پر پڑ رہی ہے۔ چائے کے کپ میں کسی مکھّی نے خودکشی کر لی تو انسپکٹر آف برانچز سے باز پُرس۔ غرض کہ، بقول مرزا، ہر شخص کی بے عزّتی خراب★ کرتا تھا۔ لوگ رجز پڑھتے ہوئے جاتے اور ہجو کہتے لوٹتے۔ بشیر احمد تو اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے لبریم کی ایک گولی کھا لیتے تھے۔ کہتے تھے کہ لمحہ توہین و تذلیل سے پانچ منٹ پہلے ایک گولی کھا لی جائے تو پھر طبیعت پر ڈانٹ پھٹکار کا ذرا اثر نہیں ہوتا۔ ذرا دیر بعد کمرے سے بے آبرو ہو کر نکلتے تو دو اور کھاتے۔

ملازمت پیشہ آدمی اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ غریب جہاں بھی ہو، یہی درگت بنتی ہے۔ پنجابی میں ایک مثل ہے کہ کاشت کار کی ۲۱ "پتّیں" (عزتیں) ہوتی ہیں۔ ایک آدھ چپراسی کی نذر۔ دو تین اہلمد، سررشتہ دار کی بھینٹ۔ کچھ گرداور قانون گو کے سر صدقے۔ اور وہ جو الگ باندھ کے رکھی

★ بے عزّتی خراب کرنا: مرزا عبدالودود بیگ کے متروکہ وطن چاکسو (خورد) میں بے عزت کرنے یا عزت خراب کرنے کی بجائے بے عزّتی خراب کرنا بولا جاتا ہے، جو ہمیں کہیں زیادہ پُرمعنی و مذلّت معلوم ہوتا ہے۔

ہیں وہ پٹواری پہ نچھاور۔ کاشتکار پھر بھی دو چار بچا کے ہی لے جاتا ہے۔ سفید کالر والے ملازموں کا حشر کچھ مختلف نہیں ہوتا۔

اس کے باوصف وہ سب کے لیے ایک FATHER FIGURE کی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنے قدوقامت سے بڑا لگتا تھا۔ اور اس کی باتیں بھی خشونت و سرزنش میں ایک ادائے دلنوازی و دلداری ضرور تھی۔ آم اگر پہلے تُرش نہ ہو تو پھر کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا۔ سرداری و سرخیلی کی ایک شان رکھتا تھا۔ آرے کے دندانے کُھٹّل کرنے والی سخت اور خوبصورت گرہیں ساگوان کے گٹھیلے اور برف وباراں چشیدہ ہونے کی غمّاز تھیں۔ فہمائش کے کچھ دیر بعد معتوب کو دوبارہ کسی بہانے سے بلاتا اور بلاوجہ نرمی و شفقت سے پیش آتا۔ یہ دِلاسا غالباً اس لیے کہ آئندہ ڈانٹ کے لیے اس کی طبیعت میں تازہ سہار پیدا ہو۔ کشتگانِ تیغِ زبان پھر جگر لختِ لخت کو جمع کرتے۔ نوکِ مژگاں سے رزق کا ایک ایک ریزہ چُنتے۔ پھر چُھری چھُوٹ جاتا۔ آس ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ اور پھر کسی کا حرفِ تسلّی گرتوں کو تھام لیتا۔ یہی ازلی چکّر چلتا رہتا:

چُمکارے، چُمکار کے مارے

مارے، مار کے پھر چُمکارے

جن ملزموں کو سزائے موت سُنادی جاتی ہے، جیل والے ان کی بڑی دیکھ ریکھ کرتے ہیں کہ کہیں زہر نہ کھالیں۔ بلیڈ سے شہ رگ نہ کاٹ لیں۔ دیوار سے سر نہ پھوڑ لیں۔ نیکر سے پھانسی کا پھندا نہ بنالیں۔ چھینک بھی آجائے تو تُرنت ڈاکٹر بلوایا جاتا ہے۔ غرضیکہ ان کی جان کی پُوری پُوری حفاظت کی جاتی ہے تاکہ پھانسی دی جاسکے۔

ہمارا کچّا چِٹھا

ڈسپلن کا خود بھی لحاظ رکھتا تھا۔ ٹھیک پونے نو بجے دفتر آتا۔ دنیا جانتی تھی کہ ALCOHOLIC★ ہے۔ لیکن دفتر میں شراب نہیں پیتا تھا۔ گھر سے پی کر آتا تھا۔ عام طور

★ ALCOHOLIC: شراب نوشی کی عادت جب مرض کی صورت اختیار کر لے۔ دائم الخمر

سے دھاری د   ٹائی لگاتا تھا۔ لیکن کسی سینئر افسر یا مینجر کو ڈانٹنا ہو تو لنچ کے بعد سیاہ بو لگا کر آتا۔ بعض افسر ایسی ہی سادہ لیکن پر وقار تقریب میں "ڈِسمِس" بھی ہو چکے تھے۔ گوشمالی کے بعد یہ ضرور کہتا کہ میں نے تمھاری نا اہلی کا "سیاہ اندراج" اس خفیہ ڈائری میں کر لیا ہے۔ اِس ڈائری کی گہرے عنّابی رنگ کی جِلد، بقول اس کے، اصلی پِگ اِسکن (سوٗر کے چمڑے) کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ "یہ خونخوار سوٗر میں نے اپنے نیزے سے اسکاٹ لینڈ کی ترائی میں مارا تھا۔ بڑا ہی سوٗر تھا۔ ہاں! پاکستانی سوٗر میں چربی کم، مگر سوٗرپن زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم یورپین بڑے شوق سے کھاتے ہیں"۔ جن جن کے کرتوت اس ڈائری میں محفوظ کیے جا چکے تھے، ان کی دِلی خواہش تھی کہ اپنی عادلتِ قبیحہ اور افعالِ شنیعہ کی رُوداد اپنی آنکھوں سے دیکھیں، لیکن سوٗر کی جلد کے کون ہاتھ لگائے۔ چپراسی بھی میز صاف کرتے وقت جھاڑن تک اس پلید شے کے نہیں لگنے دیتا تھا۔ مرزا عبدالودود بیگ فرماتے تھے کہ سُود، شراب، اپنے افسروں کی تاریخِ پیدائش، اور جوُئے کی ہار جیت کا حساب رکھنے کے لیے سوٗر کے چمڑے کی ڈائری سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

ایک سُہانی سلونی صبح کا ذکر ہے۔ ہم کاؤنٹر پر چیک وصول کر کے اس کے بدلے "ٹوکن" دینے کا کام سیکھ رہے تھے کہ ایک مقامی ہوٹل میں رقص کرنے والی آسٹرین کیبرے ڈانسر نے ایک کروڑ پتی صنعت کار کا "بیئرر" چیک بھُنانے کو دیا۔ اس زمانے میں خواتین بینکوں میں خال خال ہی نظر آتی تھیں۔ بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، عورتوں کا قحط الرّجال تھا۔ مطلب یہ کہ کہیں کوئی عورت کار چلاتی یا سگرٹ پیتی نظر آجائے تو لوگ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جیسے دُمدار ستارہ نکل آیا ہو، جس کا مُنھ ان کی طرف ہو اور دُم شوہر کی طرف۔ چیک کے جملہ اندراجات کی جانچ پڑتال کے علاوہ ہمارے سپرد یہ کام بھی تھا کہ چیک پر کیے ہوئے دستخطوں کا موازنہ نمونے کے دستخطوں سے کر کے تصدیق کریں کہ جعلی نہیں ہیں۔ ہم یہ دُہرے تہرے فرائض کس طرح انجام دے رہے تھے، اس کا اندازہ تو قارئین کو آگے چل کر خود ہو جائے گا۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ موصوف حسبِ عادت دبے پاؤں آئے اور ہمارے پیچھے کھڑے ہو کر نہ جانے

کتنی دیر تک ہمارے عالمِ محویت کا نظارہ کرتے رہے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر کبھی "سرپرائز چیکنگ" کو آنکلتے۔ کئی دفعہ چپ چاپ آکر ہمیں بھی دیکھ چکے تھے۔ ہر دفعہ ناقابلِ اعتراض حالت میں پایا۔ اِس دفعہ وہ "آہم" کہہ کے کھنکھارے۔ ہم نے جھٹ چیک کو گھورنا شروع کر دیا۔ فرمایا، اس چیک کی ادائی سے جانبر ہونے کے بعد جنرل منیجر سے ملو۔ موصوف ایسے موقعوں پر اپنی جاب صیغۂ غائب میں اشارہ فرماتے تھے۔

ہم عرقِ خجالت میں غرق پیش ہوئے تو بکمال شفقت فرمایا، تم دوسرے قسم کے فگر پر نظر سے ٹِک مارک لگا رہے تھے! ہم ایسے بن گئے گویا، ہم بُھو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ لہٰذا وضاحت فرمائی کہ تم چیک کے دستخط اس کے چہرے سے COMPARE کر (ملا) رہے تھے!

بعدہٗ نصیحت و تنبیہ۔ نصیحت یہ کہ ینگ مین! ایسی عورتوں کے چہرے جعلی ہوتے ہیں۔ یعنی، ہیں خواتیں کچھ نظر آتی ہیں کچھ۔ ایسے چیک کو تو ترنگل★ سے چھُونا بھی خالی از خطر نہیں تنبیہ یہ کہ میں اِس ہل کے اسٹاک کی ابھی چیکنگ کروا رہا ہوں۔ نیز اس غیر پیشہ ورانہ لغزش کی رپورٹ اس ڈائری میں قلمبند کر رہا ہوں۔ ہمارے پاؤں تلے سے سارا کیریر نکل گیا۔ شبانہ روز کی محنت پر پانی کیا چیز ہے، پورا بحیرۂ عرب پھرتا نظر آیا۔ تین چار دن بعد کُرید سی ہوئی کہ لاکھ سزاوارِ نکوہش سہی، آخر دیکھنا تو چاہیے ڈائری میں لکھا کیا ہے۔ چنانچہ سنیچر کی رات کو ۱۱ بجے کا عمل ہوگا۔ ہم اس کے کمرے میں پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور کانپتے ہوئے ہاتھ پر رومال لپیٹ کر حرام جانور کے چمڑے کی جلد والی ڈائری کھولی۔ ایک ورق۔ دوسرا ورق۔ تیسرا ورق۔ ساری ڈائری کھنگال ڈالی۔ ہر ورق خالی۔ ہر صفحہ سادہ! بجز پہلے صفحے کے جس پر اس کا اپنا نام اور اس کے نیچے چھ سال پہلے کی تاریخ لکھی تھی!

ہماری تنخواہ سے ملکی معیشت کی تباہی

منی سوان کا وہ سنہری دُھند جب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ انگوٹھا چوس کر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

★ ترنگل: (پنجابی) گھاس اُٹھانے اور اتھل پتھل کرنے کا پنجے کی شکل کا آلہ۔

کبھی کا چھٹ چکا تھا۔ بیگم نے ہمیں ایک دن یہ اطلاع دی کہ ہماری تنخواہ ۱۲ تاریخ تک کے لیے بالکل کافی ہوتی ہے تو ہمیں پوپ گریگری پر بڑا غصہ آیا جس نے عیسوی کیلنڈر کی ترتیب و اصلاح کرتے وقت یہ تباہ کن فیصلہ کیا تھا کہ کوئی مہینہ ۲۸ دن سے کم کا نہ ہوگا۔ ظالم کو اصلاح ہی کرنی تھی تو ٹھیک سے کرتا۔ خیر، گرم گرم گرہستی چوٹ تھی۔ ہم نے دوسرے ہی دن اینڈرسن کی اسٹینوگرافر کو ایک درخواست ڈکٹیٹ کروائی جس میں احتجاج کیا کہ جس تنخواہ کا بینک کے چیرمین مسٹر ایم۔ اے۔ اصفہانی نے وعدہ کر کے ہم سے سول سروس سے استعفیٰ دلوایا تھا، اس کے نصف پر ہمیں ٹرخا دیا گیا۔ لہٰذا چار سو روپے کا فوری اضافہ کیا جائے اور بقایاجات ادا کیے جائیں۔ اس لُتری نے غالباً اس کی پیشگی اطلاع اسے دے دی۔ جبھی تو درخواست ٹائپ ہونے سے پہلے ہی اس نے ہمیں طلب کر لیا۔ کہنے لگا بینک کا حال تو اورینٹ ایرویز سے بھی بدتر ہے۔ شیئر کی قیمت کا کریش ہو چکا ہے۔ خسارہ ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک فراڈ بھی ہو گیا ہے۔ بینک فراڈ دراصل اعداد و شمار کی شاعری ہے۔ صبح کیش پوزیشن دیکھ کر گلے میں پھندا سا پڑ جاتا ہے۔ میں خود آج کل ضرورت مند صنعت کاروں اور تاجروں کو اوور ڈرافٹ کے بجائے قیمتی مشورے دے رہا ہوں۔ بینک موجودہ اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں تمھاری تنخواہ کی طرف سے بہت فکرمند رہتا ہوں۔ مگر تم عیالدار آدمی ہو۔ گھٹاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

تنخواہ میں مزید تخفیف کی بشارت کے علاوہ اس نے معاشیات پر لمبا سا لیکچر بھی دیا جس کے دوران رف پیڈ پر ڈائگرام بنا کر ہمیں ذہن نشین کرایا کہ اگر قومی پیداوار میں اضافہ نہ ہو اور تنخواہیں اور اُجرتیں بڑھتی ہی چلی جائیں تو ملک کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔ انگلینڈ اسی طرح برباد ہو رہا ہے۔ ہم اس کے کمرے سے نکلے تو ہرچند ہماری تنخواہ وہی تھی جو کمرے میں داخل ہونے سے پیشتر تھی، لیکن اس خیال ہی سے ایک عجیب طرح کی سرخوشی اور طمانیت محسوس ہوئی کہ ہماری ترقی سے ساری معیشت تباہ ہو سکتی ہے۔

ٹونی صاحب

طنطنے اور دبدبے کا کیا ٹھکانا۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ ایک دن ہم ضرب کرنے کی مشین کو الٹا چلا کر تقسیم کرنے کی اجتہادی کوشش کر رہے تھے کہ چپراسی دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا ٹونی صاب آیا ہے۔ دودھ کے لیے چار آنے چاہئیں۔ ہم نے یہ سمجھ کر کہ شاید ملاقاتیوں کے لیے چائے کا دودھ ختم ہو گیا ہے، فوراً چونی نکال کر اسے دے دی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹونی صاب کو ہم سے متعارف کرانے لایا۔ نکلتا ہوا قد، شربتی آنکھیں، چوڑی چھاتی، کمر چیتے جیسی، نیم وا لب، اُجلے سپید دانت، کھُلتا ہوا چمپئی رنگ۔ اور اسی رنگ کی دُم۔ یہ اینڈرسن کا کُتا تھا جو اس وقت RABIES (باؤلے پن) کے ششماہی ٹیکے کے لیے رچمنڈ کرافورڈ اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ سب اس سے بڑے ادب و تکریم سے پیش آتے۔ اس کے سامنے کوئی اینڈرسن کی غیبت نہیں کرتا تھا۔ کوئی اُسے کتا نہیں کہتا تھا۔ سب ٹونی صاحب پکارتے تھے، سوائے یعسوب الحسن غوری کے، جو اُسے ٹونی میاں کہتے تھے۔ جب بھی یہ بینک آتا تو ہر شخص بچھا جاتا۔ اس طرح ناز برداری کرتا جیسے باس کے بچّے کو چومتے چاٹتے ہیں۔ کوئی سر پہ ہاتھ پھیرتا۔ کوئی تعریفوں کے پل باندھتا۔ کوئی دم اور سر کے قلابے ملاتا۔ اور کوئی اپنے ٹفن کیریر میں سے کلیجی نکال کے کاغذ پہ رکھ دیتا۔ سیلونیز چیف اکاؤنٹنٹ مسٹر گنسا لوز نے ایک دفعہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی کُتیا شیبا کو اس نجیب الطرفین کُتے کے حبالۂ آوارگی میں لانا چاہتے ہیں۔ سپردم بتو مایۂ خویش را۔ اور یعسوب الحسن غوری تو بڑے احترام اور دلجمعی سے اپنا ہاتھ اس سے چٹواتے اور شام تک چٹی ہوئی ہتھیلی کو سینت سینت کر رکھتے اور ہر ایک کو اس طرح اترا اترا کر دکھاتے جیسے قلوپطرہ نے اپنا چوما ہوا ہاتھ دکھایا تھا:

"...and here
My bluest veins to kiss : a hand that kings
Have lipp'd, and trembled kissing."

مُلّا عبدالصمد اور مِس مارجری بالڈ

اس کے لکھے ہوئے نوٹ اور خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا تو پہلے حیرت، پھر بڑی فرحت محسوس ہوئی کہ انگریز بھی غلط انگریزی لکھ سکتا ہے۔ ہماری انگریزی تو، بقول اس کے، گریمر کی گٹھیا میں مبتلا تھی اور دفتری دُھوپ میں ابھی اس کے جوڑ بند نہیں کھلے تھے، لیکن اس کے اپنے جُملے بہت گنجلک اور غیر مربوط ہوتے تھے۔ بعض الفاظ، بلکہ فقرے کے فقرے، اپنے مفہوم سے رُوٹھے رہتے تھے۔ ایک دن شامت جو آئی تو ہم نے اس کے ایک ڈرافٹ میں نیسفیلڈ گرامر کی رُو سے کسی معمولی سے سقم کی ڈرتے ڈرتے نشاندہی کی۔ جھنجلا کر عینک اتار دی اور اس کی ٹانگوں کی آلتی پالتی مارتے ہوئے بولا "کیا نیسفیلڈ کوئی اینگلو انڈین اسکول ماسٹر تھا؟ سولا ہیٹ اور سفید تپلون؟ رائس اینڈ کری کھانے والا؟ افسوس تم نے کسی اہلِ زبان سے انگریزی نہیں پڑھی"۔

عرض کیا "۴۳-۱۹۴۲ میں ہم نے ایک انگریز عورت سے انگریزی پڑھی تھی"۔

فرمایا " Aha ! just as I thought ! جبھی تو مردانہ انگریزی کے تیور نہیں پہچانتے۔ چندے میری صحبت میں رہے تو چھاتی پر گھنگھریالے بال نکل آئیں گے۔ مگر وہ تھی کون؟"

"مِس مارجری بالڈ" ہم نے گردن اکڑا کر کہا۔ اس زمانے میں مِس مارجری بالڈ پر ہم اس طرح فخر کرتے تھے جیسے مرزا غالب اپنے ایرانی استاد مُلّا عبدالصمد پر، جس کے بارے میں جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ غالب کا اُستاد اس کے اپنے ذہن کا زائیدہ تھا۔ دیکھا جائے تو اس سے بہتر استاد ہو بھی نہیں سکتا۔

عجب اتفاق ہے کہ ہم دونوں بے استادوں (یعنی غالب اور راقم آثم) کو اہلِ زبان اُستاد آگرے ہی میں نصیب ہوئے۔ مُلّا عبدالصمد کو پا کر غالب لکھتے ہیں "بارے مُراد بر آئی۔ اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ وارد ہوا اور فقیر کے مکان پر دو برس رہا"۔ افسوس کہ یہ فقیرِ پُر تقصیر اپنی فرنگی نژاد استانی کو دو گھڑی بھی اپنے مکان میں رکھنے سے قاصر تھا اس لیے کہ فقیر خود سینٹ جانس کالج کی ہیلی بری

اقامت گاہ کے تنگ و تاریک حجرہ ۴۲ میں معتکف تھا جس کی واحد کھڑکی چمڑا کمانے کی "ٹینری" کی جانب کھلتی یعنی ہمیشہ بند رہتی تھی اور مہمان کے لیے دروازہ اندر کی جانب صرف اس صورت میں کھلتا تھا کہ دروازے سے لگی ہوئی چارپائی کو پہلے بیٹھ پر اٹھا کر کھڑا کیا جائے۔ پھر واپس بچھانے کے بعد اسی کے نیچے سے گھٹنیوں نکل کر مہمان سے بغل گیر ہوں اور اسی پر بٹھا دیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی (اللہ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے) جن کی کتابوں سے ہم نے اُردو زبان اور قناعت سیکھی، ایسی خام خیالی کے بارے میں مثال دے کر فرما گئے ہیں:

کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں
پر اونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بل میں

لیکن خود مولوی صاحب قبلہ نے غالباً ضرورتِ شعری کے تحت، خلافِ وضعِ شتری، چوہا باندھا ہے۔ ورنہ اونٹنی یا کم از کم چوہیا ہونی چاہیے تھی۔

عینک ماتھے پر چڑھاتے ہوئے بولا "تم نے عورت سے انگریزی کیوں پڑھی؟ کیا مرد دستیاب نہ تھا؟"

"وہ سیر کے لیے ہندوستان آئی تھی۔ اثنائے سیر میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔"

"بہت قابل تھی؟"

"وہ بالوں میں سُرخ ربن باندھتی تھی اور . . ."

"میں کھوپڑی کے باہر کا حال نہیں پوچھ رہا۔"

"کیمبرج میں پڑھا چکی تھی۔ شیلی پر اتھارٹی۔ وقت گزاری کے لیے سینٹ جانس کالج آگرہ میں 'پوئٹری' کی کلاس لینے لگی۔"

"ہا ہا ہا! مرد کا عورت سے شاعری پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عورت، مرد سے دُودھ پلانا سیکھے۔ خوبصورت عورت سے بنکر صرف ایک ہی ڈھنگ کی بات سیکھ سکتا ہے۔ 'نہ' کہنے کا سلیقہ۔ بہرحال، Give the devil his due. تم میرے پہلے انڈین، آئی ایم سوری، پاکستانی ماتحت ہو جو سیمی کولن (؛) استعمال کرنے کا جگرا رکھتا ہے۔ مگر

ایک بات دھیان میں رہے شیکسپیر نامی ایک شخص بھی مجھ سے بہتر انگریزی لکھتا ہے لیکن میں اسے بینک کی خط وکتابت میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

انگریزوں میں بھی دہلوی اور لکھنوی ہوتے ہیں

وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھا۔ ورنہ عام طور سے بحث تو بڑی بات ہے، خوشامد تک کا موقع نہیں دیتا تھا۔ ہم نے یہ موقع غنیمت جانا اور روغنِ قاز کی پہلی بوند ٹپکائی۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اب میں ایک انگریز سے بینکنگ سیکھ رہا ہوں۔"

انگریز کا نام زبان پر آتے ہی بارود خانے میں آگ لگ گئی۔

"آآآآ! (کسی بات کی زور شور سے تردید کرنی ہوتی تو انگشتِ شہادت اُٹھا کر بد لگاتا چلا جاتا تھا) مجھے یہ تو معلوم ہے کہ اسکینڈل، اسٹاف کی غذائے رُوحانی ہے، لیکن میری ولدیت کے بارے میں یہ گمراہ کن اطلاع کس کُتیا کے بچے نے دی؟ میں انگلش نہیں، اسکاٹ ہوں۔ اسکاٹ۔"

انگریزوں کے لیے اس کے دل میں نفرت اور حقارت تھی جو صدیوں پرانی تھی۔

اس فہمائش کے دوسرے دن ہمارا ایک واجبی سا ڈرافٹ دیکھ کر غالباً اشک شوئی کی خاطر کہنے لگا، تم انگریزی خاصی لکھ لیتے ہو۔ اگر شگفتگی سے پرہیز کرو تو کہیں بہتر لکھ سکتے ہو۔

ہم نے جوابی تعریف کی کہ جناب بھی بہت عمدہ انگلش۔ . . . .

لفظ انگلش ہمارے مُنھ سے ابھی ½ ہی باہر نکلا تھا کہ کل کی برہمی یاد آگئی۔ از سرِ نو احتیاط سے جملہ گھڑا کہ جناب بھی بہت عمدہ اسکاچ لکھتے ہیں۔

بارُود خانہ پھر آگ پکڑ گیا۔ کہنے لگا "آآآآ! یہ اطلاع تمھیں کس باسٹرڈ انگریز نے دی۔ میں اسکاچ لکھتا نہیں۔ اسکاچ پیتا ہوں۔ دھڑتے سے لیکن انگلینڈ والوں کی طرح مجھے عورت کی پیاس نہیں لگتی۔ اور ہاں! رابرٹ برنس ★ سے بڑا شاعر انگلینڈ میں پیدا ہوا، نہ ہوگا۔ میں اسکاٹ لینڈ میں پھانسی پانے کو انگلینڈ میں طبعی موت مرنے پر ہزار بار ترجیح دوں گا۔

★ اسکاٹ لینڈ کا ایک قدیم شاعر

اسکاچ پر یاد آیا کہ وہ کبھی گلاس میں برف نہیں ڈالتا تھا۔ کہتا تھا برف جگہ بہت گھیرتی ہے۔ اس کے بیرے بندوخاں سے روایت ہے کہ "میں نے صاب کو کبھی نخالص پانی پیتے نہیں دیکھا۔ بولتا ہے لوکل پانی میں ڈِسنٹری کے کیڑے ہوتے ہیں"۔ انھیں وہسکی سے مار کے ان کی یخنی پیتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے بندوخاں سے پوچھا، صاب کو کبھی پانی کی پیاس لگتی ہے؟ بولا، کیوں نہیں لگتی؟ کیا وہ انسان نہیں ہے؟ جب شراب کی طلب ہوتی ہے تو گلاس میں پہلے دو پیگ وہسکی انڈیلتا ہے، پھر پانی ڈالتا ہے۔ لیکن جب پانی کی پیاس لگتی ہے تو گلاس میں پہلے پانی انڈیلتا ہے، پھر دو پیگ وہسکی۔

وہ ایک تحفہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

کرسمس بڑے اہتمام سے مناتا تھا۔ بندوخاں کا بیان تھا کہ صاب جولائی کی پہلی تاریخ سے وہسکی میں پانی ڈالنا بند کر دیتا ہے۔ کہتا ہے اب کرسمس آ رہا ہے۔ دسمبر کی ۱۹ یا ۲۰ تاریخ سے دفتر آنا اور کھانا بند کر دیتا اور ۵، ۶ جنوری تک فلیٹ میں مدہوش پڑا رہتا۔ اس کے بعد کلینک میں بے ہوش۔ زیارت کنندگان وہاں بھی نذر نذرانے لے کر پہنچ جاتے تھے۔ کرسمس کے دن قمر کورٹ (جس میں اس کا فلیٹ تھا) کے پھاٹک پر ڈالیوں سے لدے ہوئے افسروں اور قرضداروں کا کیو لگ جاتا۔ وہی پینڈے کے بیچ میں کوہان والی ٹوکری (تاکہ تھوڑے سے پھل بھی زائد از گنجائش معلوم ہوں)۔ رنگین کاغذوں اور پنّی کی کترنوں میں لپٹے ہوئے پانچ چھ قسم کے پھل اور ان کے نیچے حلال کی کمائی سے کشید کی ہوئی حرام شے کی بوتل۔ جس کا جتنا بڑا قرضہ ہوتا اتنا ہی بڑا وہسکی کا کریٹ۔ پتھّر پوجے ہر★ ملے تو میں پوجوں پہاڑ۔ ایک سے زیادہ کریٹ کا مطلب ہوتا کہ رقم کب کی ڈوب چکی۔ اب اتنی ہی اور درکار ہے۔ ایک کرسمس پر ہماری بھی رگِ اطاعت پھڑکی اور ہم "میری کرسمس" کہنے اس کے فلیٹ پہنچے۔ شاہ مراد کر تھیا تھیا تُخن گی شر مادن کیا۔

قمر ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں بندوخاں بیرا چارپائی ڈالے پڑا تھا۔ ادوان پر پھلوں کا ایک ٹوکرا

★ ہر (ہندی) خدا۔

دکھاتھا اور پائے سے ایک دُکھیاری سی ٹرکی بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنا نام اور غایتِ ملاقات بتائی تو کہنے لگا، ڈالی کہاں ہے؟ ہم نے کہا، ہم تو محض ملنے آئے ہیں۔ فرمایا، تو ایسے بولو کہ کرسمس پہ عید ملنے آئے ہو! وہ تو ایک ہفتے سے بستر پہ لمبا لیٹا ہے۔ سر میں سخت سر درد ہے۔ (گویا سر میں دردِ گردہ بھی ہو سکتا ہے۔) چاہ دانی سرہانے پڑی ہے۔ اور اس کی جھکتی ٹی کوزی سر پہ اوڑھے، آنکھوں پہ انگیا ★ پہنے پڑا ہے۔ تہوار کے دن صبح سے اپنے دادا کو یاد کر کے بُھوں بُھوں روئے چلا جا رہا ہے۔ یہ لو، اپنا نام لونڈے کی سلیٹ پہ لکھ جاؤ۔ اسی پہ دس روپے نقد رکھ دو۔ ڈالی اور بوتل اپن کا ذمہ۔

ہمارے شکوک رفع کرنے یا ممکن ہے 'یرکانے' ✪ کی غرض سے وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں تیس چالیس ڈالیاں تلے اوپر، اور ڈیڑھ دو سو بوتلیں اپنی گردنوں میں وزٹنگ کارڈ لٹکائے پڑی تھیں۔ کہنے لگا، ان میں سے جونسی پسند ہو بتا دو۔ صاب کو ہوش آتے ہی تمھارے نام سے پریزنٹ کر دوں گا۔ چالیس روپے کا کام دس روپلی میں بن جائے گا۔

ہم واپس آنے لگے تو بولا، چلو تین روپے میں سودا ختم کرو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ منہ اندھیرے ایک کلرک بابو رنچھوڑ لائن سے پَیر پَیدل آیا تھا۔ دُکھیا کی چار سال سے ترقی رُکی ہوئی ہے۔ تین جوان چھتی بیٹیاں چھاتی پہ بیٹھی ہیں۔ لطیفی کا سالا ان سے مسخری کرتا تھا۔ اس نے منع کیا۔ اس پہ لطیفی قصائی نے اس کی نرائن گنج بدلی کرا دی ہے۔ یہیں اودان پہ بیٹھا سسکیوں سے رو رہا تھا۔ یہ ٹرکی دے گیا ہے۔ اب مری کہ اب چلی۔ میں اس کی ٹانگ میں تمھارے نام کی پرچی باندھ کر "ہیپی کرسمس!" کر دوں گا۔

ہم نے کہا "میاں! اس غریب کی سفارش کر دو۔ بیٹیوں کی عزت آبرو کا سوال ہے۔"

بولا "اصل سوال تو جورو کے بھائی کا ہے۔ لونڈا ہی تو ہے۔ وہ جو پرانی کہاوت ہے نا کہ جس گھر میں بیری اور جوان بیٹی ہو، اس میں پتھر آویں ہی آویں۔ پر اب تو قربِ قیامت کا زمانہ

★ BLINKERS مراد ہیں۔ یہ چرڑواں ٹکلیاں سوتے وقت روشنی سے بچنے کے لیے آنکھوں پر باندھ لیتے ہیں۔

✪ یرکانا (پنجابی) رعب داب ڈال کے دبانا اور کام نکلوانا۔

آن لگا ہے۔ پتھّر سے پہلے خود لونڈے گھس آویں ہیں!"

ہم نے تحفے تحائف کی "کرسمس کلیرنس سیل" کا ذکر خان سیف الملوک خاں سے کیا تو انھوں نے ہماری لاعلمی پر غم و غصہ کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کہ تحفے طوائف دینے کا دستور تو بگڑے ہوئے رئیسوں کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ وہ کون سا نواب تھا جس نے اپنے بیٹے کو سولھویں سالگرہ پر تحفے میں لونڈی دی تھی؟ اور یہ تو بینک کے مینجر سے لے کر مہتر تک سب کو معلوم تھا کہ تحفے کیسے ٹھکانے لگائے جاتے ہیں۔ اینڈرسن کو اس کا ہوش کہاں کہ کون کیا دے گیا۔ ہر سال کرسمس پر ڈیڑھ دو سو بوتلیں آجاتی ہیں۔ ان کو یہ بیرا تین برابر کی ڈھیریوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک تہائی بازار میں اونے پونے بیچ آتا ہے۔ دوسری ڈھیری خود پی جاتا ہے۔ بقیہ ⅓ کا یہ کرتا ہے کہ جب اینڈرسن بازار سے وہسکی منگواتا ہے تو اسی اسٹاک میں سے قیمتاً سپلائی کرتا رہتا ہے۔

بُندو خاں کی زبانی

بُندو خاں نے ہی ایک دن بتایا کہ موصوف پہلے تو صرف شب کو اپنا گنجینۂ گوہر کھولا کرتے تھے، لیکن اب صبح دم ہی دروازۂ خاور کھول کے بیٹھ جاتے ہیں۔ کہنے لگا کہ اب تو بوتل سے مُنھ لگا کے نخالص پیتا ہے۔ نہ سوڈے کا ٹنٹا نہ گجک کا بکھیڑا۔ پر کتنا ہی نشے میں کیوں نہ ہو، کسی کی تنخواہ نہیں بڑھاتا۔ صفائی بڑے صاب کا جزوِ ایمان ہے۔ ہماری تمھاری طرح ہر جگہ بلغم تھوکتا نہیں پھرتا۔ کھانسی آتی ہے تو رومال میں تھوک کر جیب میں رکھ لیتا ہے۔ پہلے تو دن میں دو دفعہ باتھ لیتا تھا لیکن ایک شام نہاتے نہاتے ٹب میں سو گیا۔ اَپن تو انگریز کی پرائیویٹ لائف میں دخل نہیں دیتے۔ صبح آنکھ کھلی تو مجھے آرڈر دیا کہ ہمارا اڈنر لگانا مانگتا۔ اب ڈاکٹر بٹر فیلڈ نے بھرے ٹب میں سونے کی ممانعت کر دی ہے۔ پٹرے پر کھڑے ہو کر ہماری تمھاری طرح غسل کرتا ہے۔ مَیں نے تام چینی کا مگ لا کر دے دیا ہے۔ اسی میں بیئر پیتا ہے۔ میں تو اب اسی میں انڈا ابال کے اسی کے آبِ جوش سے شیو کرواتا ہوں۔ اسی میں بیڈ ٹی پیوے ہے۔ اسی سے نہاوے ہے۔ جیسی رُوح ویسا غسلِ میت۔ اَپن تو انگریز کی پرائیویٹ لائف میں دخل نہیں دیتے۔

پھر کتے کے سر پہ ہاتھ رکھ کے حلفیہ بیان کیا، ٹونی کی قسم! بڑا صاب نشے میں اتنا دھت ہو رہا ہے کہ اس ٹیم تو مُرغی اور مور میں بھی فرق نہیں کر سکنے کا۔ البتہ خود حرامی مور ہی دُم اٹھا کے ناچنا شروع کر دے تو یہ اس کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اِتّی پینے لگا ہے کہ کھانے کو حرام سمجھے ہے۔ کلفٹن کے سارے مچھّروں نے دُور دُور سے مہاجرت کر کے صاب کی مچھّر دانی میں پیر الٰہی بخش کالونی بنالی ہے۔ کس واسطے کہ وِن کو بھی شرابی خون کی لت پڑ گئی ہے۔ بھنے سیکٹرو، نئے نئے خُون پینے والے مچھّر تو کاٹتے ہی بے سُدھ ہو کے وہیں پَیٹ سے گر پڑیں ہیں۔ سویرے گُل مسیح مہتر جھاڑو سے سیمنٹ کے گٹر میں پھینک دیوے ہے۔ شرابیوں کا یہی روزِ حشر ہووے ہے۔ بڑا صاب اور ٹونی ایک ہی کمبل تلے رین بسیرا کریں ہیں۔ کیا بتاؤں، بڑا ہی محبّتی کتا ہے۔ رات بھر صاب کے گلے میں ٹانگ ڈال کے سووے ہے۔ پر اَب وہ حرامی پلّا بھی دارو پینے لگ گیا ہے! ہم نے پوچھا، تم نے اپنی آنکھ سے ٹونی کو شراب پیتے دیکھا؟ بولا، نہیں۔ مسلمانوں کی طرح چھپ کے پیوے ہے! ذرا زیادہ چڑھ جائے تو دو ٹانگوں پہ کھڑا ہو کے صاب لوگوں کی طرح ناچنے لگے ہے۔ کبھی کبھی مست ہو کے کلفٹن کی طرف نکل پڑے ہے۔ وہاں ایک اونٹنی سے فرینڈلی ہو جاوے ہے۔ ہم نے پوچھا، تمھیں کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ کتا اس وقت پیئے ہوئے ہے۔ بولا میں اسے روز شام کو دوسری کوٹھیوں کے سامنے ٹائلٹ کرانے لے جاتا ہوں۔ اُدھر کے کُتّے اِدھر استنجے کو آویں ہیں۔ جس دن ٹونی پیئے ہوئے ہو تو حضرت پیر کلمبر شاہ کی درگاہ کی طرف ہرگز نہیں جاتا۔ چاہے کاٹ ڈالو۔

اکلوتے بیٹے کا استقبال

ہمیں اپنے دن مقررہ بارہ برس سے پہلے ہی پھرتے نظر آئے۔ دو سال گزرے ہوں گے کہ ہم اس کے مقرّبِ خاص سمجھے جانے لگے، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم وہ معزز موم کے پُتلے تھے جسے آتشدان کے سامنے قریب ترین کرسی پر جگہ دی گئی تھی۔ حاکم کے قُرب و کربِ حضوری میں مبتلا تھے۔ لیکن جن دیواروں سے ہمارا سر ٹکرایا وہ موم کی بنی ہوئی نہ تھیں۔ ہم اس کے مصاحب

مشیر اور مطعونِ اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی خواری اور حاسدوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ کر رہے تھے، لیکن اس کے عادات و اطوار سے پوری طرح واقف نہ ہوئے تھے۔ چار بجا چاہتے تھے۔ وہ گیارہ بجے کا نکلا اب دفتر لوٹا تھا۔ ہم کسی کام سے اندر گئے تو دیکھا کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ ناک رواں تر۔ نچلا ہونٹ لٹکا ہوا۔ آواز اور ہاتھ میں رعشہ۔ کہنے لگا، معاف کرنا، میں ذرا جذباتی ہو رہا ہوں۔ میرا اکلوتا بیٹا دس سال بعد آج رات B.O.A.C. سے ہانگ کانگ سے آ رہا ہے۔ بہتیرا منع کیا ہوائی جہاز سے نہ آؤ۔ مگر آج کل کے سر پھرے نوجوان کسی کی سنتے ہیں؟

ہم نے باہر آ کر ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ بینک کے جتنے بڑے افسر تھے، اور وہ بھی جنھیں بڑے ہونے سے روک رکھا تھا، سب نے ایئرپورٹ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جہاز رات کے ڈھائی بجے آ رہا تھا۔ لوگ گوٹے اور پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے ـــــ کوئی ٹیکسی میں، کوئی کسی کے ساتھ لد کر، اور کوئی مانگے تانگے کی کاریں ـــــ بارہ بجے ہی ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ ہمارے پاس نہ ٹیکسی کا کرایہ تھا، نہ کسی اللہ کے بندے نے ہمیں لفٹ دینا گوارا کیا۔ لہٰذا گھر پر ہی پڑے سنّاتے رہے۔

صبح دفتر پہنچے۔ سب غائب۔ نو بج کر دس منٹ پر رجسٹر میں سب کی غیر حاضری لگا کر غیر حاضرین کی طویل فہرست ہم نے حسبِ معمول اینڈرسن کے پاس بھیج دی اور اس نے اسی وقت اس ریمارک کے ساتھ لوٹا دی کہ اتنے منظم طریقے سے غیر حاضر ہونے پر ان سب سے تحریری جواب طلب کیا جائے۔ ساڑھے دس بجے یہ حضرات دفتر پہنچے۔ جسے دیکھو بپھرا ہوا۔ غیظ میں آنکھیں لہو کے جام۔ جہاز ڈھائی بجے رات کے بجائے صبح نو بجے پہنچا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ کراچی اترنے والے مسافروں میں کوئی ایسا نہ نکلا جو خود کو اینڈرسن کا بیٹا تسلیم کرنے پر آمادہ ہو۔ ایک ایک سے پوچھ دیکھا۔ ایک سر پھرے سے تو استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ یعسوب الحسن غوری کی مارکٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی:

"آپ کا کیا نام ہے؟" یعسوب الحسن غوری نے اس کی آستین پکڑ کر پوچھا۔

"ہنری ہالنگ ورتھ"

"کیا مسٹر اینڈرسن آپ کے والد ہیں؟"

سب نے ہمیں نرغے میں لے لیا۔ کسی نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ گال بھی سینڈ پیپر ہو رہے تھے۔ ایئرپورٹ سے سیدھے بینک آ کر نہار منہ ہم پر غصے ہونے لگے۔ کوئی ٹیکسی کا کرایہ مانگنے لگا اور کوئی رات بھر کی جگار کا تاوان۔ یعقوب الحسن غوری نے تو قیمت بتا کے گلابوں کا ہار ہمارے گلے میں ڈال دیا حالانکہ ہمیں موتیا پسند ہے۔ یورش نے شدت اختیار کی تو ہم اینڈرسن کے پاس گئے اور جی کڑا کر کے پوچھا:

"سر! رات آپ کے صاحبزادے تشریف نہیں لائے۔"

"کس کے صاحبزادے؟" اس نے کان پر ہاتھ کا کپ بنا کر سوال سمجھنے کی کوشش کی۔

"آپ کے۔ جو ہانگ کانگ سے B.O.A.C. سے آنے والے تھے۔"

"آ آ آ! کیا تم پیئے ہوئے ہو؟ میں آج پہلی مرتبہ یہ خوشخبری سن رہا ہوں کہ میرا کوئی بیٹا بھی ہے! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ And Hongkong of all the places! یہ بھی نہ سوچا کہ جو ہوائی جہاز سے سفر کرے وہ کم از کم میرا نطفہ نہیں ہو سکتا۔"

بات کہاں سے یہاں تک آ پہنچی تو ہم نے بھی ہوائی جہاز کی مذمت اور ریل کے سفر کی تعریف کی، جو کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی، اس لیے کہ گاڑھا گاڑھا دھواں اور چنگاریاں چھوڑتے ہوئے انجنوں کی سُریلی سیٹی میں ہنوز بچپن کی یادوں کی مٹھاس گھلی ہوئی ہے۔ ابھی نکٹے ڈیزل انجنوں کے گلے نہیں بیٹھے تھے۔ اس روز ہم پر منکشف ہوا کہ "الکھا لک" کی اپنی ایک الگ MAKE-BELIEVE (خیالی) دنیا ہوتی ہے۔ بعضوں کی قسمت میں وہاں بھی رونا دھونا لکھا ہے۔

فری میسنری کی ایک جھلک

وہ پہنچا ہوا فری میسن تھا اور اسکاٹش لاج اور گرینڈ لاج کے اعلیٰ ترین عہدوں مثلاً

ڈسٹرکٹ گرینڈ ماسٹر پر فائز رہ چکا تھا۔ ایک دن مجھے بلا کر کہنے لگا "کل اتوار ہے۔ بینک ہاؤس آکر ذرا "لاج" کے اکاؤنٹ چیک کر لو۔ ایک غبن ہو گیا ہے۔ حیدری پھر رخصت پر ہے۔ اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ ورنہ تمھیں زحمت نہ دیتا" کیسی زحمت۔ کہاں کی زحمت۔ یہاں تو خود ایک مدت سے یہ جاننے کے آرزومند تھے کہ جادو گھر میں آخر فری میسن کرتے کیا ہیں۔ طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں مشہور تھیں۔ مثلاً یہی کہ کام جائز نہ ہو تب بھی ایک دوسرے کی اخلاقی مدد کرتے ہیں۔ مسٹر بہرامجی نے جو خود بڑے پائے کے فری میسن تھے، ہمیں یہاں تک لالچ دیا کہ لندن میں ہمارا اپنا اسپتال ہے جہاں فری میسنوں کے پتے اور گردے مفت نکالے جاتے ہیں۔ ربڑ کے مصنوعی ہاتھ جتنے چاہو مفت لگوا لو۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ فری میسن سے مصافحہ کریں تو کسی مخصوص انگلی کے کوہان (KNUCKLE) کو انگوٹھے سے اس طرح دباتے ہیں کہ مصافحہ کنندہ کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنی ہی برادری کا آدمی ہے۔ ایک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جس رات "ماسٹر" کی تیسری ڈگری دی جاتی ہے تو سب فری میسن برادران قمیضیں اتارے ہیکل سلیمانی کے سامنے ہرن کی کھال باندھ کر ایک سفید چادر کے گرد ناچتے ہیں جس پر ایک انسانی کھوپڑی اور اس پر ایک موم بتی رکھی ہوتی ہے۔ پتلون کا صرف ایک پائینچہ ہوتا ہے، دوسرا جڑ سے غائب۔ لاج کے دروازے پر ایک گارڈ یہی حلیہ بنائے ننگی تلوار کھینچے پہرہ دیتا ہے۔ حالانکہ ایسے شمشیر برہنہ حلیے کے بعد ننگی تلوار کا تکلف بالکل غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ کوئی فری میسن مر جائے تو، بقول مرزا، "مرے کی مشہوری کے لیے" تعزیتی جلسہ ہوتا ہے جس میں ایک مصنوعی تابوت بنا کر لاج میں رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر برادری کا سرپنچ جملہ برادران کے نام پکارتا ہے اور وہ باری باری "حاضر، برادر مکرم! حاضر برادرِ معظم!" کہتے ہیں۔ مرحوم کا نام تین دفعہ پکارنے کے باوجود کوئی جواب نہیں آتا تو ہز وَرشپ فل ماسٹر میت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "برادرِ عزیز! معلوم ہوتا ہے تم وفات پا گئے"۔ اب اگر کوئی نکّی مزاج آدمی میت کی نبض دیکھے تو پھر بھی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اپنے وہم کا علاج کر رہا ہے، لیکن مصنوعی میت سے سوال جواب تو منکر نکیر بھی نہیں کرتے۔ پھر پسماندگان ایک دوسرے کو دلاسا دیتے ہیں۔ کسی نے یہ بھی بتایا کہ اگر کوئی شخص فری میسنری کی رسوم و عوائد کا بھید کھول دے تو اس کی زبان گدی سے

کھینچ کر چیل کوّوں کو کھلا دی جاتی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہ آئی۔ اس لیے کہ اگر راز کی پوری پوری حفاظت کرنی منظور ہے تو افشا کرنے سے پہلے سب کی زبان کاٹ دینی چاہیے نہ کہ بعد میں۔

اب ہر امیدوارِ کرم، فری میسنوں سے ربط ضبط بڑھانے کی تگڑم لڑانے لگا۔ جسے دیکھو مصافحے کے وقت بڑے آدمیوں کا ہاتھ اس طرح دبا رہا ہے جیسے اردو فلموں میں ہیرو، ہیروئن کا دباتا ہے۔ جب سے یہ سُنا کہ ایک فری میسن دوسرے فری میسن کو کبھی ڈِسمس نہیں کرتا، یہ کیفیت ہو گئی کہ جو فی الحال بے ایمان نہ تھے وہ بھی بربنائے دوراندیشی فری میسن بننے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ ادھر داخلہ محدود و مشروط۔ ایک بدنام کیشیئر البتہ ہرن کی کھال سے ستر اور کیش کی کمی کی پردہ پوشی کر چکا تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہی ریت چلی آئی ہے کہ جو مشرب حاکم کا سو اپنا۔ بلکہ بعضوں نے تو جوشِ عقیدت میں مشروب تک اپنا لیا۔ تزکِ جہانگیری میں آیا ہے کہ اجمیر شریف میں غسلِ صحت کے بعد جہانگیر نے ازراہِ عقیدت اپنے کانوں میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نام پر موتیوں کے حلقے ڈال لیے۔ یہ دیکھ کر تمام ارکینِ سلطنت، اعیانِ دربار اور نمک خوارانِ قدیم نے اپنے کان چھدوا لیے۔ (واضح رہے، کان چھدوا لیے، غسل پھر بھی نہیں کیا۔ ورنہ جہانگیر اس باب میں یوں خاموشی اختیار نہ کرتا۔) اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے، اکبر پاک پتن شریف کے نواح میں شکار کھیل رہا تھا کہ یکایک ایک درخت کے نیچے اس پر جذبے کا عالم طاری ہوا۔ شکار سے تائب ہوا اور اسی درخت کے نیچے، دربارِ اکبری کے الفاظ میں، بادشاہ نے "وہیں بیٹھ کر سر کے بال منڈوا لیے اور جو مصاحب بہت مقرّب تھے، خوشامد کے اُسترے سے خود بخود مُنڈ گئے۔"

کوّل نے ہاف بائلڈ انڈا دیا

فری میسن لاج کے اکاؤنٹ کے سلسلہ میں تین چار دفعہ اس کے فلیٹ جانا پڑا تو اس کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے آئے جن سے صرف گھر کے ملازم، جانی دشمن اور بیوی واقف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک اتوار کو بندو خاں نے بتایا کہ کل ساری رات قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا اپنے جانی

دشمن مسٹر لطیفی کو گالیاں دیتا رہا۔ ڈانٹتے ڈانٹتے آواز بیٹھ گئی تو آئینے پر مس ریمزڈن★ کی لپ اسٹک سے مسٹر لطیفی کی تصویر بنائی۔ پھر گاف کے ڈنڈے اور گیند سے اس پر چاندماری کرنے لگا۔ کھڑکی دروازوں کے سارے شیشے اور کراکری ٹوٹ گئی۔ سفید بلّی کے سر پر بھی ڈنڈے سے ہٹ لگائی۔ پھر گیند ہاتھ میں لے کر اسے (گیند کو) ڈانٹنے لگا کہ حرامجادی اب میاؤں میاؤں بھی کرنے لگی۔ ٹونی یہ توڑ پھوڑ دیکھ کر بھونکے چلا جا رہا تھا۔ آخر کو ایک ہٹ ایسی لگائی کہ گیند سیدھی حلق کے 'ہول' میں گھس گئی۔ گیند کے سوا کوئی چیز سالم نہیں بچی۔ صبح چار بجے مسٹر لطیفی کو روشندان سے باہر پھینک کر ڈسمس کیا، تب کہیں چین سے سویا۔ ہم نے پوچھا بندو خاں! تم تو انگریزی نہیں جانتے۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس نے مسٹر لطیفی کو ڈِسمس کر دیا۔ کہنے لگا صبح چار بجے گھنٹی بجا کر اس نے مجھے سرونٹ کوارٹر سے بلایا۔ میں جانگیہ پہنے سو رہا تھا۔ بھاگم بھاگ اس کا پرانا ڈریسنگ گاؤن پہن کر آیا تو اسے صرف کالی بو پہنے، ٹوٹے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ بولا، بندو خاں! ذرا چیک کرو۔ ککو کلاک میں سے یہ کوئل بار بار کیوں نکلی پڑ رہی ہے۔ کیا ہاف بائلڈ انڈا دینا مانگتی ہے؟ اچھا! اب تم ہم کو یہ بینک کی چابیاں دے کر ایکدم چارج ہینڈ اوور کرو۔ میں نے چابیاں اٹھا کر پکڑا دیں تو جانتے ہو کیا کہنے لگا؟ بولا "مسٹر لطیفی! یو آر فائرڈ!"

ہم نے پوچھا، تمھیں فائرڈ کا مطلب بھی معلوم ہے؟ بولا، بابو جی! ہم نے کبھی کسی چیڑ قنا ئے کالے صاب کی غلامی نہیں کی۔ ساری عمر انگریزوں کی چاکری کی ہے۔ درجنوں سونے کے تغمے ملے۔ میں نے ان سب کو کلابتوں میں پرو کے ان کا ہار مس فرینڈز کی ہپی برتھ ڈے پر پریزینٹ کر دیا۔ پونہ میں ایک انگریز کرنل کی گورنس تھی۔ ایک سے ایک رَس بھری ہوا کرے تھی ان دِنوں۔ آج کل کی چھوکریاں تو ان کے سامنے پچکے ہوئے آم لگیں ہیں۔ ہم نے آج تلک مالک کو گالی کا جواب اور سو روپے کا حساب نہیں دیا۔ پر ہم ایک دم وفادار، نمک حلال آدمی ہے۔ ہماری آنکھ میں لحاظ ہے۔ بندہ کبھی چور اچکّوں کی طرح استعفےٰ دے کر خود نہیں بھاگا۔ ہمیشہ عزت کے ساتھ فائر ہوا۔

ہم نے پوچھا "پھر پانچ سال سے یہاں بے عزتی کی روٹی کیوں کھا رہے ہو؟"

★ مس ریمزڈن: تعارف کے لیے آخری باب "موصوفہ" ملاحظہ ہو۔

"پونے پانچ سال سے کہو۔"

"مگر آخر کیوں؟"

"بابوجی! مالک تو درجنوں کے حساب سے ٹانگ کے نیچے سے نکال دیئے۔ پر ایسا جنٹلمین آدمی نہیں دیکھا۔ جو دل میں وہی زبان پر۔ سٹری سٹری گالی دیتا ہے پر دل میں کھوٹ کپٹ نہیں رکھتا۔ پیسہ ایک نہیں بچاپاتا۔ کبھی کسی میم سے بات نہیں کرتا۔ سبزی کے ہاتھ نہیں لگاتا۔ ہفتے میں ایک روز عبادت۔ حساب اور کسرت کبھی نہیں کرتا۔ خدائی قسم! ساری حرکتیں مسلمانوں کی سی ہیں۔"

"پھر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟"

"مَیں تو جانوں نائی کے اُسترے سے ڈرے ہے۔"

ایڈوائزر کے فرائض

ایک دن صبح نو بجے ہی طلب کر لیا۔ فرمایا "تمھاری عینک کا نمبر صحیح ہے؟" ہم نے اثبات میں اوپر نیچے سر ہلایا۔ استفسار فرمایا "کیا مَیں ہاتھی سے کوئی مشابہت رکھتا ہوں؟ BE FRANK"

ہم نہ صرف نفی میں دیر تک دائیں بائیں سر جھلایا کیے بلکہ "بی فرینک!" کے اتباع و تعمیل میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کی ناک تو بلکہ کچھ زیادہ ہی چھوٹی ہے۔

ارے صاحب وہ تو بگڑ گیا۔ گویا شیمپین کی بوتل کا کاگ اڑا تھا کہ منہ سے جھاگ ہی جھاگ نکلنے لگے" LOOK HERE میں اپنی ناک کے بارے میں اپنے ماتحتوں کے سرٹیفکیٹ کا محتاج نہیں۔"

ہم گردن جھکائے چُپ چاپ باہر آگئے۔ اسے ہماری دل شکنی کا احساس ہوا ہوگا۔ جبھی تو دس منٹ بعد پھر بلایا اور خلافِ معمول سامنے بٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں اپنے بے بس ماتحت کو منانے کی کوشش کی: "سنو! بینک آف انگلینڈ کا گورنر، لارڈ نارمن، چوبیس سال تک سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ نخوت، خودسری اور خودرائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ کاروباری لین دین

کے فیصلے بھی الہامی انداز میں کرنے کا عادی تھا۔ بے سوچے سمجھے۔ ۱۹۳۵ کے لگ بھگ جب اس نے ماہر اقتصادیات پروفیسر کلے کو ایڈوائزر مقرر کیا تو ساتھ ہی ہدایت کی: "تمھارا کام ہرگز یہ بتانا نہیں کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔ تمھارا کام تو مجھے یہ بتانا ہے کہ مَیں نے فلاں فیصلہ کیوں کیا۔"

اس نے دس منٹ پہلے لُوٹی ہوئی "پت" لوٹادی۔ اور ہمیں زیرلب مسکراتے دیکھ کر کہنے لگا "میں تمھیں کسی طرف سے ہاتھی لگتا ہوں؟ دیکھو اس ہفتہ وار چیتھڑے میں لطیفی نے میرے خلاف کیسا گندہ آرٹیکل چھپوایا ہے۔ لکھا ہے کہ مَیں روز ایک بوتل زرمبادلہ پی جاتا ہوں۔ سُرخی جمائی ہے کہ میں بینک میں سفید ہاتھیوں کا سرغنہ ہوں! میں سفید بے ٹسک ہوں، مگر قدرت نے مجھے سونڈ نہیں بخشی کہ اس میں لپیٹ کر لطیفی کو زمین پر پٹخنیاں دُوں۔ 'گنگادین' میں رُڈیارڈ کپلنگ نے کیا کہا تھا؟

'An for all 'is dirty 'ide

'E was white, clear white, inside.

دو تین اشتہار دے دوں تو سفید ہاتھی کالا ہو جائے گا! اور اس میں یہ بھی بہتان لگایا ہے کہ میری تنخواہ ۲۷۰۰ ہے۔ تمھیں خود معلوم ہے کہ میری تنخواہ ۲۶۰۰ ہے۔"

ہم ہاں میں ہاں ملا کے چلنے لگے تو خوشدلی سے پُوچھا "اور ہاں! اپنی ناک کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"سر! سندھی میں ایک کہاوت ہے کہ بھینس کو اپنی کالک نظر نہیں آتی۔"

وہ عام انگریزوں کی طرح نہیں تھا جو انصاف، برٹش آرمی اور .M.C.C کی فتح پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک ہفتے کے باسی لندن کے اخبارات میں پاکستان کی خبریں پڑھتے ہیں اور رات کو بی بی سی سے کل کے موسم کی پیش گوئی اور بگ بَین کی لوری سُن کر سو جاتے ہیں۔ ویک اینڈ پر ہماری طرح فقط ہاکس بے کی سنہری ریت اور سمندری غسل پر قناعت نہیں کرتے:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے غسل کردن آمدی

عام انگریز اتوار کو صبح دس بجے تک بستر پر اینڈتے رہتے ہیں۔ پھر نیکر پہن کر بیئر پیتے ہیں۔ جو زرا کاہل ہیں وہ بیئر پی کر نیکر پہنتے ہیں۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے دھوپ میں گھاس کے اس بالشت بھر قطعہ میں انگلیوں سے کنگھی کرتے رہتے ہیں جسے وہ اپنا گارڈن کہتے ہیں۔ اینڈرسن واحد انگریز، معاف کیجئے اسکاٹس مین تھا جو اتوار کی صبح نہ ہاکس بے جاتا، نہ دس بجے تک بستر پر پڑا اینڈتا رہتا، نہ نیکر پہنتا، نہ دھوپ میں بیٹھ کر گھاس کو گھورتا۔ بس بیئر پیتا تھا۔

سر کا خطاب

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ وقتاً فوقتاً تاکید کرنے لگا کہ اخبار غور سے پڑھا کرو۔ "ون فائن مارننگ تم ملکہ کی برتھ ڈے آنرز لسٹ میں اپنے جنرل منیجر کا نام دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماؤ گے۔ ابھی تو تم مجھے صرف "سر!" پر ٹرخا دیتے ہو۔ چند روز بعد سر ولیم کہنا پڑے گا۔ سر ولیم! سر ولیم! کہتے ہوئے تم کتنے سویٹ لگو گے۔ اس دفعہ تمھارے باس کو نائٹ کا خطاب مل رہا ہے۔" اسی ہفتے جب اس نے یہ مژدہ تیسری دفعہ سنایا تو ہم نے پیشگی مبارکباد دی جس کا اس نے صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کیا اور ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ وعدہ بھی کیا کہ جولائی میں لندن کا پھیرا ہوا تو ہر میجسٹی سے سفارش کروں گا کہ تمھیں بھی کوئی چھوٹا موٹا خطاب دے دیں۔ آخر تم کب تک مسٹر پر گزارہ کرو گے۔

دو تین مہینے بعد خطابات کی فہرست اخبار میں چھپی تو سب نے اوّل تا آخر اور پھر نیچے سے اوپر تک کھنگال ڈالی۔ اسمِ گرامی کہیں نظر نہ آیا۔ یہی نہیں، اس سال کسی ایسے شخص کو خطاب ہی نہ ملا جس کا نام ڈبلیو یا ولے سے شروع ہوتا ہو۔ شام کو اس نے کسی کام سے بلایا تو ہماری پھوہڑ کمان سے تیر نکل گیا "لگتا ہے ڈان کی فہرست میں آپ کا نام سہواً رہ گیا۔" عینک کو ناک کی پھننگ پر رکھ کر فرمایا "ایک ہفتے پہلے برطانیہ کے ہائی کمشنر نے میری رضامندی چاہی تھی، لیکن میں نے سر

کا خطاب لینے سے صاف انکار کر دیا۔ آآآ! میں نہیں چاہتا کہ وہ کُتیا (اپنی نصف بہتر کی طرف اشارہ) لیڈی اینڈرسن کہلائے۔ لیڈی اینڈرسن؟ مائی فُٹ! جب تک میں زندہ ہوں اسے یہ عزت نصیب نہیں ہو سکتی۔

ایسی دو تین فہرستوں کا دیدہ ریزی سے مطالعہ کرنے کے بعد کھُلا کہ سر کا خطاب بھی اس کی ایک دِل پسند فینٹسی (FANTASY) ہے۔ کبھی کبھی اس پر ڈکنس کے پک وِک پیپرز کے ہیرو کا گمان ہوتا۔ ہمیشہ ناکام و نامراد، پر سدا پُر امید اور پیار کے قابل۔ آرزو کے اس چمن میں خزاں کا گزر کہاں، اس لیے کہ اس کی آبیاری تو دہسکی سے ہوتی تھی۔ برِاعظم ایشیا میں غالباً وہ واحد انگریز تھا جسے ۳۵ سال بینکنگ کے پیشے سے وابستہ رہنے کے باوجود کوئی خطاب نہ مِلا۔ ورنہ پانچ چھ سال لال مرچ کھانے کے بعد تو ہر انگریز کو کوئی نہ کوئی خطاب ضرور مل جاتا تھا۔ خواہ اس کے کارہائے نمایاں اس سے آگے نہ بڑھے ہوں کہ پچھلے سیزن میں اس نے سب سے زیادہ مرغابیاں ماریں، یا کم سے کم ضربوں میں زیادہ سے زیادہ سوراخوں میں گیند کو داخل کر کے ڈسٹرکٹ گاف ٹورنامنٹ جیتا جس کا غلغلہ وہائٹ ہال تک پہنچا۔

چھوٹی ناک اور طلاق

ایک ضروری کام کے سلسلے میں ہم نیشنل بینک آف انڈیا کے منیجر مسٹر میکائی سے ملنے گئے تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ کرکٹ پر میرے پاس مختلف زبانوں میں ۴۵۰۰ کتابیں ہیں اور اس موضوع پر میرے ذاتی کتب خانے کا دنیا میں دوسرا نمبر ہے۔ ستائیس سال میں دس بارہ تبادلے مختلف ملکوں میں ہو چکے ہیں۔ کتب خانہ بدوش پھرتا ہوں۔ کرکٹ آج تک نہیں کھیلی۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ جس کھیل سے ہمیں ہمیشہ چڑ رہی اس پر اس اللہ کے بندے نے اتنی بہت سی کتابیں اور ایسی ایسی جناتی زبانوں میں جنھیں وہ خود بھی کبھی نہ پڑھ سکے گا، نہ جانے کتنے جتن سے ہمیں جلانے کے لیے جمع کی ہیں۔ ذرا چل کر گنج ہائے فرومایہ کو دیکھنا تو چاہیے۔ ہم نے اشتیاق ظاہر کیا تو کہنے لگا اتوار کی صبح گھر آجاؤ۔ مگر یاد رہے، کتاب خوبصورت بیوی کی طرح ہوتی ہے۔ دُور سے کھڑے

کھڑے دیکھ کر داد دینے کے لیے۔ بغل میں دبا کر لے جانے کے لیے نہیں۔ مسٹر میکائی کو کچھ دن پہلے C.B.E. کا خطاب ملا تھا۔ ہم نے مبارکباد دی اور ساتھ ہی اینڈرسن کے خطاب قبول نہ کرنے کا تذکرہ کیا تو اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا، اینڈرسن نے عرصہ دراز تک چارٹرڈ بینک میں ملازمت کی۔ سوئز کے اِس پار اس سے زیادہ قابل اور الکحالک بینکر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ لیکن چارٹرڈ بینک ان دونوں صفات کو ایک ہی ذات میں مجتمع دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک پارٹی میں اپنے باس کی نئی نویلی دلہن کی گود میں، لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے جا کر بیٹھ گیا اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ جائے واردات پر ہی ڈِسمس نہ کر دیا گیا۔ اینڈرسن ایسا ویسا ''امیچور'' شرابی نہیں۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔ مسٹر میکائی نے یہ بھی بتایا کہ برما میں لڑائی کے دوران اپنی بیوی کو رنگون میں سوتا چھوڑ کر، میدان جنگ سے میرے ساتھ دوش بدوش کلکتے بھاگا تھا۔ اب اس خاتون نے گلاسگو میں طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا ہے جس میں تنسیخ نکاح کا یہ جواز پیش کیا ہے کہ اب میرا اور اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ سوتے میں نکاح شکن خراٹے لے کر میرے ذاتی خوابوں میں غلط SOUND EFFECTS (صوتی اثرات) دیتا ہے۔ عادتیں بھی گندی ہیں۔ مثلاً بیس برس سے ٹوتھ برش چھوا تک نہیں۔ چھوٹی سی ناک کو انگلی سے کریدتا رہتا ہے۔ مزید برآں کثرتِ مے نوشی کے سبب مدعا علیہ وظیفہ زوجیت کی بجا آوری سے عرصہ دس سال سے معذور، نیز مفرور ہے۔

مسٹر میکائی بڑے حاضر جواب، بذلہ سنج انسان تھے۔ تقریبوں میں بڑی چاہت سے بلائے جاتے تھے۔ ہزاروں لطیفے یاد تھے۔ خود ہی کھُلے تو کھُلتے چلے گئے۔ فرمایا کہ ہنی مون کے دوران ہی طلاق پر گفت و شنید شروع ہو گئی تھی۔ بیس سال سے نکاح اور طلاق کی سرحدوں پر جنس بندی لائن کی خلاف ورزیاں کرتا رہا ہے۔ اپنے جواب دعویٰ میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مدعا علیہ بسلسلہ روزگار کراچی میں سکونت پذیر ہے۔ وظیفہ زوجیت کی ادائیگی میں دو عظیم براعظم حائل ہیں جن کے وجود کا علم غالباً ملکہ معظمہ کی فاضل عدالت کو بھی ہو گا۔

ہے خبر گرم ان کے جانے کی

شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ 'وقت میں بات یہی ہے کہ گزر جاتا ہے'۔ سو اچھا بُرا ہمارا بھی گزر گیا۔ "میں اگلے ہفتے وطن جا رہا ہوں"۔ اینڈرسن نے ایک دن دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ہم سے کہا۔ "ایک دن اس دیوار پر میری تصویر، KNIGHT کے لباس میں، آویزاں ہوگی۔ اس وقت میں زمین میں چھ فٹ نیچے سو رہا ہوں گا۔ اب مٹی مٹی میں ملا چاہتی ہے۔ افسوس کہ میرے قُرب کے باعث تمھارا کیریر بھی تباہ ہو گا۔ میں تمھارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ مگر میری اچھائیوں کو ہی یاد رکھنا" اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔

تین چار مہینے سے بنک میں افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ اب کا گیا وہ واپس نہیں آئے گا۔ عافیت اندیشوں نے اس کے جانشین کو ابھی سے 'بڑا صاب' کہنا شروع کر دیا تھا پنجابی مثل کے مصداق دریا ہنوز کوسوں دُور تھا لیکن یار لوگوں نے ابھی سے شلواریں کاندھے پر ڈال لی تھیں۔ لوگ آدھ آدھ گھنٹے اس انتظار میں کھڑے رہتے کہ وہ اِدھر سے گزریں تو کورنش بجا لائیں۔

یوں وہ گزرے نظر چرائے ہوئے
ہم لیے رہ گئے سلام اپنا

بڑے بڑے آدم خور افسران کے سامنے کھگھیانے لگے۔ جنگل میں شیر بن گئے تھے خوف سے ہرن! جمعہ کو سب ایک ہی مسجد میں ایک دوسرے کے شر سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگنے لگے۔ ادھر خود اینڈرسن چند روز سے اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ڈرائیور اگر بائیں طرف کا دروازہ کھولتا تو دائیں طرف سے اُترتا اور دایاں کھولتا تو بائیں سے کُود پڑتا۔ لوگوں نے ہم سے ملنا جُلنا ترک کر دیا۔ ہماری بربادیوں کے مشورے آسمانوں کے علاوہ دفتر میں بھی ہو رہے تھے جو کہیں زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ عام طور پر یہ خیال تھا کہ اس کے جہاز کے عدن پار کرنے سے پہلے ہمارا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ہمیں اور زیادہ لگن اور تندہی سے کام کرتے دیکھ کر مرزا بولے کہ صاحب! بجتے مینہ

میں سفیدی کرنے سے فائدہ؟

اینڈرسن نے خود ذکر چھیڑا تو ہم نے آواز میں ایک جہان کی رقت بھر کے کہا: "جانے سے پہلے ہمیں اپنی نشانی ایک سرٹیفکیٹ دیتے جائیے۔" ہر طرف آپا دھاپی، نفسی نفسی کا عالم تھا۔ اس کے چپراسی نے اس کی جیب سے سو روپے کا نوٹ بطور نشانی نکال لیا تھا۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ اس کی بھوؤں کے درمیان شکن پڑگئی جو اس کی غماز تھی کہ آبگینے کو ٹھیس ہی نہیں لگی، اس میں بال بھی پڑ گیا۔ یکبارگی اس کے تیور بدل گئے۔ شیکسپیئر کے رچرڈ سوم کا فقرہ دُہراتے ہوئے کہنے لگا:

'Authority leaves a dying king !

سرٹیفکیٹ چاہیے؟ آآآ! تمہارا کام بُرا نہیں۔ میرے خانساماں کے پاس سوڈیڑھ سو سرٹیفکیٹ ہیں۔ دو مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنا کھانا کتّے کو کھلا دیا۔ دونوں کتّے مر گئے۔ میں نے تمہارے بارے میں مکمل رپورٹ اس ڈائری میں لکھ چھوڑی ہے۔ آخری دن نقل کر کے میرے دستخط کروا لینا۔ کل میں تمہیں ایک الوداعی تحفہ دوں گا۔ ایک انتہائی کارآمد کتاب۔ اگر میری طرح تم نے اسے سمجھ کے پڑھ لیا تو میری ہی طرح ایک دن جنرل منیجر ہو جاؤ گے۔ یہ میرا بڑا عزیز سرمایہ ہے۔"

دوسرے دن حسبِ وعدہ اس نے یہ کلیدِ کامیابی ہماری نذر کر دی۔ یہ ایک مجلّد کتاب تھی جس میں بینکنگ کے حالیہ مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ حالیہ سے ہماری مُراد ۱۸۹۸ء کے مسائل ہیں جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ کاغذ و طباعت سے اندازہ ہوا کہ انگریز کسی زمانے میں بھی ہم سے پیچھے نہیں رہے۔ ان میں بھی منشی نولکشور ہوا کرتے تھے۔ اس کی ورق گردانی کے بعد ہم بھی قائل ہو گئے کہ اسے پڑھ کر ہر شخص جنرل منیجر بن سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوا ہو۔

روانگی سے ایک دن قبل افسروں نے شیزان میں اسے الوداعی پارٹی دی۔ دس پونڈ کا ایک سہ منزلہ کیک بطورِ خاص بنوایا گیا جس کی سفید آئسنگ پر تولہ تولہ بھر کے تین گلابی آنسو لرزاں تھے اور ان کے نیچے چاکلیٹ سے لکھا تھا: FAREWELL, SIR!

سپاس نامہ یعسوب الحسن غوری نے ان سپاسناموں کی مدد سے ڈرافٹ کیا تھا جو پچھلے تیس

برسوں میں ایک اسٹول سے دوسرے اسٹول پر تبادلے کے موقع پر چپراسیوں نے ان کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ سپاس نامے میں یہ احتیاط برتی گئی تھی کہ اپنی طرف سے کوئی جملہ نہ گھڑنا پڑے، مبادا انگلش گریمر کو چوٹ چپیٹ آجائے۔ ہر خیال کا اظہار کسی ریڈی میڈ محاورے کے ذریعہ ہو۔ (حالانکہ بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس، محاورے تو زبان کے بڑھے ہوئے ناخن ہوتے ہیں) وہ اپنی عینک بھول آئے تھے۔ اور انھیں مستقبل اور بھی تاریک نظر آرہا تھا۔ لہٰذا سپاس نامہ بڑی دِقّت اور رِقّت کے ساتھ پڑھا۔ گلے میں پھندا پڑ پڑ گیا جسے بعد میں کیک کے تینوں اشکِ خونیں کھاکر صاف کیا۔ بامحاورہ اُردو کے انگریزی (لفظی) ترجموں کا مضحکہ اُڑاتے تو آپ نے بہتوں کو دیکھا ہو گا۔ ہم اس بامحاورہ انگریزی کا لفظی ترجمہ من و عن پیش کرتے ہیں:-

سپاس نامہ

"جناب عالی!!!

ہمارے لیے یہ انتہائی مسرت و ملال کا سنگم ہے کہ آپ تشریف لے جارہے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ انتظامی گتھیوں کے سینگ پکڑ کے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ آپ نے یہ رُخصت اپنی پیشانی کے پسینے سے کمائی ہے۔ آپ اپنی موم بتّی دونوں طرف سے جلاتے رہے ہیں۔ یہ اس نومولود بینک کے دانت نکلنے کا زمانہ تھا۔ مگر آپ نے کمال چابکدستی سے بینک کی کشتی کو ایک طرف چٹان اور دوسری طرف بھنور سے بچاکر خشک ساحل پہ لا کھڑا کیا۔ یہی نہیں، آپ نے مخالف بینکوں کے بادبانوں کی ساری ہوا نکال دی۔ اس ادارے کی ترقی کے لیے آپ نے کوئی پتھر اتھل پتھل کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ آپ اپنی تلوار پر سر ٹیکا کر نہیں سوئے۔ بینک کا پرچم لہراتے ہوئے آپ نے کبھی اپنے پیروں کے نیچے کائی نہیں جمنے دی۔

"ہم تمام عملے کی جانب سے حضورِ والا کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے بغیر یہ بینک چلانا ایسا ہی ہو گا جیسے ہملٹ کا ڈرامہ پرنس آف ڈنمارک کے بغیر کھیلنا۔ ہمیں اس عارضی جدائی کا بڑا صدمہ ہے۔ ہم آپ کی خدمت میں گوٹے کے ہار اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ (ہار پہنایا جاتا ہے۔

تالیاں بجتی ہیں۔) ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ مگرمچھ کے آنسو نہیں ہیں۔

"آپ نے اس شیر خوار ادارے کی خاطر اپنی کمزور صحت مکمل طور پر تباہ کر لی ہے، جس کی بحالی کے لیے ہم اور ہمارے معصوم اطفال چوبیس گھنٹے دعا کرتے رہیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ وقت کے ریگزار میں ہمارا ہر قدم آپ ہی کے نقشِ قدم پر پڑتا چلا جائے گا۔ ہم اپنا باقی ماندہ کیریر آپ کی دانائی سے حاملہ نصیحت کی روشنی میں گزاریں گے کہ 'قرض فرض ہے۔ اور ایمانداری بہترین پالیسی ہے ★'۔ ہمیں شکسپیر کا تو کوئی حسب حال شعر یاد نہیں، لیکن ورنا کیولر کے سب سے بڑے شاعر غالب نے اپنے بادشاہ کو دعا دی تھی کہ خدا تمھیں ایک ہزار سال سلامت رکھے اور ہر سال پچاس ہزار دن کا ہو۔ جناب والا! ہماری دلی دعا ہے کہ آپ اتنے عرصے سلامت رہنے کے علاوہ اس بینک کے جنرل منیجر بھی رہیں۔ (حاضرین کورس میں آمین! ثم آمین! کہتے ہیں)۔

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سپاسنامے کو کس طرح ختم کریں۔ ہم شرمندہ ہیں کہ مختصر نوٹس کے سبب ہم اسے چھپوا کر سنہری فریم میں پیش نہ کر سکے۔ ممکن ہے اس میں آپ کو املا کی ضرورت سے زیادہ غلطیاں بھی نظر آئیں۔ مسز ڈی۔ کوناٹا ٹائپسٹ ڈیڑھ مہینے سے میٹرنٹی لیو پر ہے۔ مگر غلطی کرنا انسان کا کام ہے، معاف کرنا فرشتوں کا۔

ہم ہیں جناب کے انتہائی تابعدار اور غمزدہ

خادم

جن کے دونوں سرے بوجہ مہنگائی مشکل

مل پاتے ہیں۔"

اس کے بُشرے سے ہویدا تھا کہ سپاس نامہ سن کر چکرا گیا ہے۔ اپنی اس کیفیت کو غالباً اس نے وہسکی کی زیادتی پر محمول کیا۔ جبھی تو اکاؤنٹنٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود کو کھڑا کیا۔ جوابی تقریر

★ Honesty is the best policy !

جو قوم (انگریز) ایمانداری کو اصولاً نہیں، بلکہ بطور پالیسی اختیار کرے، وہ ایمانداری سے کیا کچھ توقعات رکھتی ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

میں "شکریہ!" کے ایک لفظ کے بعد ہی برس پڑا۔ کہنے لگا، میں نے آپ کی ٹریننگ پر بڑا مغز مارا ہے۔ اپنے علم کا آخری قطرہ تک آپ کے دماغوں میں پمپ کر دیا۔ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی کہ اس کے باوجود آپ نے ایک کیلنڈر سال میں پچاس ہزار دن کی سفارش کیسے کر دی، جب کہ برطانیہ میں ۵ روزہ ہفتہ کا مطالبہ شدت پکڑتا جا رہا ہے۔ آپ نے یہ تو سوچا ہوتا کہ اگر سال کے دن بڑھا دیئے گئے تو سالانہ سُود میں کمی کے باعث ایک ہی ہفتے میں سارے بنکوں میں تالے پڑ جائیں گے۔

کیا بُرا تھا ر ولینا ایسے مسکرانے سے

ہم سے رخصتی مصافحہ کرتے وقت کہنے لگا "اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ اور اخبار ذرا توجہ سے پڑھتے رہنا۔ وَن فائن مارننگ، برتھ ڈے آنرز لسٹ میں اپنے باس کا نام دیکھ کر تم اپنے کو کتنا خوش نصیب سمجھو گے۔ KNIGHT کے بننے میں فوٹو کھنچوا کر تمھیں سیکنڈ کلاس ایئر میل سے بھیجوں گا۔ ۱۰×۱۲ سائز کا سنہری فریم خرید کر رکھ لو۔ تمھارے اور حیدری کے علاوہ کسی اور کو تو کرسمس کارڈ بھی نہیں بھیجوں گا۔"

وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ ہم نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ شام کا جُھٹ پٹا سا ہو چلا تھا۔ وہ دھوپ کی عینک لگا کر سب سے ہاتھ ملانے لگا۔ اس شرابی کی پیار بھری پھبتیاں، کام نکالنے والی گھُرکیاں اور جھوٹی خفگیاں آنکھوں میں پھر گئیں۔ یادوں کا گنبدِ بے در گونج رہا تھا۔

اُن کے غصّے میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

اور وہ شوخیاں اور گستاخیاں بھی یاد آتی چلی گئیں جو ہم اس رندِ بلانوش کی شان میں کرتے اور معاف ہوتے رہے۔ اگر عینک کو کان پر ٹکانے کا کھٹراگ نہ ہوتا تو ۱۰×۱۲ فوٹو کے بدلے میں اور کچھ نہیں تو شہرۂ آفاق مصوّر واں گف کی طرح اُسترے سے اپنا ایک کان ہی کاٹ کر بطور نشانی پیرِ مغاں کو پیش کر دیتے جس کا حرفِ شرابی دِل پر کیا کیا خرابی لایا تھا۔

موصُوفہ

پٹڑی چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

ٹھیک سے یاد نہیں اسے پہلے پہل کب دیکھا اور وہ اس وقت کیا پہنے ہوئے تھی، کیسی لگ رہی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن سے مِل کر اپنے مرد ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ وہ عورت نہیں ہوتیں۔ اسے بینک میں دیکھ کر ہمیں تعجب ضرور ہوا تھا، اس لیے کہ اینڈرسن بینک میں لڑکیوں کو ٹائپسٹ اور اسٹینوگرافر کے علاوہ کسی اور جگہ ملازم رکھنے کے سخت خلاف تھا۔ کہتا تھا برصغیر میں کوئی لڑکی آفس میں ٹِک نہیں سکتی۔ لڑکی اگر نیک ہے تو خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتی ہے۔ نیک نہیں ہے تو کوئی بھگا لے جاتا ہے۔ کچھ بھڑکتی ہیں، کچھ بھٹکتی ہیں۔

نہ حسین نہ کم رُو۔ مُسن نہ جوان۔ سنہری بالوں کی ایک لٹ نقرئی ہو چلی تھی، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ خود "بلیچ" کرتی ہے۔ صورت شکل سے اینگلو انڈین نہیں، انگریز ہی لگتی تھی۔ زردی مائل دانت۔ کرنجی آنکھیں، ٹھینگا دکھاتی ہوئی مخصوص برٹش ناک۔ کسا بندھا پنڈا۔ ابھی باقی تھی کچھ کچھ دھوپ دیوارِ گلستاں پر۔ دھوپ ہی نہیں، دیوار پر ان کمندوں کے چَھل خور نشان بھی باقی تھے جو کبھی پھینکی گئی تھیں۔ کم آمیز، کم گو، بھرے بھرے بازو، بھاری آواز، اس سے بھاری تیڑ★ جملہ حقوق ہنوز غیر محفوظ۔ ایک راوی کج مج بیان نے بتایا کہ کسی زمانے میں یوروپین مِڈ وائف بھی رہ چکی ہے۔ جبھی تو یہ حال تھا کہ کوئی داخل دفتر بوڑی پاٹھی فائل طلب کریں تو نہ جانے کہاں سے کوئی ستوانسی فائل

★ تیڑ (پنجابی) کمر سے لے کر گھٹنوں تک کا حصّہ۔ اردو مرادف، اگر کوئی ہے، تو میرے علم میں نہیں۔

کھینچ کر لے آتی تھی۔

پانچ چھ مہینے بعد جب اینڈرسن نے اس سے ہمارا باضابطہ تعارف و مصافحہ کروایا تو وہ ڈری ڈری، سہمی سہمی نظر آئی۔ اس کی انگلیاں موٹی اور ہاتھ کھُردرا تھا۔ کہنے لگا "بینک بہت خوش قسمت ہے کہ اس خاتون کا نام اس کے نام سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس کے والد کراچی کے راجہ تھے۔ کلکٹر رہے۔" اوّل تو ہم سنہ مذکور تک اس دنیائے گرد و باد میں وارد نہیں ہوئے تھے۔ پھر یہ کہ ابھی تو ہم کراچی کے جغرافیہ سے ہی اچھی طرح نمٹ نہیں پائے تھے کہ اس کی تاریخ میں غوطے لگا کر ایسے درِ شہوار نکالتے۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ راجہ داہر کے بعد کوئی اینگلو انڈین راجہ بھی گزرا ہے جس کی وجہ شہرت اس خاتون کا باپ ہونا تھی۔ اس زمانے میں بھی نومبر دسمبر میں مرغابیاں اور انگریز بینکر پاکستان میں اُترنے شروع ہوتے تھے۔ اینڈرسن ان پر رعب ڈالنے کی غرض سے مس ریمزڈن کا تعارف اسی طرح کراتا تھا۔ گفتگو میں جب تک راجہ نواب، ناچ گرل، حرم، ڈاک بنگلہ، بنگال ٹائیگر، چھوٹا حاضری، سپیرے، بخشیش اور رائس اینڈ کری کا ذکر نہ آئے انگریز کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کالوں کے دیس میں ہے۔

ہمارا دورِ اتالیقی

تعارف کے بعد حکم ہوا کہ مس ریمزڈن کو "فارورڈ فارن ایکسچینج★" کا کام سکھاؤ۔ یہ سُنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے جو ذرا دیر میں اس بلیاوے سے بحال ہوئے کہ پڑھانے اور اپنے کو استاد کہلوانے میں جو سوبوتوں کا نشہ ہے وہ بادشاہی میں ہو تو ہو، ورنہ دنیا کا ہر مزا اس کے سامنے ہیچ ہے۔ اسی لیے تو شاہجہاں نے اپنے ایامِ اسیری میں صرف ایک خواہش کی تھی کہ قلعہ آگرہ میں مجھے بچوں کو پڑھانے کی اجازت دے دی جائے۔ اورنگ زیب نے اس سلطنت در سلطنت کی درخواست کو بوجوہ رد کر دیا۔ لیکن درس و تدریس کے سلسلے میں یہاں دو مشکلات درپیش تھیں،

★ زرِ مبادلہ کے وعدے کے سودے اور لین دین۔ یہ کام سب سے پیچیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مارے ڈر کے اسے کوئی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔

جن پر قابو پانا تقریباً ناممکن تھا۔ اوّل تو وہ حد درجہ غبی ٹھیری۔ "فارن ایکسچینج" کا انتہائی پیچیدہ کام قطعی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ دوم، ہم خود یہ کام قطعی نہیں سمجھ پائے تھے۔

علم سیکھنے کی سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ آدمی پڑھانا شروع کر دے۔ ہم نے بھی یہی کیا۔ اس مخلوط تعلیمی تجربے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نیک بخت تو ساڑھے چار بجے پرس ہلاتی چلی جاتی، ادھر بینک کے اکاؤنٹ رات کے بارہ ایک بجے تک بیلنس نہ ہو پاتے۔ ہماری مشترکہ غلطیوں سے سب ہی ڈپارٹمنٹ متاثر و مفلوج و مشتعل ہو جاتے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہماری غلطیوں میں ایک انفرادیت، اُستادی کی ایک شان پائی جاتی تھی مطلب یہ کہ وہ زیادہ دیر اور مشکل سے پکڑ میں آتی تھیں۔ صبح ہماری آنکھیں اور دوسروں کے منہ سوجے ہوئے ہوتے۔ کسی بھی ڈپارٹمنٹ کے حساب میں کوئی ایسا گھپلا ہو جائے جو رات کے نو بجے تک کسی کی گرفت میں نہ آسکے تو دوِش ڈالنے کے بعد غلطی ہائے مضامین کو، مع ملزمان، عالم حسین صاحب کے "سیشن سپرد" کر دیا جاتا۔ غلطی کہیں بھی سرزد ہوتی ہو، ہمیں ضرور شاملِ تفتیش کیا جاتا تھا۔

عالم صاحب کی ساری زندگی اور تمام سرمایۂ علم غلطیاں پکڑنے اور "انڈے بنیڈے اکاؤنٹ" کی چولیں بٹھلانے کے لیے وقف علی الاغلاط تھا۔ اور وہ اس کے اس حد تک خوگر ہو چکے تھے کہ کبھی کسی صحیح اکاؤنٹ سے پالا پڑ جائے تو چکرا جاتے۔ شام تک تقریباً ٹھالی بیٹھے رہتے، اس لیے کہ اس سے پہلے انفرادی اور اجتماعی غلطیوں کے گھوڑے بحرِ ظلمات میں دوڑنے شروع نہیں ہوتے تھے۔ حساب جتنا گنجلک اور گندہ ہو، اتنا ہی ان کی طبیعت میں انشراح اور بالیدگی پیدا ہوتی تادیر تبسم فرماتے۔ دونوں آنکھیں بند کر لیتے اور ایک ہی دم لگا کے سالم سگرٹ کو آدھا، اور آدھے کو راکھ کر دیتے۔ پھر غلطیوں کے نشے سے سرشار ہو کر جھوم جھوم جاتے۔

مجموعۂ اغلاط ہے دنیا مرے آگے

جب تک وہ غلطی پکڑتے، سارا عملہ ملزم کو پکڑے بیٹھا رہتا۔ البتہ ہم خود کو روزانہ سات بجے ہی گرفتاری کے لیے رضاکارانہ طور پر پیش کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی غلطی بڑی جلدی ہاتھ آجاتی اور ہمیں رات کے گیارہ بجے ہی رہائی مل جاتی۔ دوسرے دن سہ پہر تک لوگ ہماری پچھلی خطاؤں کو معاف

کر کے ندامت کے نئے مواقع فراہم کرتے:

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

ہماری خوش نصیبی ہے کہ یہ خطاشناس رفیقِ دیرینہ آج بھی ہمارے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمزاد ہیں۔★ اور ان کے برتے پر ہم آج بھی جمع تفریق کی غلطیوں سے پریشان یا پشیمان نہیں ہوتے۔ ان کا دم ہمارے لیے غنیمت بلکہ مالِ غنیمت ہے۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم حسین دوبارہ نیست

لوگ ہمیں سخت محنت اور زیادہ کام سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگے، اس لیے کہ ہم جتنا زیادہ کام کرتے، غلطیوں کے تناسب و تعداد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ کئی بدخواہوں نے اینڈرسن سے شکایت بھی کی کہ رشد و ہدایت کا جو باب ہم نے کھول رکھا ہے، اس کی وجہ سے ان کی راتیں کالی ہو رہی ہیں۔ اپنے بچوں کی پیاری پیاری صورتوں کو ترس گئے ہیں۔ لیکن اس نے نہ صرف یہ کہ ان چغل خوروں کی بات کا نوٹس نہیں لیا، بلکہ ہماری یہ بھی ڈھارس بندھائی کہ جب دفتر میں سب کے سب، کسی آدمی کی غیبت کرنے لگیں تو سمجھ لو کہ وہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس نے ہمارے طرزِ تدریس پر مکمل اعتماد اور مسرّت کا اظہار کیا، جس کے بعد ہم اور زیادہ تندہی اور جانفشانی سے غلطیاں کرنے لگے، ایک سُود خور ادارہ تو چیز ہی کیا ہے، جہاندار شاہ نے تو ایک مرتبہ دریائے جمنا میں آدمیوں سے بھری ہوئی کشتی محض اس لیے ڈبوا دی تھی کہ اس کی منظورِ نظر لال کنور نے کبھی آدمیوں کو ڈوبتے نہیں دیکھا تھا۔

★ یہ سطور ۱۹۷۲ میں لکھی گئی تھیں۔ ہمیں اپنی ہی نظر لگ گئی۔ تیئس سالہ رشتۂ وفا یکم جنوری ۱۹۷۳ء کو ہمارے تبادلے کے بعد ٹوٹ گیا۔ اب وہ اور کہیں، ہم اور کہیں۔ دُعا ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں، خدا ہمیں بھی خوش رکھے اور ہمیں ویسے ہی شر سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

مس ریمزڈن پر دل کا غیر مہلک دورہ پڑا

تین چار ہفتے تک تلمذ و تعزیر کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک دن اینڈرسن نے ہمیں بلا کر پوچھا کہ تمھیں 'فارن ایکسچینج' کا کام کس نے سکھایا۔

ہم نے ذہن پر بہتیرا زور دیا۔ کوئی نام یاد نہ آیا۔ اور آتا بھی کیسے۔ اس زمانے میں ٹریننگ کا کوئی تصور سرے سے تھا ہی نہیں۔ بینکر بھی شاعروں کی طرح تلامیذ الرحمٰن ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکے ہیں، ہم بینکنگ 'ڈائرکٹ میتھڈ' سے سیکھا اور سکھا رہے تھے جس کا پہلا اور آخری سبق یہ تھا کہ تیرنا سکھانے کے لیے چھوٹتے ہی بیچ بھنور میں دھکا دے دیا جائے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بقول استاد ذوق:

شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

اس نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس کو فرضی استاد بنائیں۔ 'فارن ایکسچینج' تو بینکوں میں آج کل بھی سفلی علم کے ذیل میں آتا ہے۔ آں را کہ خبر شُد، خبرش باز نیامد۔ یہ علم ہم تک پاؤں پاؤں چل کر نہیں آیا تھا، بلکہ ایک اور تشبیہ کی اجازت ہو تو اتنا عرض کریں گے کہ ہم نے محض زور زورا زوری سے اسے کٹی ہوئی پتنگ کی طرح لُوٹا تھا۔ معاً خیال آیا کہ خود کو بے اُستادا کہنا کہیں نمک حرامی نہ سمجھی جائے۔ چنانچہ ہم نے ہچکچاتے ہوئے کہا کہ آپ ہی سے سیکھا ہے۔

جھنجھلاتے ہوئے فرمایا "سچ بولنے میں تمھیں اتنا تامل کیوں ہے؟"

وہ ہمارا جھوٹ کانٹے ڈور اور بنسی سمیت نگل گیا۔ ہمارا عرقِ انفعال ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا کہ اس نے قدرے تُرش رُوئی سے پوچھا "اچھا! اب یہ بتاؤ کہ جب تم نے فارن ایکسچینج کی ٹریننگ مجھ سے لی تو تمھیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا؟"

"نہیں تو۔"

"تمھاری اطلاع کے لیے مس ریمزڈن کو ہو گیا ہے! اب اسے ہلکے کام اور ہلکی غذا کی ضرورت ہے۔"

ہم کمرے سے نکلے تو دیکھا کہ باہر مس ریمزڈن، ہلکے لباس میں، کھڑی ٹھٹھے لگا رہی ہے۔ کہنے لگی آج تمھاری صورت کیوں اُتری اُتری ہے؟ ہم نے کہا، شاگرد کے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے۔ پر یہ تشخیص نہیں ہوا دِل پر حملہ کس نے کیا۔ کہنے لگی، بندی اس کارِ خر (DONKEY WORK) میں تمھارا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ تمھیں کو مبارک! پھر اپنے اوپر بناوٹی متانت طاری کر لی۔ اور سگرٹ کے دھوئیں سے ہوا میں چھلّے بنانے لگی۔ ایک آوارہ چھلّا ہماری بائیں آنکھ میں آکر فِٹ ہو گیا۔

اس سے پہلے ہم نے اسے سگرٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔

ٹام بوائے کی پونی ٹیل★

سب حیران کہ یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا، بلکہ راتوں رات اس میں منگل بھی ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جانِ حیا کی کایا پلٹ گئی۔ سج گرم، نگہ گرم، ہنسی گرم، ادا گرم۔ انگلیوں کو تو "ڈائٹنگ" نہ کرا سکی، لیکن ناخن اتنے بڑھا لیے کہ اب مُنھ نوچنے کے علاوہ ہاتھ کا کوئی اور کام نہیں کر سکتی تھی۔ دیسی چھینٹ کی ڈولتی جھولتی فراک کے بجائے پیرس سے منگایا ہوا اسکرٹ پہننے لگی۔ اُڑی مٹی بھنووں کی جگہ کھنچی ہوئی کمانیں۔ آنکھوں پر سبز مسکارے کا لیپ۔ ایک دفعہ لطیفہ سناتے ہوئے آنکھ بھی ماری جو لوحِ دِل پر ایسی نقش ہوئی کہ ایک ہفتے تک مسکارا چھڑائے نہ چھُٹا۔ چاندی کی لٹ پر سونے کا ملمع پھر گیا۔ لڑکوں کے سے کٹے ہوئے پٹّوں کی جگہ ایک سنہری جھاڑو سی لٹکنے لگی جسے اس زمانے میں "پونی ٹیل" کہتے تھے۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ کبھی کبھار بالوں میں فریرگارڈن سے چرایا ہوا پھول لگا کر آجاتی، یا اب یہ نقشہ کہ پورا گملا اٹھائے پھرتی تھی۔ ہار سنگھار،

★ پونی ٹیل: ٹچُّو کی دُم۔ ڈارون اور اس کا نظریۂ ارتقا کچھ ہی کہتا رہے، مرزا عبدالودود بیگ فرماتے ہیں: "ٹچُّو کی دُم مکھی اُڑانے کے لیے، کتّے کی دُم اعلانِ وفاداری، بلّی کی دُم انکشافِ جنس اور اونٹ کی دُم شتر پوشی کے لیے بنائی گئی ہے۔ انسان کی دُم اس لیے جھڑ گئی کہ اسے رکھنے کے لیے پتلون میں کوئی جگہ نہیں۔ نیز، ڈرل، پریڈ وغیرہ میں پچھلی صف والوں کو بڑی تکلیف ہوتی۔"

پیار دُلار کے دن لوٹ آئے تھے۔ پہلے ہمہ وقت یوں نظریں جُھکائے رہتی کہ ہمیں شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں آنکھوں میں نقص تو نہیں لیکن اب گالوں پر سُرخی لگائے بغیر "بلش" نہیں کر سکتی تھی۔ ایک لٹکا آ گیا تھا۔ اِٹھلا اِٹھلا کر بات کرتی تو لائف بوائے صابن کے بھبکے کے بجائے چاؤ بھرے بدن سے آنچیں سی نکلتیں۔ اب اس میں سے عورت کی لپٹ آتی تھی۔ بدرنگ مردانہ پمپ شوز اپنی مہترانی کو بخش دیئے اور ایک بالشت اونچی ایڑی کے جوتے سے فرش پر ٹاپ ٹاپ کرتی پھرتی۔ چھوٹے چھوٹے تِرچھے تِرچھے قدموں سے WIGGLE کر کے کمر اور اس کے معلقات کو دائیں بائیں جھُولا جھُلاتی دوسرے مرحلے میں کولھے SEE-SAW کی مانند اس طرح اُوپر نیچے ہوتے کہ آنکھیں باؤلی ہو جاتیں۔ ڈِھلمل خطوط اب کھنچ کے تلوار بن گئے۔ ایک قدم چلتی تو سینہ دو قدم آگے آگے چلتا۔ کوسوں بڑھے ہوئے ہیں پیادے سوار سے۔ اینڈرسن بالعموم کان پر ہاتھ کا کپ بنا کر بات سُنتا تھا۔ لیکن اب موصوفہ کے ہونٹ اس کے کان سے لگے رہتے تھے۔ گراں گوشم بہ نرُخ بر رُخم۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پکھراج کی انگوٹھی لشکارا مارنے لگی۔ کچھ کہو، کچھ پوچھو تو پہلے صرف ہوں ہاں کر دیتی تھی۔ اب انگ انگ بولتا تھا۔ اور کام؟ اتنے ناز سے غلط "ٹوٹل" (جمع) کرتی تھی کہ ہم تو صحیح ٹوٹل بھی اس طرح نہ کر سکتے تھے۔ پھر مصنوعی پلکیں پٹ پٹا کر اپنی غلطیوں پر کھِلکھلاتی۔ اپنے مرحوم باپ کو اس نے انسپکٹر کسٹم سے پرموٹ کر کے جائنٹ سکریٹری بنا دیا۔

گھوڑا چیف جسٹس بنا دیا گیا

جدھر دیکھو اسی کے چرچے۔ طرح طرح کی باتیں اُڑی ہوئی تھیں۔ عالم عالمِ عشق و جنوں ہے، دُنیا دُنیا تہمت ہے۔ کسی دانائے راز نے کیا خوب گھمّ بات کہی ہے کہ "دو تہمتیں ایسی ہیں جو کسی پر بھی لگا دو تو لوگ فوراً یقین کر لیں گے۔ ان میں سے دوسری یہ ہے کہ وہ پینے لگ گیا ہے۔" اینڈرسن پر پہلی بھی لگ گئی اور اب وہ مسٹر ریمزڈن کہلایا جانے لگا۔ خود مس ریمزڈن اب بینک میں L.L. کہلاتی تھی جو LADY LOVE کا پیار بھرا مخفف تھا۔ بڑے بڑے افسر اس کے آگے پیچھے پھرتے اور اکثر و بیشتر "سر" کہہ کر مخاطب کرتے۔ کچّی نوکری والوں کا بے تحاشا

جی چاہتا کہ بینک میں کہیں کیچڑ میسر آجائے تو سر والٹر رالے کی طرح اپنا کوٹ اتار کر بچھا دیں اور وہ ملکہ الزبتھ کی طرح اس پر سے بے نیازانہ گزر جائے۔ سالانہ ترقیوں کے دن آئے تو اہلِ غرض اسے زنجیرِ عدل کی طرح کھینچنے لگے۔ اور یہ کون سی اچنبھے کی بات تھی۔ تذکروں میں آیا ہے کہ روم کے شہنشاہ کلیگولا نے تو اپنے گھوڑے کو کونسل (قاضی القضاۃ، چیف جسٹس) کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ مانا کہ گھوڑا انسانوں کی طرح انصاف نہیں کر سکتا لیکن گھوڑا انسانوں کی طرح ناانصافی کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں بھی تو نہیں رکھتا۔ کرسمس آیا تو ایل ایل کے ہاں ڈالیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگ گئے۔ گھر پھلوں کے آڑھتی کا گودام معلوم ہونے لگا۔ یعسوب الحسن غوری تو عید الفطر کی نماز کے بعد سیدھے گورا قبرستان گئے اور اُس کے والد کی قبر پر پھولوں کی چادر بھی چڑھا آئے۔ فوٹو گرافر کو ساتھ لے گئے۔ چہرہ بھی رویا رویا سا لگ رہا تھا۔ اسی طرح نذر محمد قصور گئے تو اس کے لئے وہاں کی ساری سوغاتیں —— میتھی، حضرت بلھے شاہ کا کلام اور پراندے (چُٹیلے) لے آئے۔ (اتفاق سے ان دنوں ملکہ ترنم نورجہاں اپنے وطن قصور میں نہیں تھیں) گندھے ہوئے ہرن والے پراندوں کو ایل ایل نے اینڈرسن کے شب خوابی کے پاجاموں میں ازار بند کے بجائے ڈالا۔ اسے یہ خودکار ازار بند بے حد پسند آئے کہ یہ نیفے میں پنسل یا ٹوتھ برش کی مدد کے بغیر ڈالے جا سکتے تھے۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ ایک روز چپراسی نے اطلاع دی کہ آج صبح دونوں نہ صرف ایک ہی کار میں بینک آئے ہیں بلکہ جوانی قسم! ایک ہی دروازے سے اُترے ہیں! احق نواز چیمہ، اکاؤنٹنٹ نے اپنی آنکھوں سے ایل ایل کے بالوں میں اینڈرسن کی "ڈینڈرف" دیکھی! تین چار دن بعد وہی چپراسی خبر لایا کہ میں کل اتوار کو صبح ڈاک دینے اینڈرسن کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایل ایل سر سے تولیہ باندھے بال سکھا رہی ہے۔ کتے کی زبان نہیں پکڑ سکتے (جبھی تو خود اسے پکڑ لیتے ہیں)۔ کہنے والے کہتے تھے کہ سینچر کو کنواں خود چل کر آتا ہے اور اپنے آپ کو پیاسے پر اُنڈیل دیتا ہے۔

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا!

کوئی منحوس ہفتہ ایسا گزرا ہو گا جب اینڈرسن نے یہ اعلان نہ کیا ہو کہ رشوت اور عورت کبھی

اس کی کمزوری نہیں رہی۔ اور یہ ادّعائے بے گناہی حرف بحرف صحیح تھا، اس لیے کہ بے نوشی نے کبھی اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ دیگر خباثت پر قرار واقعی توجہ دے سکے۔ کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ عورت ـــــ اور یہ عورت ـــــ اس کی کمزوری ہو سکتی ہے۔ عقاب اور چیل کے گھونسلے میں بسیرا کرے! لیکن یہ حقیقت ہے کہ قدرت نے بعض عقابوں کی آنکھیں اتنی بڑی بنا دی ہیں کہ دماغ کے لیے جگہ ہی نہیں بچی۔ مزاح نگار جارج میکش (جو خود ہنگیرین ہے) کا قول ہے کہ برِاعظم یورپ کی تمام اقوام کی "سیکس لائف" ہوتی ہے، مگر انگریز کے ہاں اس کی جگہ گرم پانی کی بوتل! میلکم مگرج، سابق ایڈیٹر پنچ، نے بھی اعتراف کیا ہے کہ "سیکس" ہم انگریزوں کے سر میں ہوتا ہے، جو اس شے کے رکھنے کے لیے نہایت نامناسب جگہ ہے۔ اس کے برعکس، مردذات کے بارے میں قبرصی کہاوت ہے کہ جب تک لونڈے کے منھ میں ایک بھی دانت ہے، وہ پارسا نہیں رہ سکتا۔ لیکن آخر افواہوں اور عینی شہادتوں کی آندھی کے سامنے ہم اپنے حسنِ ظن کے چراغ کو کہاں تک کفِ اقوال پر لیے پھرتے۔ یوں بھی آدمی کسی چیٹ پٹے اسکینڈل کی تفتیش یا تردید کرنے بیٹھ جائے تو لوگ اسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چڑھتی ندی میں بہاؤ کے خلاف کون تیر سکتا ہے۔

ایک دفعہ آدمی کا بھرم اٹھ جائے تو پھر بیروں کی پوٹ عین چوراہے پر بکھر جاتی ہے۔ اور وہ چپکا کھڑا انھیں لٹتے، مٹی میں رُلتے دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اس بچارے کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ایک داستان کا سُت زنگا تانا بانا بنتا۔ دوسرا اس پر زردوزی کام کے بیل بوٹے بناتا۔ تیسرا کلی پھُندنے ٹانکتا۔ پھر سب مل کر غیبت بافی کی شاہکار جھول اس پر ڈال دیتے۔ ہاں! اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اب اس کے کالر میں سُرخ کارنیشن لگا ہوتا تھا۔ پہلے ہم اس کی ناک سے مقیاس الشراب کا کام لیتے تھے، یعنی اسے دیکھ کر معلوم کر لیتے تھے کہ کتنے ڈگری نشہ چڑھا ہے۔ لیکن اب ایل ایل اس کی ناک پر پاؤڈر لگا کر بینک ساتھ لاتی تھی۔ اگست تک روزانہ وہی ایک سیاہ رنگ کا سُوٹ پہن کر آتا تھا لیکن اب برٹش ٹیلرنگ کمپنی سے ایل ایل کے پسندیدہ "گرے" رنگ کے تین قیمتی سُوٹ ایک ہی تھان کے کپڑے میں سے سِلوا لیے تھے۔ انھیں کو روز بدل بدل کر پہنتا۔ ایک دن اس کا کنوارا چپراسی اپنے بیٹے کی قسم کھا کے کہنے لگا "میں نے اپنی چشم دید آنکھوں سے ایل ایل کو اپنے جُوڑے کے پھُول سے

صاب کا کان گدگدانے دیکھا ہے۔ صاب بھی ایک دن بلاٹنگ پیپر سے اس کے آنسو پونچھا پڑا تھا۔ ٹیلی فون ریسیور سے دن بھر لپ اسٹک کے بھپارے آتے ہیں۔ تم کو یقین نہیں آنے سکتا تو بقلم خود اس کے ہونٹ سونگھ کر تہاس تسلّی کر لو۔ کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔ پرسوں ہیں صاب کے بنگلے گیا تو یہ چھپا اسپتال کی پٹّی کے کپڑے سے بنی ہوئی پوشاک پہنے بیٹھی تھی۔ مجھے تو اس کی ہریائی دیکھ کے بڑی حریانی★ ہوئی۔" ہمارے شکاری دوست خان سیف الملوک خاں تو یہاں تک کہتے تھے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایل ایل کی بانہوں پہ اس کے پِنک مارک دیکھے ہیں!

وہ خود سے ہوئے ہمکلام اللہ اللہ!

عشق جب آداب خود آگاہی سکھاتا ہے تو دیوانے بھی ہشیار ہو جاتے ہیں۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ اس کی پتلون کے بٹن آدھے کھُلے، آدھے بند ہوتے تھے۔ البتہ قمیض کا یہ نقشہ نہ تھا۔ اس کے سب بٹن کھُلے ہوتے تھے۔ بقول چپراسی کے، ہر ایک کی بے پردگی کرتا تھا۔ لیکن اب سب بٹن متعلقہ کاجوں سے رجُوع کرنے لگے۔ وہ اپنی عمر سے کم معلوم ہونے لگا۔ ہمارا مطلب ہے ۶۳ برس کا تھا، مگر ۶۲ کا دکھلائی دینے لگا۔ گنجے سر پر بڑی دیدہ ریزی سے فرضی مانگ نکالتا۔ دو بال دائیں طرف، ایک بائیں طرف۔ عباد الرحمٰن قالب بیان کرتے تھے کہ انھوں نے اسے ایک حکیم کے اشتہار کو للچائی ہوئی نظروں سے پڑھتے ہوئے پکڑا تھا۔ چڑچڑانا بھی چھوڑ دیا۔ بلکہ کافی خوش مزاج ہو گیا۔ تذلیل و تحقیر کی جگہ تضحیک و تمسخر نے لے لی۔ یعنی آ آ آ! کی جگہ ہا ہا ہا! ایک دن موج میں آئے تو ہم سے فرمایا "اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف تمھیں جتنے بھی لطیفے یاد ہیں، آج ہی مجھے اوور ٹائم بٹھا کر سُنا دو۔ مجھے یہ روز روز کی ہی ہی ہا ہا اچھی نہیں لگتی۔" چائے میں مکھی گر پڑے تو چہار حرفی اینگلو سیکسن گالی کے بجائے اُردو مرادفات پر تکیہ کرتا جو اس نے اپنے بَیرے بُندو خاں سے سیکھے تھے۔ صبح ڈاک، تار یا ٹیلیفون پر کوئی بُری خبر ملے تو فوراً

★ عُریانی دیکھ کے بڑی حیرانی ہوئی۔

دفتر چھوڑ کر چلا جاتا۔ چپراسی اور سکرٹیری کو کہہ جاتا کہ "اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے مجھے پھر صلاح مشورے کے لیے بلایا ہے۔ گورنر عبدالقادر بہت پریشان ہیں"۔ جب گورنر عبدالقادر پر روزانہ صبح ساڑھے گیارہ بجے پریشانی کا دورہ پڑنے لگا تو ہمیں ان کی طرف سے بڑی تشویش ہوئی۔ ڈرائیور سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اینڈرسن کا اسٹیٹ بینک دراصل پیلس ہوٹل کی بار میں واقع ہوا ہے۔ موصوف دفترِ بے معنی کو غرقِ مے ناب اولیٰ کر کے گھر پہنچتے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گورنر سے خطاب فرماتے جو عتاب سے خالی نہ ہوتا۔ وہیں خطاب و عتاب فرماتے فرماتے سو جاتے۔ مکالمہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ دوسرے دن آتے تو ہمیں سارا ڈرامہ افلاک من و عن سناتے اور ایک ایک فقرے پر اپنی حق گوئی اور معاملہ فہمی کی داد پاتے۔ وہ "الکاحلزم" اور ہم ضبط و خواری کی آخری حد پر لڑکھڑا رہے تھے۔

۴۰۴ تریا چلتّر

ایل ایل اب بالکل بدل چکی تھی۔ کچھ اور ہی چہک مہک، چٹک مٹک تھی۔ دو تین مہینے بعد سگرٹ پینی بھی چھوڑ دی۔ وہسکی پینے لگی۔ بات کرتے کرتے ایک دم پرس میں سے آئینہ اور لپ اسٹک نکال کر گلاب کی پنکھڑیوں کے رنگ و رقبہ میں ترمیم و اضافہ کرتی۔ ایک دن ہمارے کسی شوخ فقرے سے محظوظ ہوئی تو ازراہِ تلطف ہمارے گال پر اسی سے "ریڈ کراس" بنا دیا، جیسا ایمبولینس پر بنا ہوتا ہے۔ ہم نے پوچھا "بی بی! یہ کیا؟" اپنے سینے پر ہاتھ سے صلیب بناتی ہوئی بولی "رومن کیتھولک عقیدہ ہے کہ اس سے آدمی ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے"۔ ہم اسے رومال سے رگڑ کر مٹانے والے ہی تھے کہ خیال آیا اگر بیگم نے رومال پر دستاویزی ثبوت دیکھ لیا تو اپنے دل میں کیا کہیں گی۔ (زبان سے جو کچھ کہیں گی، اس کا تو ہمیں بخوبی اندازہ تھا۔) ازدواجی اعتماد میں یہ لمبی دراڑ پڑ جائے گی جسے بالعموم صرف قیمتی تحفوں سے بھرا جا سکتا ہے۔ اور یہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ابھی ہم اس نشان (+) کو کسی محفوظ طریقے سے مٹانے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے کہ اینڈرسن ہماری کیبن میں آدھمکا۔ کہنے لگا، عجیب بینک ہے! ہتھیلی پر حساب ★ کرتے کرتے اب گال پر جمع و تفریق ہونے لگی!

اپنی تازہ اداؤں کو آزمانے کے لیے گاہے ماہے ہمیں بھی تجرباتی خرگوش بنا لیتی۔ نزاکت اب اس پر ختم تھی۔ ایک دن دیکھا کہ انگلی پر پٹّی باندھے چلی آرہی ہیں۔ پوچھا، بی بی! یہ کیا طوطا پالا ہے؟ معلوم ہوا سو روپے کے نئے نوٹ کی دھار سے انگلی کٹ کر پک گئی ہے! ہم نے کہا، انگلیوں کی تاریخ میں یہ پہلا رومینٹک چرکا ہے۔ اس پر عزیز اللہ خاں ✪ (جوالہ آباد یونیورسٹی سے تازہ تازہ انگریزی میں ایم۔ اے کر کے بینک میں ملازم ہوئے تھے) نے اِصلاح فرمائی "پہلا نہیں، دوسرا کہیے۔ رومینٹک شاعر روزیٹی کی انگلی میں بھی تو گلاب کا کانٹا چبھ گیا تھا جس سے اسے زہر چڑھ گیا اور اسی میں چل بسا۔ وصیت کے مطابق اس کی نظموں کا واحد مسوّدہ اسی کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد لوگوں نے واویلا کیا تو قبر کو کھول کر اسے نکالا گیا"۔

"کیسے؟" مسٹر کینٹین والا نے پوچھا۔

"تمہارے سر، اور کیسے؟" مجذوب عزیز اللہ خاں نے جواب دیا۔

اب اس پر نظروں کے ساتھ ساتھ انگلیاں بھی اُٹھنے لگیں۔ بریدہ تنے سے کونپلیں پھوٹیں۔ اپنی آنکھوں سے اماوس کی رات کو دھنک نکلتی ہوئی دیکھی۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک ایسے شخص کو جس نے تمام عمر صرف اور صرف مے و مینا سے عشق کیا، ایک معمولی سی عورت راہِ نشاط اور صراطِ غیر مستقیم سے یوں بھٹکا دے گی۔ ہندو شاستروں نے عورت کے ۹۰۰ چلتر بتائے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ شاستر اس زمانے میں لکھے گئے تھے جب انسان کو ہزار کی گنتی نہیں آتی تھی۔

★ ہتھیلی پر حساب: اس تلمیح کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو "رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر"

✪ سنکی آدمی تھے۔ انگلش لٹریچر کے حوالے اور تلمیحات کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ دو تین مہینے کراچی کے ادبی حلقوں کے ہفتہ وار بحث مباحثوں میں شرکت کے بعد رائفل کلب کے ممبر بن گئے۔ دو ڈھائی سال تک برانچوں کے پرانے اندراجات کا کھوج لگاتے لگاتے، بینک سے ایک رات عالمِ جنون میں ایسے نکلے کہ آج تک مفقود الخبر ہیں۔

نشۂ مے پہ جوانی کا گماں ہو جیسے

پرصا جو ا حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے۔ وہ کافر تھا، گنہ گار نہیں! یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ اس کی بیوی طلاق لے کر اسی کے ایک سابق اسسٹنٹ سے شادی کر چکی ہے۔ ایل ایل بھی کسی کی پابند نہ تھی۔ اب ٹھاٹ سے اینڈرسن کے ساتھ رہنے اور اسی کے ساتھ کار میں آنے جانے لگی۔ مسٹر ڈبلو۔ جی۔ ایم اینڈرسن اس کے پہلو میں سکڑتے سکڑتے پیار میں "اینڈی" ہو گئے۔ ڈرائیور سے مروی تھا کہ بڑے صاب نے ایل ایل کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی ہے جس میں شُتر مُرغ کے انڈے کے برابر ہیرا جڑا ہے! اس خبر پر جمعدار اجمل خاں نے صرف اس بنا پر یقین نہیں کیا کہ "مُرغے اگر شُتر کے برابر ہو جائیں، تب بھی انڈا نہیں دے سکتے۔ اور وہ بھی بڈّھے مرغے جو کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے!" مرزا نے سُنی سُنائی باتوں پر یقین کر کے فتویٰ دے دیا کہ بُتِ عِفت مآب اب خِفّت مآب ہو چکا ہے۔ ہم نے کہا، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ۶۳ سال کے الکحالک سے زیادہ بے ضرر اور کون ہو سکتا ہے؟ فرمایا "۶۴ سالہ الکحالک!" پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) نے "موازنۂ شبلی و اینڈی" کرتے ہوئے فرمایا "شبلی نے یہ شعر نوجوانی میں نہیں، عالمِ ضعیفی میں کہا تھا:

مَن فدائے بُتِ شوخے کہ بہنگامِ وِصال
بمن آموخت، خود آئینِ ہم آغوشی را

سلیس اردو میں یہی مثنوی کی پرچیۂ ترکیب استعمال ساتھ لانے والی کھیل کھائی عورت ہے" جس کے سبب وہ بچارا فوجداری عدالت میں کھنچا کھنچا پھرا۔ بہرکیف، بینک میں ابھی کچھ ایسے نیک طینت و خوش گمان لوگ باقی تھے جن کا خیال تھا کہ دونوں بھائی بہن کی طرح رہتے ہیں۔ عزیز اللہ خاں مجذوب کی بہتان طرازی میں بھی انگریزی ادب کی گاڑھی گاڑھی چاشنی ہوتی تھی۔ فرمایا کہ سب بکواس ہے۔ دراصل دونوں ٹرسٹرم اور اسولٹ کی طرح سوتے ہیں۔ پوچھا، حضرت! سونے کا یہ کونسا طریقہ ہے؟ فرمایا، کم از کم آپ کو تو معلوم ہونا چاہیے۔ ٹرسٹرم، بادشاہ آرتھر کا ایک جانباز "نائٹ" تھا جو

ایک شادی شدہ حسینہ لیڈی اسُولٹ کی پاک محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ دونوں ایک ہی بستر★ پر سوتے تھے، لیکن ٹرسٹرم درمیان میں اپنی ننگی تلوار رکھ لیتا تھا۔ (مرتے دم تک اس کے جذبۂ عشق کے داڑھی مونچھ نہیں نکلی۔) پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اس میں یہ ترمیم فرمائی کہ اینڈرسن درمیان میں اپنی رفیقۂ حیات یعنی دخترِ رز کو سُلاتا ہے۔ کہنے والے یہاں تک کہتے تھے کہ اس نے مس ریمزڈن کو بھی شراب کی لت لگا دی ہے۔ شیشہ کو پری میں اُتار دیتا ہے۔

نادر شاہ کے سر پہ تختِ طاؤس

راتیں ہی نہیں، بھری دوپہریاں بھی گردنِ مینا میں ہاتھ ڈال کر سوتے گزرنے لگیں۔ تین چار دفعہ کلینک میں داخلے کے باوجود اس کا الکحالزم بدستور اپنی جگہ تھا۔ جب اس کا دورہ پڑتا تو تین تین ہفتے دفتر سے غیر حاضر رہتا۔ ایل ایل بے چاری نے گرتے کو بہتیرا تھاما، لیکن خالی بوری اور شرابی کو کون کھڑا رکھ سکتا ہے؟ بینک کا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ چند دور اندیشوں نے درانتی چھوڑ کر کھرپا سنبھال لیا۔ پہلے اوپر اوپر سے کاٹتے تھے، اب جڑ سے اُکھاڑنے لگے۔ عزیز اللہ خاں نے بہ نظر احتیاط اپنا سیونگ بینک اکاؤنٹ جس میں مبلغ تیرہ روپے تھے، دوسرے بینک میں منتقل کر دیا۔ اینڈرسن کے دوسرے تین سالہ معاہدے کی میعاد عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی اور یہ سننے میں آ رہا تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ جاتا ٹھہر گیا تھا، صبح گیا یا شام گیا۔ اس کی مے نوشی اپنے عروج یعنی نقطۂ استفراغ تک پہنچ چکی تھی۔ اب اس کے بعد ایک سیلابِ بلا آنے والا تھا جو خس و خاشاک کو یعنی ہمیں بہا لے جائے گا۔ بینک کا دفتر بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ ہوا چاہتا تھا۔

آتے کچھ ابر، کچھ بہار آئے
اس کے بعد آئے انقلاب آئے

★ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دورِ جاہلیت میں انگلستان میں پلنگوں کی کتنی کمی تھی۔ جب کہ اپنے ہاں یعنی مغلوں کے حرم میں ہر لونڈی کا علیحدہ پلنگ ہوتا تھا۔ لونڈی تو لونڈی، خواجہ سرا تک پلنگ پر بلا شرکتِ غیرے سوتے تھے۔

یہ بھی خبر گرم تھی کہ اب کی دفعہ وہ اپنا پراویڈنٹ فنڈ اور اسے خُرد بُرد کرنے کے لیے ایل ایل کو ساتھ لے جائے گا۔ ایل ایل کو اس کے پراویڈنٹ فنڈ سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ بچارا تو صرف دُسرا تھ چاہتا تھا۔ بقولِ مورخِ بنیک، خان سیف الملوک خاں، نادر شاہ تختِ طاؤس پر بیٹھنے کا خواہشمند نہ تھا۔ بس اپنے ہمراہ اسباب میں باندھ کر لے جانا چاہتا تھا۔

اب اس سے ملاقاتیں کم ہوتی چلی گئیں اور اپنا حصّہ دور کا جلوہ رہ گیا۔ لیکن جب بھی ملتی بڑی اچھی طرح ملتی۔ جن لڑکوں کو پتنگ اڑانی نہیں آتی وہ پتنگ باز کی مانجھے کی چرخی تھام کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پتنگ کو ڈور پیتے، زوروں کے پیچ لڑتے دیکھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار پتنگ اڑانے والا انھیں بھی چند لمحوں کے لیے ڈور تھامنے کا موقع دیتا ہے تاکہ وہ اکتا کر پتنگ لوٹنے نہ بھاگ جائیں۔ پیچ لڑانے یا پتنگ کو غوطہ دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ لڑکا پتنگ کی ڈور سنبھالتا ہے تو اسے تناتی ہوئی ڈور کا کھِنّا، مانجھے کا کٹاؤ، ہوا کا زور، کھینچ کا تُرّاٹا، انگلی کی جنبش سے پتنگ کی ٹھمکیاں، اور کبھی بند ہوا میں ڈور کا پٹیا چھوڑنے کے بعد کا لجلجا جھول —— سبھی کچھ اپنی پور پر محسوس ہوتا ہے۔ بعض جگہ پتنگ بازوں کی اِصطلاح میں اِسے "تان چکھنا" کہتے ہیں۔ تو صاحب! کبھی بادِ بہاری ہماری طرف چلنے لگتی تو سواری اِدھر بھی آجاتی اور "بابا لوگ" کو تان چکھا جاتی۔

گلستاں نہیں پنکھڑی ہی سہی
ہمیشہ نہیں، دو گھڑی ہی سہی

ایک دِن ہم نے پوچھ ہی لیا، کیا یہ صحیح ہے کہ تم بھی اینڈرسن کے ساتھ BALLATER (اس کا آبائی گاؤں) کے دو سو سال پُرانے پُل کا معائنہ کرنے جا رہی ہو؟ ستر غمزے کے بعد بولی کیا یہ صحیح ہے کہ اینڈی بلیٹر جا رہا ہے؟ ہم نے کہا خیال بُرا نہیں۔ پونی ٹیل پر ہاتھ پھیرتے ہوئی بولی، اگر گئی، تو تمھیں اپنی ایک لٹ بطور نشانی دے جاؤں گی۔ پوچھا، اگر ہم اڑے وقت اس کا ایک بال جلائیں تو کیا اینڈی جن نمودار ہو جائے گا؟ بولی جن کو بلانے کے لیے تو تمھیں الہ دین کا چراغ رگڑنا چاہیے۔ عرض کیا، آپ نے تو چراغ کے بجائے خود

الہ دین کو رگر گڑ دیا! ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی، شش! اچھے بچے پکّی پکّی باتیں نہیں کرتے۔

دو ہفتے بعد وہ تنک مزاج نادر شاہ جس نے ہاتھی پر بیٹھنے سے محض اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس کے لگام نہیں ہوتی، تختِ طاؤس کو اپنے سر پر رکھ کر سوئز پار لے گیا۔ اور پھر نہیں لَوٹا۔

مشتاق احمد یوسفی

کے مضامین کا دوسرا مجموعہ

خاکم بدہن

(آدم جی انعام یافتہ)

Librarian
Shibli Memorial Library
New Delhi-2

مُشتاق احمد یُوسفی
کے مضامین کا پہلا مجمُوعہ

چراغ تلے

اُردُو ادب کی ایک عہد آفریں کتاب

یوسفی کی دوسری کتابیں

چراغ تلے   خاکم بدہن

"ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے کسی نئے پہلو یا زاویئے پر ہلکی سی روشنی ڈال کر اس کی طرف ہم کو متوجہ کر کے چونکا دینا اور پھر خود معصومانہ انداز میں آگے بڑھ جانا یوسفی کے فن کی وہ نزاکت ہے جو انہی کے حصے میں آئی ہے۔ یوسفی کا قلم جس چیز کو بھی چھوتا ہے، اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی کوئی سطر یا لفظی ترکیب ایسی نہیں ہوتی جو پڑھنے والے کی فکر و نظر کو نئی روشنی نہ دے جاتی ہو۔ یوسفی ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے ایک نیا دبستان ہیں۔ اور ان کے دونوں مجموعے فنِ ظرافت میں ایک نیا عنوان ہیں۔ عصرِ جدید کے ظرافت نگار یوسفی کے دونوں مختصر مجموعوں کو اردو ظرافت میں نئے بشارت نامے پائیں گے۔"

مجنوں گورکھپوری

"شگفتگی اس مزاح کا جوہر ہے۔ اگر مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو ہم کسی نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی ہی کا نام ہے۔"

ابنِ انشا

"ہم اردو مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔"

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری

"معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا بہہ رہا ہے جس کی لہریں مذاق کی چمک سے روشن ہیں اور جس کا منظر دل کی کلی کو کھلا دیتا ہے۔ کہیں مسکراہٹ پیدا کرتا ہے اور کہیں زور سے ہنسا دیتا ہے۔"

ڈاکٹر احسن فاروقی

"یوسفی لکھتا اس لیے ہے کہ اس نے اپنی انسانیت کے اظہار کی زبان طنز و مزاح میں ڈھونڈی ہے اور اس کی وہ فطری صلاحیت لے کر آیا ہے۔"

ممتاز حسین

"اردو طنز و مزاح میں ایک ایسی نئی اور بھرپور آواز کا اضافہ ہوا ہے جو الگ سے پہچانی جا سکتی ہے۔ جس کی طنازی اور دلفریبی دونوں قابلِ ذکر ہیں۔ یوسفی کا طرزِ بیان سر تا سر ادبیت، ذہانت اور برجستگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ بات میں سے بات پیدا نہیں کرتے، بلکہ بات خود کو ان سے کہلوا کر ایک طرح کی طمانیت اور افتخار محسوس کرتی ہے۔"

ڈاکٹر اسلم فرخی